प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

SHAHNAZ NABI:
HAYAT, ILMI-O-ADBI KHIDMAT

A thesis submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by

ZUNERA

Reg. No. 16HUPH08

Supervisor

Dr. Rafia Begum

Assistant Professor

UNIVERSITY OF HYDERABAD

सा विद्या या विमुक्तये

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
Telangana, India

June-2022

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

شہناز نبی: حیات، علمی وادبی خدمات

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی

جون 2022ء

مقالہ نگار

زنیرہ

Reg No. 16HUPH08

نگراں

ڈاکٹر رفیعہ بیگم

اسسٹنٹ پروفیسر

UNIVERSITY OF HYDERABAD
सा विद्या या विमुक्तये

شعبۂ اُردو
اسکول آف ہیومانیٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد 500046
تلنگانہ، انڈیا

University of Hyderabad

(A Central University by an Act of the Parliament)

Department of Urdu School of Humanities

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

DECLARATION

I, **ZUNERA,** hereby declare that the research embodied in the present thesis entitled **“SHAHNAZ NABI: HAYAT, ILMI-O-ADBI KHIDMAT”** submitted by me under the supervision of **Dr. Rafia Begum** is a bonafide research work for the award of **Doctor of Philosophy** in **Urdu** from the **University of Hyderabad**. I also declare to the best of my knowledge that it has not been submitted in part or full to this or any other university or institution for the award of any degree or diploma. I hereby declare that my thesis can be deposited in Shodganga/ INFLIBNET.

Date: ....

Name: **ZUNERA**

Signature of the Student

Reg. No.16HUPH08

University of Hyderabad

(A Central University by an Act of the Parliament)

Department of Urdu School of Humanities

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"SHAHNAZ NABI: HAYAT, ILMI-O-ADBI KHIDMAT "** submitted by **ZUNERA** bearing Enrolment Number **16HUPH08** in partial fulfillment of the requirements for award of **Doctor of Philosophy** in the School of Humanities, Department of Urdu is bonafide work carried out by her under my supervision and guidance. The thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or full to this or any other university or institution for award of any degree or diploma.

Papers related to this thesis have been:

A. Published in the following publications.

1. "Shahnaz Nabi Ke Bachchon Ke Darame", Asr-E-Hazir Mein Bachchon Ka Adab, Pages:110, February -2019, (ISBN: 978-81-9400597-1)
2. "Shahnaz Nabi Ki Nazm Nigari", Aks-e-Adab, Volume: 10, Issue: 34, Pages:38-39, Quarterly, January to March-2021, (ISSN: 2320-6519)

B.Presented at the following Conferences.

1. Three- day International Seminar on, "Shahnaz Nabi Ki Shayeri Mein Tanisi Pahlu" 27-29 March 2018, at Dept. Of Urdu, Banaras Hindu University Varanasi, U.P.India.
2. Two- day National Seminar on "Niswani Ehtejaj Ki Mutabar Awaz Sughra Humayun Mirza" on 19th 20th February 2020, at Department of Urdu Indira Priyadarshini Govt. Degree College (W) Nampally, Hyderabad.

Further, the student was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during her M.Phil. Programme and the M.Phil. Degree was awarded.

S.No.	Course Code	Course Title	Credits	Result
01	HU701	Research Methodology	5.00	Pass (A+)
02	HU702	Practical Criticism	5.00	Pass (A+)
03	HU721	Textual Criticism	5.00	Pass (A+)
04	UR780	Dissertation	15.00	Pass (A)

Supervisor **Head of the Department** **Dean School of Humanities**

عصرِ حاضر میں

بچوں کا ادب

Children's Literature in Present Perspective

محمد دانش غنی

۱۸	حیدر بیابانی اور بچوں کی شاعری	محمد دانش غنی	(رتناگری)	۷۴
۱۹	اختر حسین اختر: گجرات سے بچوں کا ایک اہم شاعر	ڈاکٹر صفیہ بانو۔اے۔شیخ	(احمد آباد)	۷۸
۲۰	ادبِ اطفال کا جادوگر شاعر علامہ اقبال	انصار احمد درویش	(حیدرآباد)	۸۵
۲۱	ادبِ اطفال کے ابتدائی نقوش	ڈاکٹر ناظم الدین منور	(کریم نگر)	۸۹
۲۲	اسمٰعیل میرٹھی: ادبِ اطفال کا ایک اہم نام	ڈاکٹر سید حامد ماہتاب	(حیدرآباد)	۹۲
۲۳	کرشن چندر: بچوں کے قلمکار	سید محمد ظفر اقبال	(علی گڑھ)	۹۵
۲۴	ادبِ اطفال اور اسمٰعیل میرٹھی	رشدہ شاہین	(حیدرآباد)	۱۰۰
۲۵	نظامی بدایونی اور ادبِ اطفال	محمد عامل بدایونی	(علی گڑھ)	۱۰۴
۲۶	امین حزیں اور بچوں کی شاعری	ڈاکٹر سیما ناہید	(مروڈ جنجیرہ)	۱۰۸
۲۷	شہناز نبی کے بچوں کے ڈرامے	زنیرہ ابرار	(حیدرآباد)	۱۱۰
۲۸	علامہ اقبال اور بچوں کی شاعری	شاذیہ بانو	(علی گڑھ)	۱۱۴
۲۹	اقبال اور بچوں کا ادب	پیش امام بہادر حسین	(حیدرآباد)	۱۱۹
۳۰	بچوں کا ادب اور سرسید احمد خان	عمران احمد	(حیدرآباد)	۱۲۲
۳۱	غضنفر کی نظموں میں بچوں کی نفسیات	گلنارہ خاتون	(حیدرآباد)	۱۲۸

(حصہ سوم)

32	Need of Children's Literature	Mrs.Tasmin Vaseed Mujawar	131
33	The Dire Need for Good Children's Literature in Modern Times	Ms. Swathina Sashi	133
34	Children's Literature: The Need to Reach Out to the Masses	Prachi Nath	135

۳۵	اکیسویں صدی کے پہلے دشک کی کہانیوں میں بچوں کی سمسیائیں (Hindi)	ڈاکٹر وندنا تسکانو	(ممبئی)	۱۳۷
۳۶	رجنی سنگھ کی کویتاؤں میں بال مانسکتا (Hindi)	ڈاکٹر چترا ملند گوسوامی	(رتناگری)	۱۳۹
۳۷	بال ساہتیہ کا بدلتا مادھیم (Hindi)	شویتا پردیپ آمرے	(رتناگری)	۱۴۱
۳۸	ہندی بال کہانی (Hindi)	شری نواس نائیک	(دھارواڑ)	۱۴۲
۳۹	گلزار (Marathi)	ڈاکٹر ندھی سچن پٹوردھن	(رتناگری)	۱۴۴

OOOO

شہناز نبی کے بچوں کے ڈرامے

زنیرہ ابرار
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، سینٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

اردو زبان وادب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ''بچوں کے ادب'' کے حوالے سے ہمیشہ سے زرخیز رہا ہے۔ اردو ادب میں بچوں کی نظمیں، قصے، کہانیاں، داستانیں، حکایات وغیرہ تو بہت ملتی ہیں لیکن ان سے متعلق ڈرامے کم ملتے ہیں۔ ایک عہد میں اردو ڈرامے کا سنہرا دور بھی رہا ہے لیکن آج اس کی کمی کا احساس ہر کسی کو ہے اور اس کی وجہ ہماری قوم کی سستی اور ناکردگی ہے کیونکہ ڈرامے کے عروج کا راز قوم کے لوگوں کی تہذیبی بے داری میں پنہا ہوتا ہے۔ وزیر آغا اپنی کتاب ''اردو میں طنز و مزاح کی روایت'' میں لکھتے ہیں

> ''یہ بات ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ صرف مستعد اور چاق و چوبند قوموں میں ڈراموں کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم عافیت کوشی اور سستی و ناکردگی کی اسیر ہو جائے تو اس کے ڈرامے کے امکانات بھی رو بہ زوال ہو جاتے ہیں۔'' (اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، ص:315)

ان کے اس نظریے کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری قوم میں مکمل طور پر بے داری نہیں آئی اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں ڈرامے کو وہ عروج نہ ملا جو دیگر زبانوں کے ادب کو ملا لیکن پھر بھی ڈرامے نے اردو ادب کو جو سرمایہ دیا ہے وہ ایک لافانی اضافہ ہے۔

اگرچہ اردو ڈرامے کی شمع ماند پڑ چکی ہے لیکن پوری طرح سے بجھی نہیں ہے۔ آج بھی ڈرامے لکھے جا رہے ہیں اور اسٹیج بھی ہو رہے ہیں البتہ ان کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ کچھ لوگ ابھی بھی ہیں جو ڈراما اور ناظرین کے بیچ کے رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں مرد حضرات کے ساتھ خواتین قلم کار بھی شامل ہیں۔ ڈراما اور ناظرین کے بیچ پیدا ہونے والی دوری کو ختم کرنے والوں میں ایک نام شہناز نبی کا بھی ہے۔ ان کا تعلق سرزمین بنگال سے ہے اور وہ کلکتہ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ اردو کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ شہناز نبی نے اردو ڈرامے کی روایت کی پاسداری کے لئے اور تھیٹر کو زندہ رکھنے کے لئے پروسینیم میں بیٹھ کر ناضرین کا انتظار نہیں کیا بلکہ تھیٹر کو گلی محلوں تک پہنچا دیا۔ انھوں نے اپنے ڈراموں کو اسٹریٹ کارنر کیا۔ اس طرح شہناز نبی نے وقت کے تقاضے کو محسوس کیا اور اردو تھیٹر کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

شہناز نبی کا شمار موجودہ خواتین قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ ایک قابل استاد، حقیقی شاعرہ، ذہین نقاد، پر مغز محقق، بہترین افسانہ نگار اور حقیقت پسند ڈراما نگار ہیں۔ ادب میں ان کی شناخت ان کے تانیثی لب و لہجے سے کی جاتی ہے۔ تانیثیت کی تاریخ کے حوالے سے ان کی کتاب ''فیمینیزم، تاریخ و تنقید'' کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ان کے 6 شعری مجموعے اور تحقیق و تنقید پر درجن بھر کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ڈرامے کی تنقید پر ان کی ایک کتاب ''اردو ڈراما، آغا حشر اور صید ہوس'' قابل تعریف ہے۔ ان کے ڈراموں کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''بچوں کے

ڈرامے‘‘ کے عنوان سے 1989 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں انھوں نے بنگلہ زبان میں لکھے گئے مختلف ادیبوں کے ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔دوسرا مجموعہ ’’پہچان مجھے نادان‘‘ کے عنوان سے 2016 میں شائع ہوکر شرف قبول عام حاصل کر چکا ہے۔علاوہ ازیں ان کے کئی متفرق ڈرامے مختلف اخبارات اور رسائل میں بھی چھپ چکے ہیں لیکن ڈرامے کی دائمی اہمیت اس کے اسٹیج ہونے سے قائم ہوتی ہے اور شہناز نبی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے ڈرامے نہ صرف اسٹیج ہوئے بلکہ ناظرین کے ذریعے پسند بھی کیے گئے۔

شہناز نبی نے اسٹیج کے علاوہ بے شمار نکڑ ناٹک بھی پیش کئے ہیں۔یہ ناٹک زیادہ تر سماجی وسیاسی واقعات وحالات پر مبنی ہیں۔تعلیم بالغاں،گھریلو تشدد،قومی یک جہتی،ماحولیات،مادری زبان میں تعلیم،بچوں کے ساتھ زنا کاری،بچہ مزدوری وغیرہ ان کے ڈراموں کے مرکزی خیال رہے ہیں۔وہ ان سبھی مسائل کے پیدا ہونے والے وجوہات اور اس سے ہونے والے نقصانات سے لوگوں کو واقف کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔اپنے ڈرامانگاری کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

’’میں نے ناٹک کی کوئی تعلیم نہیں لی۔میرے نزدیک وقت سب سے بڑا پرفارمر ہے۔میں نے جو بھی سیکھا وہ وقت اور حالات سے سیکھا ہے۔‘‘ (پیش لفظ،پہچان مجھے نادان،ص6)

میں نے اپنے مقالے کے لئے شہناز نبی کے ان ڈراموں کو منتخب کیا ہے جو بچوں اور ان کے مسائل پر لکھے گئے ہیں۔اس سلسلے میں ان کا ڈراما ’’جنگل میں اسکول‘‘ قابل تحسین ہے(اس ڈرامے میں کھیل کھیل میں بچوں میں تعلیمی بے داری پیدا کی جاتی ہے۔اس ڈرامے کا پلاٹ یہ ہے کہ جنگل میں ایک اسکول کھولا جاتا ہے تو جانوروں میں گھوڑا،ہرن،مور،توتا،لومڑی،گدھا وغیرہ بہت خوش ہوتے ہیں کہ اب انھیں پڑھنے کا موقع ملے گا وہ سب اسکول میں نام لکھوانے کے لیے جاتے ہیں تو سیار جا کر شیر کے کان بھرتا ہے کہ اگر جنگل کی جنتا پڑھ لکھ لے گی تو اپنے حق کے لئے آواز اٹھانے لگے گی اس سے آپ کمزور ہو جائیں گے۔اس لئے شیر پہلے تو ان جانوروں کو دھمکا کر انھیں روکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان کی ایکتا کے آگے ہار جاتا ہے اور اس طرح تمام جانور پڑھنے جانے لگتے ہیں۔اگر ہم باریک بینی سے اس ڈرامے کا جائزہ لیں تو ہمیں یہاں جنگل ’سماج‘ کی مشابہ لگے گا اور شیر ’حاکم‘ کی صورت،سیار اس کے ’چاپلوس‘ اور دیگر جانور بچے کی صورت میں نظر آئیں گے۔اس ڈرامے کے ذریعے بچوں کو کئی سبق ملتے ہیں۔اول برائی پر اچھائی کی جیت،دوم ایکتا میں بہت طاقت ہوتی ہے اور سوم یہ کہ تعلیم سبھی کمیوں،خامیوں وکمزوریوں کو دور کرتی ہے۔اس طرح شہناز نبی کا یہ ڈراما بچوں کے لئے ایک اہم ڈراما ہے۔

ڈراما ’’اٹھ جاگ مسافر‘‘ بھی بچوں کے لئے ایک سبق آموز ڈراما ہے۔اس ڈرامے میں ایک بادشاہ کو دکھایا گیا ہے جو برسوں تک سویا رہتا ہے۔اسے ملک اور رعایا کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔جب اس کے ملک پر دشمن ملک حملہ کرتا ہے تو درباری اسے بڑی مشکل سے جگاتے ہیں اور اسے بتاتے ہیں کہ دشمن نے حملہ کر دیا ہے تو وہ تلوار لانے کو کہتا ہے تو اس کا وزیر کہتا ہے کہ اب زمانہ بدل چکا ہے تلوار کی جگہ اب بموں نے لے لی ہے۔وہ تو برسوں تک سویا رہتا ہے جس کی وجہ سے یہ سب نام اور اس کے استعمال کے طریقے اس نئے لگتے ہیں وہ حیرت سے ان سب کے متعلق پوچھتا ہے۔اس ڈرامے سے بچوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ غفلت میں پڑے رہنا ایک لعنت ہے اور یہ ہم سے کئی نعمتیں اور راحتیں چھین لیتی ہے۔شہناز نبی بچوں کو متحرک دیکھنا چاہتی ہیں اور ساتھ ہی دیش اور دنیا سے باخبر بھی۔

اس ڈرامے کی ایک خوبی یہ ہے کہ شہناز نبی نے اس ڈرامے میں فارس کامیڈی کا انداز اپنایا ہے۔فارس کامیڈی میں بات یا گفتگو تیز تیز اور جلدی جلدی کی جاتی ہے تا کہ دیکھنے والے یہ اندازہ نہ لگا سکیں کہ مکالمہ پر ظرافت ہے یا نا معقول۔فارس کامیڈی لکھنا مشکل ہے کیونکہ زرا سی بے توجہی سے ڈرامے میں مصنوعی پن پیدا ہو جاتا ہے لیکن شہناز نبی نے اسے کامیابی کے ساتھ اس ڈرامے میں پیش کیا ہے۔مکالمے کو اس طرح cut to cut لکھا ہے کہ کہیں بھی نا معقول ہونے کا احساس ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شہناز نبی نے نہ صرف بچوں کے لئے ڈرامے لکھے ہیں بلکہ بچوں کے ان مسائل کو بھی اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا ہے جو سماج کے لئے ایک کلنک سے کم نہیں ۔اتنی ترقی کر لینے کے بعد آج بھی ہمارے سماج میں child labour اور child abuse ایک عام سی بات ہے ۔یہ دونوں موضوعات ہی بڑے نازک ہیں ۔ڈراما ''شعلوں میں گھرا بچپن'' میں child labour کے خلاف سخت احتجاج دیکھنے کو ملتا ہے۔جس عمر میں بچوں کے ہاتھ میں قلم ہونا چاہیئے اس عمر میں وہ مزدوری کرتے ہیں اور اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیئے انھیں اس مزدوری کے شعلوں میں جھلسنا پڑتا ہے۔اس ڈرامے کے مرکزی کردار چھوٹو اس کی بہن چمیلی ہے۔بچپن میں ہی ان کی ماں کا انتقال ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے چمیلی پڑھائی چھوڑ کر گھر گھر جا کر کام کرتی ہے تا کہ اس کا بھائی چھوٹو پڑھ سکے لیکن گاؤں کے زیادہ تر بچے مزدوری کرتے ہیں اس لئے چھوٹوں بھی ضد کر کے مزدوری کرنے لگتا ہے اور آخر میں کارخانے میں آگ لگنے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔اس کی بہن چمیلی انصاف کے لئے در در بھٹکتی پھرتی ہے لیکن اس کی سننے والا کوئی نہیں ہوتا ہے اس طرح یہ ڈراما سماج کے سامنے سوال قائم کرتا ہے کہ بچوں کے مزدوری کے خلاف قانون بننے کے بعد بھی اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے لیکن اس کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔یہ ایک المیہ ڈراما ہے اور اپنے موضوع کے نوعیت کے بنا پر ایک اہم ڈراما ہے۔

ڈراما ''حسرت ان غنچوں پہ'' child abuse کی بڑی دردناک تصویر پیش کرتا ہے۔اس ڈرامے میں ایک چار سال کی معصوم بچی سونی کے ساتھ محلے کا ایک غلیظ انسان زبردستی اس کے منہ پر ربن باندھ کر اس کے ساتھ جسمانی رشتہ بناتا ہے۔اس آبروریزی سے اس معصوم بچی کی جسمانی ونفسیات پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ جب اس کا باپ اس کو چھوتا ہے تو وہ کہہ اٹھتی ہے:

''مجھے چھوڑ دو۔۔۔مجھے چھوڑ دو۔۔۔آہ!۔۔۔میرا ربن۔۔۔اماں میرا ربن۔۔۔میرے منہ پر ربن مت باندھو۔''

ایسا کربناک منظر ہمیں منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' کی یاد دلا دیتا ہے اور ہمارے ذہن ودل کو کچوکے لگاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی نے اپنے ان ڈراموں میں تھیٹریکل تجربات اور نظریات کے بجائے بچوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو ترجیح دی ہے۔وہ اپنی بات کو آسان انداز میں پیش کرتی ہیں اور کسی بھی طرح کی پیچیدگی سے پرہیز کرتی ہیں۔مکالمے میں وہ جگہ جگہ گیتوں کو بھی شامل کرتی ہیں اور زیادہ تر یہ گیت ان ہی کی لکھی ہوتی ہیں اور اس کے سر، تال اور لے بھی ان ہی کے ہوتے ہے۔ان کے یہ گیت ڈراموں کو دلچسپ اور مؤثر بناتے ہیں۔ڈراما ''حسرت ان غنچوں پہ'' کا ایک گیت ملاحظہ ہوں:

انصاف چاہیئے۔۔۔۔۔انصاف چاہیئے۔۔۔۔۔ قانون کے دعوے داروں سے انصاف چاہیئے
جواب چاہیئے۔۔۔۔۔جواب چاہیئے۔۔۔۔۔۔ سماج کے ٹھیکے داروں سے جواب چاہیئے

کب تک یہ اگنی پریکشا ------ اور ابلاؤں کی ہتیا   کب تک ناری کا دھرشن، کب تک یہ جسم کا دھندا

انصاف چاہیئے ---- انصاف چاہیئے ------ قانون کے دعوے داروں سے انصاف چاہیئے

کب تک بچپن کا سودا ------ معصوموں کا تماشا   کب تک بچوں کا شوشن ---- کب تک یہ خون خرابہ

انصاف چاہیئے ---- انصاف چاہیئے ------ قانون کے دعوے داروں سے انصاف چاہیئے

جواب چاہیئے ----- جواب چاہیئے ------ سماج کے ٹھیکے داروں سے جواب چاہیئے

(گیت: شہناز نبی)

شہناز نبی کے لئے ڈراما ایک ایسا میڈیم ہے جس کے ذریعے وہ اپنے پیغام عام انسانوں تک پہنچاتی ہیں ۔ان کے پیش کش کا یہ انداز audiance کو متاثر کرتا ہے اور لوگ لمبے عرصے تک ان کے ڈراموں کو یاد رکھتے ہیں اور کسی بھی تخلیق کار کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ اس کی تخلیق ناقدین کے ساتھ ساتھ خواص و عام میں بھی سراہی جائے شہناز نبی کے ڈرامے کو یہ اعزاز وقار حاصل ہے اس لئے وہ اپنے ڈراموں اور گیتوں کے متعلق لکھتی ہیں:

''مجھے اپنے ڈرامے بے حد پسند ہیں کہ جب یہ پیش ہوتے ہیں تو ناظرین، جن میں بچے بھی جوق در جوق شامل ہوتے ہیں، نہ صرف میرے لکھے ہوئے گیت یاد کر لیتے ہیں بلکہ ڈرامہ کے دوران وہ ڈرامے کا حصہ بن جاتے ہیں اور اداکاروں کے ساتھ مل کر گانے لگتے ہیں ۔یہ اتنا فرحت بخش تجربہ ہے جسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو اس طرح کے تجربات سے گزرا ہو۔'' (پیش لفظ، پہچان مجھے نادان، ص:5)

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی نے بچوں کے لئے جو ڈرامے لکھے ہیں وہ اپنے موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے کافی اہم ہیں اور اردو زبان و ادب کے لیے کسی قیمتی خزانے سے کم نہیں کیونکہ بچوں کے ادب کے حوالے سے تو اردو زبان و ادب کی دیگر اصناف میں تو بہت کچھ مل جاتا ہے لیکن ڈرامے بہت ہی کم ملتے ہیں ۔اس لئے شہناز نبی کے ان ڈراموں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور یقینن اب جو اردو ڈرامے کی تاریخ رقم کی جائے گی تو شہناز نبی کے نام کو فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

OOOO

زنیرہ ابرار
Zunrera Abrar
Research Scholar,
Central University of Hyderabad, Hyderabad
Mobile No. 9493011532, 9598663633

ISSN 2320-6519
U.G.C. Approved No.42266

[گوشۂ بشیر احمد بشؔیر (ابن نشاط) کشتواڑی]

سرزمین ولؔی اورنگ آبادی (دکن) سے جاری ہونے والا معیاری رسالہ

Quarterly (Urdu)
AKS-E-ADAB
Aurangabad

(سہ ماہی)

عکسِ ادب

(اردو)

اورنگ آباد

قارئین کی نیک تمناؤں کے ساتھ
چونتیسواں شمار، جلد (۱۰)
جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء

کٹے گی رات آئے گی سحر آہستہ آہستہ
شفا پائے گا اب دردِ جگر آہستہ آہستہ

بشیر احمد بشؔیر (ابن نشاط) کشتواڑی

سہ ماہی

عکسِ ادب

اورنگ آباد

جلد(۱۰) شمارہ(۳۴) جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء

مدیراعلیٰ : ڈاکٹر یوسف صابرؔ (یوسف خان جبار خان) 09326772575

معاون مدیر : شرجیل احمد خان موبائل : 09595686784

اعزازی مدیر : ڈاکٹر نخشب مسعود موبائل : 09372012930

مینجنگ ڈائریکٹر : سیدہ فرزانہ نسیم موبائل : 09423877584

سرپرست

☆ ڈاکٹر عبدالکریم سالار (جلگاؤں)

☆ نور خاں (جالنہ)

مجلس مشاورت

- علامہ ناوکؔ حمزہ پوری (حمزہ پور)
- علیم صباؔ نویدی (چنئی)
- مناظر عاشق ہرگانوی (بھکن پور)
- معصوم شرقی (کولکتہ)
- شفیع احمد شفیع (پربھنی)
- ڈاکٹر درانی ایس۔ ایم (ناندیڑ)
- مبین نذیر (مالیگاؤں)

مجلس ادارت

☆ ڈاکٹر عقیلہ سید غوث

☆ سید مسعود احمد قیصرؔ

☆ ڈاکٹر عابد حسین محمد صادق

☆ وجاہت قریشی

☆ طاہر حسین طاہرؔ

☆ ڈاکٹر شاہ ایاز

☆ حبیب النساء

☆ ڈاکٹر سلیم نواز حشر

☆ ڈاکٹر ارشاد احمد خان

☆ ابراہیم خان

جو کسی خواب نے دیکھا نہ تصور نے کہیں

بات تو جب ہے کہ انسان وہاں تک پہنچے

(ڈاکٹر یوسف صابرؔ)

شمارہ کی قیمت	:	۵۰/روپے
زرسالانہ (بدست)	:	۲۰۰/روپے
زرسالانہ (بذریعہ پوسٹ)	:	۲۵۰/روپے
لائبریری کے لئے	:	۲۵۰/روپے
رجسٹرڈ پوسٹ	:	۳۰۰/روپے
تاحیات خریداری بھارت	:	۳۰۰۰/روپے
بیرونی ممالک	:	۱۰۰۰۰ تا ۱۵۰۰۰ روپے

سرکولیشن منیجر : تنزیل احمد خان (Mob. 09284747707)

خریداری اور اشتہار کے لئے منی آرڈر، چیک اس نام سے بھیجیں :

Yousuf Khan Jabbar Khan
Bank of Maharashtra
S/Ac/ No. 60021185230
IFSC code MAHB 0000278

SBI
S/Ac/No.SB 52068629025
IFSC code SBIN 0020786

مقام اشاعت/ترسیل زر/مضامین/تخلیقات سے متعلق خط و کتاب کا پتہ

Yousuf Khan Jabbar Khan
Editor : **Aks-e-Adab** *(Quarterly)*
Green Valley, Near Kohinoor Lawns,
Ruby Building, No.4, B-Wing, Flat No.B-5
Rauza Baugh, Aurangabad.
Dist. Post AURANGABAD (M.S.) 431001
Mobile : 09326772575
email : akseadab@gmail.com

Website : www.akseadaburdu.co.in

طباعت

نوری آفسیٹ پریس

آگرہ روڈ، نزد پٹرول پمپ، مالیگاؤں ضلع ناسک (مہاراشٹر)

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

''عکسِ ادب'' سے متعلق کوئی بھی قانونی چارہ جوئی اورنگ آباد عدالت میں ہوگی۔

☆ترتیب و تزئین☆

ادار یہ	ڈاکٹر یوسف صابرؔ	۳
اسلامیات	ایم ایم شیخ،سیدہ فرزانہ نسیم	۴
عکس ایماں	حمد و مناجات، نعت	۵
مغز ادب	ڈاکٹر یوسف صابرؔ	۶
☆خصوصی گوشہ (اس شمارے کی شخصیت)	بشیر احمد بشیرؔ (ابن نشاط) کشتواڑی	صفحہ ۷ تا ۳۳

☆قلمی تعاون :

● ڈاکٹر یوسف صابرؔ ● انور سدید ● پروفیسر ظہور الدین ● افتخار امام صدیقی ● ادارہ اردو بک ریویو دہلی

● ڈاکٹر سیفی سرونجی ● وحشی سعید ● محمد عمر فرحت راجوری ● ایاز رسول نازکی

☆مضامین (تحقیق و تنقید)

● خدیجہ مستور بحیثیت بچوں کی ادیبہ	ڈاکٹر محمد زکریا محمد اسمٰعیل	۳۴
● جیلانی بانو کے افسانوی مجموعے	فردوس انجم شیخ آصف	۳۶
● شہناز نبی کی نظم نگاری	زنیرہ	۳۸
● یعقوب یاور کی شاعری کا تجزیہ و تفہیم	الطیع اللہ	۴۰
● سجاد حیدر یلدرم اور ان کا افسانوی سفر	ڈاکٹر اے آر منظر	۴۲
● مسلمانوں کی تاریخ اور آزادی کے بعد......	ڈاکٹر شیخ ساجدہ عبدالواسع	۴۴
● علامہ اقبالؔ کا پیغام ملت کے نام	ڈاکٹر محمد ناصر اللہ انصاری	۴۶
● علاقہ مراٹھواڑہ میں اردو کی نشو ونما کا جائزہ	شیخ روبینہ تبسم	۴۷
● وشاکھا پٹنم کا شعر و ادب ۱۹۴۷ء کے بعد	علیم صبا نویدی	۴۹
● اُترن	ڈاکٹر رفیع الدین ناصر	۴۹
● ڈاکٹر یوسف صابر۔ ہمہ جہت ادبی خدمات......	محمد احمد دانش روانوی	۵۴
☆رپورتاژ ● جانے والے کبھی	ملک بزمی	۵۰
☆انشائیہ ● انڈا	محمد اسد اللہ	۵۲
☆تعارف و تبصرے	از قلم : ڈاکٹر یوسف صابرؔ	۵۶
☆افسانوی ادب افسانچے		۵۹

● معز ہاشمی ● سلیم سرفراز ● ڈاکٹر نخشب مسعود

☆شاعری

● ضررو صفوی	۳۷
● سمیع الدین اطہر	۴۱
● چشتی سلیم بیدرد	۴۸
● طاہر حسین طاہرؔ	۵۱
● شفیع احمد شفیع ● محمد فرید فطرت ● کلیم کسکؔ ● شہرت ادیبی	۶۰
● کوثر پروین کوثر ● تمیز احمد پروازؔ ● طٰہٰ صدیقی ● منان راہی چشتی	۶۱
☆اخبار عکس ادب و خلوص عکس ادب (خبریں و منتخب خطوط)	۶۲

لائف ممبران

(۱)عتیقہ اطہر موسیٰ	(اورنگ آباد)
(۲)قاضی خسرو	(اورنگ آباد)
(۳)ڈاکٹر مسرت فردوس	(اورنگ آباد)
(۴)ڈاکٹر کیرتی جاؤلے	(اورنگ آباد)
(۵)انصاری ابرار احمد	(اورنگ آباد)
(۶)مہر سلطانہ جبار قریشی	(اورنگ آباد)
(۷)ڈاکٹر عبدالرب	(اورنگ آباد)
(۸)سید وہاب الحق	(اورنگ آباد)
(۹)محمد سعید احمد محمد سردار	(اورنگ آباد)
(۱۰)ڈاکٹر فرحت نسرین	(اورنگ آباد)
(۱۱)ڈاکٹر شرف النہار	(اورنگ آباد)
(۱۲)ڈاکٹر معین فاطمہ	(اورنگ آباد)
(۱۳)ڈاکٹر مخدوم فاروقی	(اورنگ آباد)
(۱۴)مولانا آزاد کالج	(اورنگ آباد)
(۱۵)شیخ شہلا سلطانہ	(اورنگ آباد)
(۱۶)برہانی نیشنل اردو پرائمری اسکول	(اورنگ آباد)
(۱۷)ڈاکٹر قاضی رضوانہ شمیم	(اورنگ آباد)
(۱۸)اسماء روحی قادری	(اورنگ آباد)
(۱۹)شیخ ظہور احمد	(اورنگ آباد)
(۲۰)مبین نذیر	(مالیگاؤں)
(۲۱)مقصود اشرف	(مالیگاؤں)
(۲۲)ڈاکٹر شاہ ایاز	(مالیگاؤں)
(۲۳)ڈاکٹر شاداب روش	(مالیگاؤں)
(۲۴)انصاری عتیق احمد محمد شعبان	(مالیگاؤں)
(۲۵)سٹی کالج	(مالیگاؤں)
(۲۶)خان عبدالغفار خان کالج	(پاتھری)
(۲۷)عالیہ کوثر (اسسٹنٹ پروفیسر)	(جالنہ)
(۲۸)ڈاکٹر سلیم نواز حشرؔ جعفرآبادی	(جالنہ)
(۲۹)سید غازی علی غازیؔ	(جالنہ)
(۳۰)تحسین درانی	(جالنہ)
(۳۱)عبدالوہاب (اسسٹنٹ پروفیسر)	(جالنہ)
(۳۲)ڈاکٹر نسیم بیگم	(پربھنی)
(۳۳)ڈاکٹر سلیم محی الدین	(پربھنی)
(۳۴)خضر احمد خان شررؔ	(پربھنی)
(۳۵)حبیب النساء	(پربھنی)
(۳۶)ڈاکٹر قاضی کلیم	(پربھنی)
(۳۷)ڈاکٹر شبانہ درانی	(ناندیڑ)
(۳۸)ڈاکٹر ارشاد احمد خان	(ناندیڑ)
(۳۹)شیخ ہما کوثر (اسسٹنٹ پروفیسر)	(ناندیڑ)
(۴۰)اظہر احمد غلام یزدانی	(ناندیڑ)
(۴۱)اختر صادق	(ناندیڑ)
(۴۲)محمد اختر	(ناندیڑ)
(۴۳)ڈاکٹر عظمیٰ تسنیم	(پونہ)
(۴۴)ڈاکٹر عنبر خاتون	(ہزاری باغ)
(۴۵)ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل	(ہزاری باغ)
(۴۶)رشید ضارب	(حیدرآباد)
(۴۷)ڈاکٹر عقیلہ سید غوث	(امبہ جوگائی)
(۴۸)ڈاکٹر قمر النساء	(خلدآباد)
(۴۹)ڈاکٹر مقبول احمد مقبول	(ادگیر)
(۵۰)ڈاکٹر خالد مبشر	(دہلی)
(۵۱)سید سمیع الدین	(بدر)
(۵۲) J.J.T.University	(راجستھان)
(۵۳) ڈاکٹر سید اصفیہ مدنی سید زکریا	(بیڑ)
(۵۴) محبوب پاشا اعظمی	(چینئی)
(۵۵) ڈاکٹر نکہت آراء	(شولاپور)
(۵۶)شیخ ارم فاطمہ	(تلنگانہ)
(۵۷)ڈاکٹر محمد ناصر اللہ انصاری	(لاتور)

شہناز نبی کی نظم نگاری

زنیرہ (پی ایچ۔ڈی اسکالر، اردو)
یونی ورسٹی آف حیدرآباد

☆خلاصہ (Abstract): اردو ادب کے فروغ اور ترقی میں جن ادباء اور شعراء کے نام اہمیت کے حامل ہیں ان میں ایک نام شہناز نبی کا بھی ہے۔شہناز نبی کا شمار دور حاضر کی اہم خواتین قلم کاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے ادب کی تقریباً سبھی اصناف میں زور آزمائی کی ہے۔وہ بیک وقت ایک حقیقی شاعرہ، ذہین نقاد، پرمغز محقق، بہترین افسانہ نگار، حقیقت پسند ڈراما نگار اور قابل ذکر ترجمہ نگار ہیں۔اس طرح وہ مختلف جہت سے ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دے رہی ہیں لیکن بات اگر ان کی شناخت کی کی جائے تو بلاشبہ ان کا شمار ایک منفرد شاعرہ کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔اس مضمون میں شہناز نبی کی نظم نگاری کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

☆تعارف : شہناز نبی نے اپنی شاعری کا آغاز اسکول کے زمانے ہی سے کیا جب وہ 13 سال کی تھیں تبھی ان کی نظم ایک ادبی جریدے میں شائع ہوئی۔ ان کا اولین شعری مجموعہ ''بھیگی رتوں کی کتھا'' 1990 میں محض 22 سال کی عمر ہی میں شائع ہو گیا جو ان کی شعر و ادب سے دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔اب تک ان کے نظموں کے پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اردو شاعری کی دنیا میں پہلے انھوں نے اپنی غزلوں کے ساتھ قدم رکھا پھر ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' اور ''پس دیوار گریہ'' کے حوالے سے وہ ایک باکمال نظم گو شاعرہ کے طور پر ابھریں اس کے بعد ''شرارِ جستہ''، ''نظمیں ہماریاں'' اور ابھی حال ہی میں شائع شعری مجموعہ ''عشقم'' کے ذریعہ سے وہ ایک منفرد اور کامیاب نظم نگار کی شناخت قائم کر چکی ہیں۔

☆شہناز نبی کی نظم نگاری : کسی بھی شاعر کو ایک منفرد شناخت اس کے کلام کے فکری و موضوعی جہات اور اس کی فنی مہارت ہی دیتے ہیں اور شہناز نبی کے پاس ہمیں یہ دونوں ہی خصوصیات صاف طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے یہاں وژن ہے تخلیقی مواد ہے اور نظم کہنے کا سلیقہ بھی، اور یہ سب مل کر انھیں ایک کامیاب نظم گو شاعرہ بناتے ہیں جو بیک وقت زندگی سے محبت بھی کرتی ہے اور زندگی کے سفاکیوں کے خلاف احتجاج بھی کرتی ہے۔شہناز نبی کی نظموں میں جہاں ایک طرف اپنی تہذیبی قدروں سے محبت کا جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے تو وہیں دوسری طرف فرسودہ روایات سے بغاوت کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔اگر ہم شہناز نبی کی نظموں کے مجموعوں کا موضوعاتی اعتبار سے جائزہ لیں تو ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' میں شامل نظمیں تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ شروعات میں ان کا لہجہ رومانی ہے لیکن جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں ان کا لہجہ سنجیدہ ہوتا جاتا ہے۔ رومانیت سے حقیقت اور حقیقت سے آفاقیت تک کا شعری سفر آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔شہناز کی نظموں میں سماج کے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ عورت کی محکومیت کا احساس بھی شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔

''پس دیوار گریہ'' کی نظموں کو موضوعاتی اعتبار سے دو زمروں میں رکھا جا سکتا ہے۔ پہلا زمرہ وہ جس میں شاعرہ بحیثیت فرد، سماج، سیاست کی نیرنگیاں دیکھتی ہیں تو دوسرے زمرے میں خود ان کے ذاتی تجربات شامل ہیں مگر دونوں کے درمیان قدر مشترک تجربے کی آنچ بھی ہے جو کسی بھی تخلیق کی اولین شرط ہوتی ہے۔

''شرار جستہ'' اور ''نظمیں ہماریاں'' کی نظمیں اور بھی وسعت اور گہرائی لیے ہوئے ہیں۔اس میں شامل نظموں کے موضوعات میں جدت ہے۔سیاسی، سماجی اور تانیثی مسائل کے ساتھ ساتھ شہناز نبی ماحولیاتی آلودگی جیسے ایک بڑے مسئلے پر بھی ہماری توجہ مرکوز کراتی ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے۔ان کے موضوعات اتنے وسیع ہیں کہ ذات سے لے کر کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں عصری حقائق کو شعری جامہ پہنایا ہے چاہے وہ عورت کے مسائل ہوں خواہ جنسی ہوں یا سماجی نابرابری کے، دیگر سماجی برائیاں یا رسم رواج ہوں یا پھر سیاسی مسائل، ملک میں پھیلی بدامنی ہو یا دنیا میں مچی ہاہاکار یا پھر ماحولیاتی آلودگی اور اس سے نکلنے والے نتائج سے آگاہی غرض ہر طرح کے موضوع پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور کافی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ان کی ایک نظم ''نظم مجھے پکارتی ہے'' پیش ہے۔

آدھی رات کو

کمرے کی دم گھوٹتی فضا
جب نیند سے جگاتی ہے
نظم مجھے پکارتی ہے
صبح دم
چائے کی پیالی سے
اخبار کی سرخی سے
بسوں کے شور سے
فٹ پاتھ کے جھگڑوں سے
نظم مجھے پکارتی ہے
نعروں، جھنڈوں
سیاسی ہتھکنڈوں
راشن کی قطار
بے ہنگم بازار
گرتی ہوئی چھتوں
شکستہ آنگنوں سے
نظم مجھے پکارتی ہے

شہناز نبی کی نظموں کا اہم موضوع عورت اور اس کے مسائل ہیں۔ان کی نظموں میں عورت کے فکری وجود کا احساس دیکھنے کو ملتا ہے۔جیسے ۔

میری ہوس سے صحرا کوڈر ہو رہا ہے۔؟
میں موسم بدلنے پہ قادر ہوئی ہوں۔؟
بغاوت کا پرچم اٹھائے پھری ہوں۔؟
میرے نقش پارہگذر بن رہے ہیں۔؟
میری سوچ دنیا بدلنے چلی ہے۔؟
میں اذہانِ نو کی مرتب ہوئی ہوں۔؟
میرا دوش کیا ہے۔؟
ملامت بھری نگاہیں
ہوس گوشیاں، سازشیں، انگلیاں
کیا میرا واہمہ ہے۔؟
یہ سچ ہے زمانے کو فرصت نہیں ہے۔؟

(ہیلوسینشن۔اگلے پڑاؤ سے پہلے)

ان کی نظموں میں ''انتقام''، ''اے زیرک لوگوں''، ''نیا ادھیائے'' ''مشورہ'' ''بھارت ماتا''، ''بس ایک چنگاری'' وغیرہ کچھ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔مزاحمت کا رویہ ہو یا ذات کے تشخص کا مسئلہ، جنسی رجحان ہو کہ ظلم و جور کی داستان، مردوں کی بالا دستی ہو کہ پدرانہ نظام کا گھنا سایہ، اپنے طرز سے جینے کی للک ہو یا خوابوں کی حکمرانی ہو، یا عہد حاضر کی دلخراش چیخیں یہ سب کچھ قطرہ قطرہ ان کی نظموں میں سمٹ آیا ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں تمام موضوعات ہیں، چاہے ذات کے تعلق سے ہوں جیسے محبت کی وحدت ہو، وصل میں قرب کی لذت ہو، ہجر کا کرب ہو، یا محبوب کا ہرجائی پن، ٹوٹنے بکھرنے اور جڑنے اور پھر حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ سبھی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں جن مسائل کو موضوع بنایا ہے وہ یکسر نئے نہیں ہیں یہ مسائل وہی ہیں جو ان کے معاصرین کے پاس ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے یہاں ذرا مختلف پیرائے میں ادا ہوئے ہیں۔یہ مسائل صرف سوالیہ نشان قائم نہیں کرتے بلکہ اس کی سمت اور رفتار کا بھی تعین کرتے ہیں۔شہناز نبی اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ وہ سوالوں کی قدر و قیمت یا معنویت کس طرح قائم کرے۔عورتوں کا ذہنی اور طبعی میلان کس حیثیت سے شامل کیا جائے؟ عورتیں اپنے نقطۂ نظر سے اپنی زندگی اور ان سے ملحقہ مسائل کو کس نوعیت سے دیکھنا پسند کرتی ہیں؟ ان تمام پہلوؤں پر ان کی نظر گئی ہے۔

شہناز نبی کی شاعری میں جہاں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے وہیں ان کے یہاں اسلوب اور ہیئت میں بھی جدت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں الفاظ کا صاف ستھرا رچاؤ اور سلیقہ موجود ہے۔ان کی کچھ نظموں کی لفظیات اور متن کی تہہ داری کی وجہ سے ان کے خیال اور فکر کے دھارے تک آسانی سے رسائی نہیں ہوتی۔ ان کو سمجھنے کے لیے باشعور اور پختہ ذہن کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی نظموں کو عربی، فارسی، ہندی اور بنگلہ زبان کے الفاظ سے سجاتی ہیں جو ان کے وسیع مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔

☆ **اختتام** : شہناز نبی کے اسلوب میں رمزیت، اشاریت، علامات و استعارات، کہاوتیں، محاورے، لوک کتھا، تلمیحات وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں جس کی بدولت ان کی تمام نظمیں اسلوب کے رچاؤ اور فنی اظہار کے وسیلے سے ماضی اور حال کی بہترین عکاس بن گئی ہیں۔

☆☆☆

مبارک بادی

اس شمارے کی شخصیت ڈاکٹر نخشب مسعود، ڈاکٹر یوسف صابر مدیر اعلیٰ 'عکس ادب' اورنگ آباد و اراکین مجلس ادارت و مشاورت اور تمام خریدار و قارئین کو شمارہ ۳۳، جلد نمبر ۹ کی رسم اجراء و سالانہ جلسے کے لئے صمیم قلب سے بہت بہت مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ 'عکس ادب' کو مزید ترقی عطا کرے۔(آمین)

منجانب : سید عطا اللہ شاہ (اورنگ آباد) (ریٹائرڈ اکاونٹ آفیسر) موبائل : 9834428159

काशी हिन्दू विश्वविद्यालय
BANARAS HINDU UNIVERSITY

DESIGN INNOVATION CENTRE

अन्तरराष्ट्रीय संगोष्ठी
"हिन्दी-उर्दू की साझी विरासत और स्त्री लेखन"

بین الاقوامی سیمینار
اردو ہندی کی ساجھی وراثت اور خواتین قلم کار

International Seminar on "Hindi - Urdu Ki Saajhi Virasat aur Stri Lekhan"
on 27th - 29th March 2018.

Certificate

This is certify that Prof./Dr./ Ms./Mr./Mrs/......Zunera ...... Research scholar Department of Urdu , University of Haidarabad has participated and presented his/ her paper *entitled* ......شہناز نبی کی شاعری میں تانیثی پہلو......

in the **3 day International Seminar on "Hindi - Urdu Ki Saajhi Virasat aur Stri Lekhan"** and contributed towards the success of the seminar.

Head, Department of Urdu
Dr. Aftab Ahmad Afaqui

Organizing Secretary
Dr. Mosharraf Ali

Convener
Prof. Champa Singh

Indira Priyadarshini Govt. Degree College (W)
Nampally Hyderabad. T.S

اندرا پریہ درشنی گورنمنٹ ڈگری کالج برائے نسواں،
نامپلی، حیدرآباد، تلنگانہ

دوروزہ قومی سمینار: اردو فکشن نگاری میں حیدرآبادی خواتین کا حصہ

Two Day National Seminar On :"CONTRIBUTION OF HYDERABADI WOMEN IN THE FIELD OF URDU FICTION WRITING"
Held On : 19th & 20th February 2020

Sponsored by : National Council for Promotion of Urdu Language MHRD Govt of India, New Delhi

Organaized by: Department of Urdu Indira Priyadarshini Govt. Degree College (W) Nampally, Hyd

CERTIFICATE | صداقت نامہ

This is to certify that Prof./Dr./Mr./Ms. Zumeera

of University Of Hyderabad

has presided/ attended as resource person/participated/presented a paper titled

in Two day National Seminar on 19th & 20th February 2020.

تصدیق کی جاتی ہے کہ محترم/محترمہ ذو بیرہ

ادارہ کا نام یونیورسٹی آف حیدرآباد

نے دوروزہ قومی سمینار منعقدہ ۱۹اور ۲۰ فروری ۲۰۲۰ء میں بحیثیت مقالہ نگار

شرکت کی اور بعنوان نسوانی احتجاج کی معتبر آواز "صغرا ہمایوں مرزا"

مقالہ پیش کیا۔

Dr.D.Varalakshmi
Principal

Mohd Waheeduddin
Convener

SL. No. 0013855

UNIVERSITY OF HYDERABAD

P.O. CENTRAL UNIVERSITY, HYDERABAD - 500 046 (INDIA)

University of Hyderabad EXAMS BRANCH Hyderabad

PROVISIONAL CERTIFICATE CUM CONSOLIDATED GRADE TRANSCRIPT

Student Registration Number : 14HUHL12

This is to certify that KM ZUNERA son/daughter of ABRAR AHMED/SHAKILA KHATOON has been declared qualified for the award of the degree of M.Phil. Urdu after having passed the prescribed courses as follows

Course No.	Title of the Course	Letter Grade Awarded	Credits	Month & Year of Passing
	Semester : 1			
HU701	Research Methodology	A+	5.00	Nov 2014
HU702	Practical Criticism	A+	5.00	Nov 2014
HU721	Textual Criticism	A+	5.00	Nov 2014
	Semester : 2			
UR780	Dissertation submitted on : 30 JUN 2016	A	15.00	Nov 2016

S. Supplementary I: Improvement R : Repeat

Cumulative Grade Point Average (CGPA) : **9.50** **(NINE POINT FIVE ZERO)**

Division : **First Division with Distinction** Percentage : **93.75**

Final result declared on : 08-Nov-2016

Date : 10-Nov-16

Hyderabad

Prepared By Checked By CONTROLLER OF EXAMINATIONS

Controller of Examinations
University of Hyderabad

شہناز نبی

فہـــرست

■ پیش لفظ	2
■ باب اول: شہناز نبی؛ سوانح وشخصیت	7
■ باب دوم: شہناز نبی بحیثیت شاعر	25
■ باب سوم: شہناز نبی بحیثیت محقق ونقاد	160
■ باب چہارم: شہناز نبی بحیثیت ڈراما نگار	245
■ باب پنجم: متفرقات (افسانے، تراجم، سفرنامہ)	296
■ ماحصل	323
■ کتابیات	333

پیش لفظ

پیش لفظ

سب سے پہلے میں اللہ رب العالمین کا شکرادا کرتی ہوں جس کے رحم وکرم سے میرا مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ ملنے کے بعد میرے مقالے کے لیے جو موضوع تجویز ہوا وہ ''شہناز نبی: حیات، علمی وادبی خدمات'' ہے۔شہناز نبی مختلف الجہات شخصیت کی مالک ہیں۔عصر حاضر کی خواتین ادیبوں میں انھوں نے اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔انھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہیں۔شاعری، ڈراما نگاری، ترجمہ نگاری، سفر نامہ نگاری اور افسانہ نگاری کے علاوہ وہ اردو دنیا میں ایک تانیثی نقاد کی حیثیت سے کافی مقبول و مشہور ہیں۔وہ ایک بیباک نسائی آوز بلند کرنے والی خاتون مانی جاتی ہیں۔

میں نے اپنی شفیقہ نگراں ڈاکٹر رفیعہ بیگم کے مشورے سے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول: شہناز نبی سوانح وشخصیت

اس باب میں شہناز نبی کی ولادت، تعلیم وتربیت، ملازمت، تصانیف، انعام واعزازات سے متعلق معلومات کو درج کیا گیا ہے تا کہ شہناز نبی کی سوانحی کوائف کا پتہ چل سکے ساتھ ہی اس باب میں شہناز نبی کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شہناز نبی کا تعلق سرزمین بنگال سے ہے۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے کر دیا تھا۔تیرہ سال کی عمر ہی سے وہ شعر کہنے لگی تھیں۔ان کے اب تک 6 شعری مجموعے، 8 تحقیقی وتنقیدی کتابیں، 2 کتابیں مرتبہ اور 3 ترجمہ شدہ ہیں اس کے علاوہ ایک ڈراموں کا مجموعہ اور ایک سفر نامہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔علاوہ ازیں مختلف رسائل وجرائد میں ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے ساتھ تخلیقی سرمائے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

باب دوم: شہناز نبی بحیثیت شاعرہ

یہ باب دو ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔(الف) بحثیت غزل گو(ب) بحثیت نظم گو۔اس باب میں شہناز نبی کی شاعری کا فکری وفنی محاسبہ کیا گیا ہے۔ان کی شاعری میں اشاریت، رمزیت، معنویت موجود ہیں ساتھ ہی مشاہدات، تجربات، احساسات وجذبات بھی کارفرماں ہیں۔اس کے علاوہ سماج کے بدلتے ہوئے حالات اور اس کے زیر اثر رونما ہونے والے واقعات وحادثات بھی موجود ہیں۔ 1980 کے بعد ادب میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور سماج نے جو کروٹ بدلی جس میں خودغرضی، دھوکہ دہی، استحصال، انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے احوال وکوائف وغیرہ کو شہناز نبی نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''بھیگی رتوں کی کتھا'' 1990 میں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' 2001 میں منظر عام پر آ کر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

فنی اعتبار سے شہناز نبی کے یہاں شاعری کے اصول وضوابط مستحکم طور پر نظر آتے ہیں۔ان کے الفاظ صاف ستھرے، سلیس اور رواں دواں ہیں۔ کہیں کہیں عربی، فارسی، بنگلہ، انگریزی اور ہندی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہے۔علم بیان اور علم بدیع کے پیمانوں پر ان کی شاعری کھری اترتی ہے۔جس میں تشبیہات، استعارات، علامات، مجاز اور کنایات وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔بدیع کی صنعتوں میں سے تضاد، تکرار، تلمیحات، مراعات النظیر جیسی صنعتوں کو شہناز نبی نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔جس سے ان کی شاعری کی فنی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں۔

باب سوم: شہناز نبی بحثیت محقق ونقاد

اس باب میں شہناز نبی کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں کا تجزیہ لیا گیا ہے۔یہ کل آٹھ کتابیں ہیں۔فورٹ ولیم کالج اور حسن اختلاط، منثورات بنگالہ، کلام نساخ، لسانیات اور دکنی ادبیات، اردو ڈراما، آغا حشر اور صید ہوس، تانیثی تنقید، تنقید مطالعات، فیمنیز، تاریخ وتنقید ہیں۔ان کتابوں میں 'فیمینیزم، تاریخ وتنقید' فیمنیزم کی تاریخ وتنقید پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب ہے۔اردو ادب میں یہ کتاب اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔دوسری اہم کتاب 'تانیثی تنقید' ہے۔اس میں انھوں نے تنقید پر تانیثیت کا اطلاق کرتے ہوئے عملی تنقید کو ایک نیا رنگ بخشا ہے۔دو جلدوں پر مشتمل 'منثوراتِ بنگالہ' جس میں بنگال کے ادیبوں کی خدمات کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔

باب چہارم: شہناز نبی بحثیت ڈراما نگار

اس باب میں شہناز نبی کے طبع زاد ڈراموں کا تعارف کرایا گیا ہےاوران کی ڈراما نگاری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔شہناز نبی نے ادبی ڈراموں کے علاوہ بےشمارنکڑ ناٹک بھی لکھے ہیں اور انھیں پیش بھی کیا ہے۔ان کے کئی ڈرامے ٹیلی کاسٹ کے ساتھ ساتھ اسٹیج بھی ہوئے ہیں۔ یہ اپنے کئی ڈراموں میں ہدایت کار کے فرائض بھی انجام دی ہیں۔ان کے ڈرامے انسانی زندگی کے واقعات سے راست جڑے ہوتے ہیں۔جس میں معاشرتی، سیاسی وسماجی مسائل شامل ہیں۔تعلیم کی طرف رغبت کی غرض سے انھوں نے بچوں کے لیے کئی ڈرامے لکھے ہیں جس میں طنز ومزاح کے ساتھ بچوں پر مبنی ڈرامے موجود ہے۔ڈرامے کے مکالمے، گیت،اور کردار موقع محل کی مناسبت سے استعمال کی ہیں جس سے ان کے ڈراموں میں تاثیر پیدا ہوئی ہے۔

باب پنجم:متفرقات

اس باب میں شہناز نبی کی ان تخلیقات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس پر انھوں نے کم لکھا ہے جیسے افسانے ،تراجم،اور سفرنامہ وغیرہ۔شہناز نبی نے تین افسانے لکھے ہیں،ان کے افسانوں کا موضوع ایک جیسا ہے جس میں تانیثی مسائل کا ذکر خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔ترجمے میں انھوں نے شعری ونثری سرمایے کا ترجمہ کیا ہے۔ شاعری میں انھوں نے اکثر دوسری زبانوں کی آزاد نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔اس کے علاوہ ڈرامے اور ناول کے بھی ترجمے کیے ہیں۔جس میں اردو زبان سے بنگلہ زبان میں و بنگلہ زبان سے اردو زبان میں اور ہندی زبان سے اردو زبان میں ان کے تراجم موجود ہیں۔انھوں نے جو ترجمے کیے ہیں ان میں ادبی،صحافتی اور تخلیقی ترجمے ہیں۔ان کا ایک سفرنامہ ''سفرنامہ کشمیر جنت نظیر'' ہے۔اس سفرنامے میں شہناز نبی نے کشمیر کے جن مقامات کی سیاحت کی ہے ان مقامات کے رنگ وروپ و احوال وکوائف کو اپنی اس کتاب میں بڑے ہی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کا یہ سفرنامہ کشمیر کے اوپر لکھا گیا بہترین سفرنامہ ہے جس میں کشمیر جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ماحصل ہے جس میں شہناز نبی کے فکر وفن کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کی انفرادیت اوران کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔آخر میں حروف تہجی کے اعتبار سے کتابیات کو درج کیا گیا ہے۔

مقالے کی تکمیل صرف ریسرچ اسکالر سے ممکن نہیں ہے اس میں نگراں کی رہنمائی اور اساتذہ کرام کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔میں اپنی نگراں ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے

دوران تحقیق میری اصلاح کی اور مجھے نیک مشوروں سے نوازا۔ میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صاحب کی بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے دوران تحقیق میری حوصلہ افزائی کی۔ ساتھ ہی شعبہ کے تمام اساتذہ کرام کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ شعبہ کے دفتری عملہ کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے مراحل تحقیق میں میری مدد کی۔

مواد کی فراہمی میں، میں نے جن لائبریریوں سے استفادہ کیا ان لائبریریوں کے ذمے داران کی بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی میں رہنمائی فرمائی۔

میں تہہ دل سے اپنے والدین کی احسان مند ہوں کہ ان کی دعاؤں سے میں یہاں تک پہنچی خصوصاً والد مرحوم صاحب کی جن کی شفقت ومحبت کی بدولت میں اس لائق ہوئی کہ کچھ لکھ پڑھ سکوں (اللہ ان کی مغفرت فرمائے اوران کے درجات کو بلند کرے۔ آمین) میرا یہ مقالہ میرے والد مرحوم صاحب کی محنت وقربانی کا ثمرہ ہے جنھوں نے دوران تحقیق داعی اجل کو لبیک کہا کاش کہ وہ میری تحقیقی کاوش کو مکمل ہوتے دیکھ پاتے!

میں اپنے مشفق بھائی ریاست کمال اور عابد کمال کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جو بچپن سے میری تعلیم وتربیت میں پیش پیش رہے۔ چھوٹے بھائی جناب عابد کمال کی احسان مند وشکر گذار ہوں جنھوں نے تعلیمی مراحل میں میری کفالت اور سرپرستی کی اور والد کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اپنی بہن جمیلہ خاتون کی بھی ممنون ہوں جو پڑھائی کے دوران مجھے نیک مشوروں سے نوازتی رہیں اور ہر مرحلے میں میری ہمت افزائی کرتی رہیں۔ محترم شوہر نامدار کی بھی شکر گذار ہوں کہ دوران تحقیق انھوں نے میری معاونت کی اور میرے حوصلے کو بڑھاتے رہیں۔

آخر میں اپنے دوست واحباب کی مشکور وممنون ہوں خاص طور سے اطیع اللہ کی جنھوں نے میرے اس یونی ورسٹی کے پہلے دن سے لیکر اب تک کے تمام مراحل میں ساتھ دیا اور دوران تحقیق مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ ڈاکٹر نغمہ پروین، رشدہ شاہین اور رسینہ کے کی بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری حوصلہ افزائی کی۔ آخر میں یونی ورسٹی کیمپس کی راہ گذاریوں، فضا اور ماحول کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا عین فرض سمجھتی ہوں جس کی بدولت آج میں اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکی ہوں۔

زنیرہ
پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر
یونی ورسٹی آف حیدرآباد

باب اول

شہناز نبی؛ سوانح وشخصیت

سوانح

عصر حاضر کی خواتین ادیبوں میں شہناز نبی مختلف جہات کی مالک ہیں جنھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور کم وقت میں اپنی شناخت بنالی ہے۔ان کے 6 شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔اس کے علاوہ ایک تانیثی نقاد کی حیثیت سے اردو ادب میں وہ ایک بے باک نسائی آواز بلند کرنے والی خاتون مانی جاتی ہیں ۔انھوں نے اب تک دو درجن سے زائد کتابیں اردو ادب کو بہترین سرمائے کے طور پر دی ہیں۔ادب اطفال سے ان کا گہرا لگاؤ ہے اس تعلق سے انھوں نے کئی نظمیں، ڈرامے اور افسانے لکھے ہیں جس میں بچوں کی ذہنی ساخت اور تعلیم وتربیت کی رہنمائی ملتی ہے۔

شہناز نبی کا تعلق دوصوبوں سے رہا ہے۔نانیہال ان کا یوپی میں ہے جبکہ ان کے والد کا تعلق صوبۂ بنگال سے ہے۔ان کا نانیہال یوپی کے مرزا پور میں ہے لیکن بعد میں ان کے نانا بھی مرزا پور سے کلکتہ میں آکر بس گئے تھے۔اس طرح سے یوپی اور بنگال دونوں کا اثر ان کی زندگی پر رہا ہے لیکن بنگال کا زیادہ ہے۔ان کے والد کا نام غلام نبی اور والدہ کا نام سلیم النساء تھا۔ان کے والد محترم اپنے والدین یعنی شہناز نبی کے دادا غلام رسول اور دادی منی بیگم کے واحد اولاد تھے۔اردو سے ان کا اچھا خاصا لگاؤ تھا۔انگریزی تعلیم سے بھی وابستہ تھے۔ان کی والدہ بھی تعلیم یافتہ تھیں۔دینی کتابوں کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا۔وہ اردو زبان کی کتابیں پڑھتی تھیں ساتھ ہی وہ ایک سلیقہ شعار ،خاتون تھیں ۔گھر کے سارے کام کاج کو بڑی ذمے داری اور ہنر مندی سے انجام دیتی تھیں۔سلائی، بنائی، کڑھائی اور امور خانہ داری میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ان کے تعلق سے شہناز نبی کہتی ہیں:۔

> ”میری ماں کا داخلہ کلکتہ کے سب سے بڑے انگریزی اسکول لوریٹو ڈے کنوینٹ میں ہو چکا تھا۔ان کا یونیفارم اور جوتے بھی خریدے جا چکے تھے لیکن میری ماں کے چچا نے اپنے بھائی یعنی میرے نانا پہ طنز کسا کہ وہ بیٹی کو 'میم' بنانا چاہتے ہیں۔اور پھر امّی کا داخلہ ہونے سے رہ گیا۔میں وہ راتیں نہیں بھول سکتی

جب میری ماں اپنے دل کا غم بیان کرتی تھیں اوران کی آنکھوں میں تاسف کے آنسو جھلملاتے تھے۔ گرچہ میری ماں نے انگریزی واجبی سیکھ لی تھی لیکن جس اسکول کی دیواریں ان کے گھر سے آ کر ملتی تھیں، اس میں تعلیم حاصل نہ کرسکنے کا ملال میری ماں کو مرتے دم تک رہا۔ وہ چہار دیواری سے باہر آنے والے گیت کے بول سن سکتی تھیں جو صبح کی اسمبلی میں اسکول کے اندر گائے جاتے تھے۔ میری ماں اردو اور قرآن پڑھنے کے علاوہ، سارے گھریلو کام خوب جانتی تھیں۔ سلائی، اون بننے، کروشیا بنانے، کھانا پکانے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ ہومیوپیتھی دواؤں کی معلومات خوب تھی۔ بچپن میں ہمارا زیادہ تر ہومیوپیتھی علاج وہی کیا کرتی تھیں۔ ان کے پاس لاہور سے شائع شدہ اردو میں ہومیوپیتھی دواؤں کی کتابوں اور رسائل کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔'' 1؎

شہناز نبی کی شخصیت پر ان کی والدہ کا گہرا اثر پڑا ہے۔ ان کی والدہ کے ہنرمندی کے عناصر ان کی تخلیقات میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں ہم ادب اطفال کا ذکر خصوصی طور پر کرسکتے ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ بچوں کے تعلق سے جب کوئی تخلیق لکھی جاتی ہے یا پیش کی جاتی ہے تو خصوصاً ڈرامائی انداز میں یا واقعاتی طور پر اس میں تربیت کے عناصر کا موجود ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اور ابتدائی تربیت، ماں کی تربیت ہی سے حاصل ہوتی ہے اور بچوں پر ماں کی تربیت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے بعد میں یہی تربیت تہذیب کی شکل میں انسان کی زندگی میں نمودار ہوتی ہیں۔ متذکرہ بالا اقتباس میں شہناز نبی کے قول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شہناز نبی کا ذہنی شغف اگر بچوں کی طرف مبذول ہوا تو اس میں ان کی ماں کا اچھا خاصا حصہ رہا ہے۔ بچوں کی صحت علاج ومعالجہ میں بھی وہ ماہر تھیں یہ ساری باتیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ بچوں کی ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی نبض پر انھیں پکڑ تھی جس کا اثر ہمیں شہناز نبی کی تخلیقات میں بھی صاف طور پر دیکھائی دیتا ہے۔

شہناز نبی کے والد فارغ البال صفت انسان تھے۔ وہ سادگی اور شرافت کے ساتھ زندگی گذارنے کے حامی تھے۔ جائیداد کے چھوٹے بڑے یا خاندانی تفرقہ میں کورٹ کچہری کے قائل نہیں تھے۔ ان کے والد کی شادی کم عمری ہی میں ہوگئی تھی۔ کچھ وقت تو وہ اپنے والدین کے ساتھ رہیں پھر اپنا کاروبار خود سنبھالا۔ ملازمت اور تجارت دونوں ہی پہلوان کی زندگی میں تھے۔ شہناز نبی کے والدین کی زندگی کے بارے میں جاننے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے

کہ شہناز نبی کو لکھنے پڑھنے کا شوق اپنے والدین سے ملا۔ بچپن ہی سے انھوں نے اپنے والدین کو اردو ادب سے منسلک پایا۔ ماں کو دینی کتابوں میں دلچسپی تھی تو والد کو اردو رسائل و جرائد سے خاصا لگاؤ تھا۔ ادیبوں اور نقادوں کے بارے میں یہ بات عام طور سے دیکھی جاتی ہے کہ ادب سے ان کی رغبت میں ان کے والدین کا اچھا خاصا حصہ ہوتا ہے۔ اکثر ادیبوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے والدین رسائل منگوا کر پڑھتے تھے اور اس طرح یہ ادیب ان کی طرف مبذول ہو جاتے تھے کچھ ایسا ہی شہناز نبی کے ساتھ بھی ہوا ان کے والدین کے پاس اردو رسائل و اخبارات اور جاسوسی ناولوں کا ذخیرہ تھا جن کو دیکھ کر ان میں مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔

شہناز نبی کا شمار بیسویں صدی کی خواتین ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جب میں نے ان سے ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا:۔

> ''مجھے اس سوال کا جواب دینے میں کوفت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس لیے نہیں کہ اس سے میری عمر کا پتہ چل جائے گا۔ عام طور پہ عورتوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ عورتوں کو اپنی عمر چھپانے کی عادت ہے گرچہ سچ تو یہ ہے کہ اس علت سے مرد حضرات خالی نہیں۔ میرے ساتھ معاملہ برعکس ہے۔ دسویں جماعت میں فارم میں غلط تاریخِ پیدائش کی وجہ سے میری عمر اصل عمر سے زیادہ ہوگئی۔'' 2

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شہناز نبی باتوں ہی باتوں میں یہ کہہ تو گئیں کہ میری تاریخ پیدائش کسی وجہ سے سرکاری دفاتر میں غلط تاریخ کے ساتھ درج ہوگئی ہے حالانکہ اگر وہ چاہتی تو دو لفظوں میں دونوں تاریخ بتا دیتیں بہر حال یہ ان کا اپنا خیال ہے لیکن کچھ ناقد اپنی کتابوں میں ان کی تاریخ پیدائش رقم کیے ہیں ان میں پروفیسر وہاب اشرفی صاحب جو اردو ادب کے مشہور محقق، ناقد تھے اپنی کتاب ''عالمی تحریک نسائیت مضمرات و ممکنات'' میں شہناز نبی کے متعلق لکھا ہے:۔

> ''ان کے والد کا نام غلام نبی تھا۔ شہناز نبی یکم مارچ 1958 میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں ۔ایم۔اے اردو میں کیا۔درس وتدریس سے وابستہ ہو گئیں۔۔۔۔موجودہ شاعرات میں شہناز نبی کی اپنی جگہ ہے۔انھوں نے کم وقت میں اپنی شناخت کرا لی ہے۔شاعری کے علاوہ گاہے بہ گاہے مضامین بھی لکھتی ہیں۔'' 3

اسی طرح سے محترمہ کہکشاں تبسم اپنی کتاب ''نسائی شعری آفاق'' کے مضمون 'شہناز نبی' میں لکھتی ہیں:۔

''شہناز نبی عصر حاضر کی ایک منفرد شاعرہ ہیں۔ 20 مارچ 1958 میں کولکاتا میں ان کی ولادت ہوئی۔کولکاتا یونی ورسٹی سے انھوں نے اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔۔۔۔ان کی تخلیقی فکر شاعری، ڈرامہ اور ترجمہ نگاری کے علاقے میں اپنی جولانی دکھاتی ہے۔'' 4

متذکرہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ادیبوں اور ناقدوں کے درمیان ان کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے لیکن سن پیدائش میں مماثلت ہے۔شہناز نبی سے جب میں نے اس اختلاف کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میری تاریخ پیدائش سرکاری ریکارڈ میں 20 مارچ 1958 ہی ہے۔اس لیے میں بھی سرکاری ریکارڈ کی اسی تاریخ پیدائش کو ان کی تاریخ پیدائش کے طور پر لکھتی ہوں۔

شہناز نبی کے کل سات بہن اور ایک بھائی ہیں۔ان کی تین بہنیں وفات پا چکی ہیں۔ان کی تمام بہنیں تعلیم یافتہ ہیں اور ملازمت کے مختلف پیشوں سے منسلک بھی ہیں۔ان کے بھائی بہنوں میں ان کی طرح کوئی شاعر یا ادیب نہیں ہیں البتہ ان کی دو بہنوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو افسانے کے ذریعہ ظاہر کیا ہے اور بقول شہناز نبی ان کے افسانے رسالوں میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ان کی بہن مہ جبین کے افسانے ادبیت کے حامل ہیں جو شائع بھی ہوئے ہیں۔

شہناز نبی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بچپن ہی سے کیا۔کم عمری ہی سے انھیں نظمیں پڑھنا اور ان کو یاد کرنا بہت پسند تھا اور یہ بات ایک تخلیق کار کی صفت میں ملحق ہے۔تخلیق کرنا ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے لیکن اس میں نکھار لانے کے لیے دیگر شعراء اور ادباء کی تخلیقات کو پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی موضوع پر کچھ تخلیق کرنے کے لیے مطالعے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ہمارے کئی بڑے ادیبوں نے بھی اس بات کی تائید میں لکھا اور کہا ہے جیسے رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور شاعر راحت اندوری بھی کہتے تھے کہ 'ایک اچھا شاعر بننے کے لیے اپنے سے بڑے شاعروں کے کم سے کم دو سو اشعار کا یاد ہونا ضروری ہے' اور شہناز نبی نے بچپن ہی میں نہ صرف بڑے شاعروں کو پڑھا بلکہ ان کے کلام کو بھی یاد کیا جس کی بدولت آج ان کی شاعری اچھی خاصی تعداد میں موجود ہے اور ان کے چھ شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔انھیں بچپن سے مطالعے کا شوق تھا۔وہ اپنے ذاتی خرچ کو بچا کر

غالبؔ، میرؔ، دردؔ، ذوقؔ، مجازؔ، فیضؔ، مجروحؔ، منٹوؔ، بیدیؔ، کرشن چندر وغیرہ کی کتابیں خرید کر پڑھتی تھیں۔ مطالعے کے اسی شوق نے ان کے تخلیقی سرمایے میں اضافے کیے ہیں۔ شہناز نبی اس متعلق کہتی ہیں:۔

''مجھے بچپن سے ہی نظمیں پڑھنا اور انہیں یاد کرنا پسند تھا۔ شاید اس میں نظموں کی غنائیت کا دخل رہا ہو۔ جب میں آٹھویں جماعت میں تھی تو میں نے پاکٹ بکس خریدنا شروع کیا کہ یہ سستی ہوا کرتی تھیں اور اپنے ٹفن سے پیسے بچا کر خریدی جا سکتی تھیں۔ اس میں غالب، میر، درد، ذوق جیسے کلاسک شعرا بھی تھے اور مجاز، فیض، مجروح جیسے ترقی پسند شعرا بھی۔ چھپائی اتنی خراب ہوا کرتی تھی کہ پڑھتے ہوئے آنکھیں پھوٹ جاتی تھیں۔ تاہم کوئی چارہ نہ تھا۔ میرے والد لٹ پٹا کر بنگلہ دیش سے لوٹے تھے۔ پیسوں کی شدید تنگی تھی۔ کتاب خریدنے کے شوق کو خود ہی پورا کرنا پڑتا تھا۔ اس دوران کرشن چندر، منٹو، بیدی، ٹھاکر پونچھی کو بھی زیادہ تر پاکٹ سائز میں پڑھا۔ مطالعے کو انگیز کرنے میں ایک مقامی لائبریری کا بھی ہاتھ رہا۔ ایک شخص کی ذاتی لائبریری تھی جو ان کے لئے روزگار کا ذریعہ تھی۔ کم پیسوں میں کتابیں پڑھنے کو دستیاب تھیں تو ہائی اسکول کے دوران ہی ہم اس لائبریری کی کتابیں چاٹ چکے تھے۔ پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، خلیل جبران تو تھے ہی۔ ان کے علاوہ پاپولر لٹریچر کا بھی زبردست سرمایہ تھا مثلاً رضیہ بٹ، سلمیٰ کنول، واجدہ تبسم، اور نہ جانے کیا کیا۔ ہمارے ابّا کے کمرے میں اردو رسائل و اخبارات کا غضب کلیکشن تھا۔ جاسوسی ناولوں کا مکمل سیریز۔ ان دنوں کوئی مجھ سے پوچھتا کہ کیا پڑھا؟ تو میں ایک مشہور شعر کو کچھ اس طرح سناتی تھی

اچھی پڑھ لی، خراب پڑھ لی جیسی پڑھ لی، کتاب پڑھ لی'' 5

اس طرح ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ شہناز نبی تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگی تھیں۔ ان کی پہلی نظم ماہنامہ ''روبی'' دہلی میں 1974 شائع ہوئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے مضمون ''شہناز نبی کی نظمیں'' میں لکھتے ہیں:

''شہناز نبی نے 13 سال ہی کی عمر سے نظمیں کہنی شروع کر دی تھیں۔ ان کی

پہلی نظم اردو کے ایک ادبی جریدے میں 1974 میں شائع ہوئی۔نظموں کے علاوہ انھوں نے تنقید، ڈرامے اور افسانے بھی خوب لکھے۔'' 6

اس نظم پر ادیبوں اور شاعروں کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی تھی اور ان کے والد صاحب نے بھی ان کو شاباشی دی جس کو یہ انعام کے طور پر دیکھتی ہیں اور اس بارے میں یہ کہتی ہیں:۔

''اسکول کے دنوں سے ہی مجھے ڈائری لکھنے اور شعر و شاعری کی عادت پڑ چکی تھی۔ایک بات گوش گذار کرنا چاہوں گی کہ میرا کوئی استاد نہیں ہے۔میں نے کسی سے کبھی کوئی اصلاح نہیں لی۔میرے بڑے بہنوئی ادب کا رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔وہ اسکول کے دنوں سے ہمارے استاد بھی رہے۔لیکن میں نے ان سے کبھی کوئی اصلاح نہیں لی نہ ہی ان کو کوئی شعر سنایا۔ہائی اسکول کے دوران شاید میری ایک نظم اور چند قطعات ایک مقامی رسالے میں شائع ہوئے تھے۔ اس کی کاپی میرے پاس نہیں۔اگر وہ رسالہ مل جائے تو یاد آئے کہ وہ کون سے قطعات تھے۔اس کے بعد ایک نظم ماہنامہ 'روبی' (دہلی) میں شائع ہوئی۔اس نظم کو والد کے ڈر سے آدھے نام سے بھیجا۔ایڈیٹر نے نظم اشاعت کے لئے منظور کر لی اور تصویر منگوائی۔مرتی کیا نہ کرتی۔اب تصویر بھیجی گئی۔ان دنوں ادارے ادیب و شاعر کو مفت کاپی بھیجتے تھے۔کاپی میرے گھر پہ آئی۔میرے والد نے رسالہ کا ریپر چاک کیا۔پڑھنے لگے۔میری نظم دیکھی۔پتے پہ غور کیا۔تصویر پہچانی۔ماں سے پوچھا 'شانو ہے نا؟' ماں نے میری طرف دیکھا۔میں ڈانٹ کا انتظار کر رہی تھی۔لیکن میرے والد نے کہا 'آدھا نام کیوں۔؟ چھپنے کے لائق ہوئی تو باپ کا نام ہٹا دیا۔؟' اس دن کے بعد میں نے اپنے والد کا نام اپنے نام سے کبھی نہیں ہٹایا۔یہ ایک طرح کی حوصلہ افزائی تھی، ایک شاباشی تھی جو مجھے میرے والد کی طرف سے ملی تھی اور یہی میرا انعام تھا اور آگے بڑھنے کی ترغیب بھی۔'' 7

شہناز نبی کی ابتدائی تعلیم و تربیت دیگر ادباء اور شعراء کی طرح گھر ہی پہ والدین اور افراد خانہ کی نگرانی میں ہوئی۔کم عمر ہی میں الگ الگ زبانوں کی چھوٹی موٹی کتابیں پڑھ لی تھیں کیونکہ ان کے والدین اور افراد خاندان

سب کہ سب پڑھے لکھے تھے اس لیے ان کے پڑھنے میں ان لوگوں کی رہنمائی مفید ثابت ہوئی۔ اردو انگریزی زبان کے ساتھ بنگلہ سے بھی ان کی اچھی واقفیت ہے لیکن ان کے گھر میں اردو کا ہی زیادہ زور رہا۔ سب لوگ بولنے کی حد تک بنگلہ کو پسند کرتے تھے اور ایک زبان کے طور پر سب نے اردو زبان کو اختیار کیا تھا۔ یہ اردو زبان میں پلی بڑھیں اور اس طرح بچپن ہی سے ان کے تعلیمی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

بنگال کے مشہور و معروف شہر کلکتہ کے مشہور اسکول انجمن ہائی اسکول سے انھوں نے ہائی اسکول کیا جو اس وقت شہر کلکتہ کے نامور اسکولوں میں سے ایک تھا۔ ان کے والدین نے انھیں بہترین تعلیم دلانے کے لیے اس اسکول میں ان کا داخلہ کرایا۔ اس کے بعد انھوں نے لیڈی برابورن کالج سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ لیڈی برابورن کالج کا شمار بھی اس وقت کے بہترین کالجوں میں ہوتا تھا جس میں اعلیٰ گھرانے کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اس طرح سے شہناز نبی نے گریجویشن بھی کیا۔ ان اداروں کا اثر ان کی ادبی زندگی پر بھی پڑا ہے۔ ایم۔ اے کی تعلیم کے لیے کلکتہ یونی ورسٹی کا رخ کیا اور یہیں سے انھوں نے اردو میں ایم۔ اے۔ اور بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیمی سال کے بارے میں شہناز نبی نے نہیں بتایا اور نہ ہی ان کے اوپر لکھی گئی کسی تحریر یا کتابوں میں ملتا ہے۔ 1989 میں کلکتہ یونی ورسٹی سے انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور پروفیسر ظفر اوگانوی کی نگرانی میں بعنوان ''1960 کے بعد اردو تنقید کا ارتقا'' پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔

شہناز نبی ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم سے وابستہ ہونے کے بعد ملازمت کے جس پیشے کو اختیار کیا وہ درس و تدریس تھا۔ انھوں نے مختلف درسگاہوں اور اداروں میں تعلیمی فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں کلکتہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں 1999 میں سینیئر لکچرار کی حیثیت سے ملازمت کی پھر یہیں ریڈر ہوئیں۔ صدر شعبہ کا عہدہ بھی سنبھالا اور 2017 میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئیں۔

تصانیف:

شہناز نبی کے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی سرمایہ تقریباً دو درجن سے زائد کتابوں پر منحصر ہے۔ باقاعدہ طور پر ان کی پہلی کتاب ''بیدی ایک جائزہ'' ہے جو 1985 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کے دوران طالب علمی ہی میں شائع ہو گئی تھی۔ اس کتاب میں راجندر سنگھ بیدی پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس میں شہناز نبی کا بھی ایک مضمون

شامل ہے جس میں راجندر سنگھ بیدی کے فکر وفن کا محاسبہ کیا گیا ہے۔اس طرح یہ ان کی پہلی کتاب ہے جو ترتیب کی شکل میں شائع ہوئی۔ان کی تصانیف کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

شعری مجموعے:

بھیگی رتوں کی کتھا (غزلوں کا مجموعہ:1990)

اگلے پڑاؤ سے پہلے (نظموں کا مجموعہ:2001،دوسری اشاعت 2016)

پسِ دیوارِ گریہ (نظموں کا مجموعہ:2008)

شرارِ جستہ (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ:2013)

سخنِ نیم شب (غزلوں کا مجموعہ:2015)

نظمیں ہماریاں (نظموں کا مجموعہ: 2018)

تنقیدی وتحقیقی کتابیں:

لسانیات اور دکنی ادبیات (پہلی اشاعت:1993 دوسری اشاعت:2009)

اردو ڈرامہ، آغا حشر اور صیدِ ہوس (1998)

فورٹ ولیم کالج اور حسنِ اختلاط (2003)

منشوراتِ بنگالہ (2006)

کلامِ نساخ (2007)

تانیثی تنقید (2009)

فیمنزم: تاریخ وتنقید (2012)

تنقیدی مطالعات (2015 اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ یافتہ)

طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ:

پہچان مجھے نادان (2016)

اس مجموعے میں الگ الگ موضوعات پہ ڈرامے ہیں۔ چونکہ وہ زیادہ تر نکڑ ناٹک کرتی ہیں اس لیے ناٹک کے ذریعہ عوام تک سماجی مسائل لے جاتی ہیں مثلاً بچہ مزدوری، گھریلو تشدد، جہیز کی لعنت، دہشت گردی کے مضر

اثرات، بچوں پر جنسی تشدد، مادری زبان میں ذریعۂ تعلیم کے فوائدوغیرہ۔ یہ سارے ڈرامے ان کی ہدایت میں اسٹیج کیئے جا چکے ہیں۔ ان میں استعمال ہونے والے گیت بھی ان ہی کے ہیں اور گیتوں کی دھن بھی۔ اس مجموعے میں پریم چند کی کہانی 'نمک کا داروغہ' کا adaptation بھی شامل ہے جسے اسٹیج کیا جا چکا ہے۔

اس کے علاوہ بھی اردو افسانوں پہ مبنی کئی ڈرامے ہیں جنہیں الگ سے شائع کیا گیا ہے، مثلاً منٹو کا افسانہ سوگندھی، بابو گوپی ناتھ، کرشن چندر کا افسانہ منگو کوچوان، کالو بھنگی، وغیرہ۔

سفر نامہ:

کشمیر جنت بے نظیر (2019)

<u>تراجم:</u>

بچوں کے ڈرامے۔ (بنگلہ سے اردو۔ پہلی اشاعت 1989۔ دوسری اشاعت (2016)

کرشن چندر کے اردو ناول 'غدار' کا بنگلہ ترجمہ: بشاّس گھاتک (1992)

نر باچیتو اردو کبیتا: بیس عدد اردو شاعروں کی نظموں کا بنگلہ ترجمہ (2016)

جدید ہندی نظمیں (2022)

<u>ترتیب:</u>

بیدی: ایک جائزہ (1985

غالب اور کلکتہ (1999)

سیمینار و کانفرنسوں میں شرکت:

پروفیسر شہناز نبی نے ملک اور بیرون ملک میں اردو زبان کی نمائندگی بھی کی ہے۔ وہ ہندستان کے باہر پاکستان، سعودی عرب، بنگلہ دیش وغیرہ میں مشاعرے اور سیمینار کی غرض سے گئیں اور مشاعروں میں اپنے کلام کو پیش کیا۔ شہناز نبی ایک فعال شخصیت کی مالک ہیں وہ آج بھی مختلف جگہوں پہ ہونے والے سیمیناروں میں شرکت کرتی ہیں کہیں مہمان خصوصی بن کر تو کہیں ان کی صدارت کرتی ہیں اور مقالے بھی پیش کرتی ہیں۔

انعام واعزازات:

شہناز نبی کو ان کی ادبی خدمات پر مختلف اکیڈمیوں نے ایوارڈ سے نوازا ہے مثلاً اتر پردیش اردو اکیڈمی، دہلی اردو اکیڈمی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، بہار اردو اکیڈمی، راجستھان اردو اکیڈمی وغیرہ نے انھیں مختلف کتابوں پر ایوارڈ سے نوازا ہے۔

''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' (نظموں کا مجموعہ) 2001 اس پر راجستھان اردو اکیڈمی نے انعام دیا۔

''بچوں کے ڈرامے'' 1989 اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکیڈمی اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انعام دیے۔

''تنقیدی مطالعات'' 2015 اس پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ایوارڈ سے نوازا۔

''اردو ڈراما، آغا حشر اور صید ہوس'' اس کتاب پر مغربی بنگال نے انعام سے نوازا

2017 میں غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کی جانب سے انھیں ''غالب ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ان کی شاعری کے لیے دیا گیا۔

ایوارڈ کے تعلق سے شہناز نبی نے یہی معلومات فراہم کی ہیں۔ ایوارڈ کے سن اور تفصیلی معلومات کو بتانے سے انھوں نے گریز کیا۔

شخصیت

لفظ 'شخصیت' بہت وسیع ہے۔ یہ انسان کے افعال وکرداراور سیرت پرمبنی ہے۔لفظ 'شخصیت' کوانگریزی میں "Person" کہتے ہیں جولاطینی کےلفظ "persona" سے لیا گیاہے جس کا مطلب ہے وہ مکھوٹا یا مصنوعی چہرہ جوڈراماکے کردارڈرامے پیش کرتے وقت اپنے چہرے سے لگاتے ہیں۔گویااس سے ظاہری شکل وصورت مراد لیاجاتاہے۔شخصیت کی تعریف میں فرخ جاوید لکھتے ہیں:۔

''لفظ شخصیت(person)اصل میں لاطینی persona سے اخذ کیا گیا ہے
جس کا مطلب ایسے نقاب سے ہے جوبطور مصنوعی چہرہ استعمال کیا جاتا ہے۔گویا
persona کا مطلب ظاہری شکل وصورت اورعمل وحرکات ہے۔'' 8

کسی شخص کی ذہنی، سماجی، معاشرتی وادبی زندگی کا اندازہ اس کی شخصیت سے ہی لگایا جاسکتا ہےاور انسان کی شخصیت اس کی پرورش وپرداخت سے ہی بنتی ہے اس میں اس کا اپنا خاندان، والدین، بھائی بہن، اعزا و اقربا، معاشرہ غرضیکہ انسان کے گردونواح کے تمام واقعات وحادثات اس کی شخصیت میں مدغم ہوتے ہیں اور پھر انسان میں یہ تمام چیزیں اس کے افعال کے محرکات ثابت ہوتے ہیں۔

انسان کی شخصیت اس کے ظاہری وباطنی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں انسان کے رہن سہن، طور طریقے، لوگوں کے ساتھ تعلقات، عادات واطوار، سیرت وکردار سب کچھ شامل ہوتے ہیں اور یہ تمام چیزیں انسان کی موروثی ہوتی ہیں یا پھر ماحول ومعاشرت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔شہناز نبی جس ماحول اور معاشرے میں پلی بڑھی ہیں وہ ایک تعلیم یافتہ معاشرہ تھا۔ان کے خاندان میں علم کا بول بالا تھا۔انھوں نے کئی شہروں اور صوبوں کی تہذیب وتمدن کو دیکھا ہے۔جب ہم ان سے ملتے ہیں تو ان کے مزاج سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں وسعتِ ذہن ہے۔

شہناز نبی کوالگ الگ تہذیب اور معاشرے سے واقفیت حاصل ہےاوراس کی جھلک ہمیں ان کی تنقیدی و

ادبی کاوشوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل کے تہذیبی تصادم ان کے ادبی سرمایے میں موجود ہیں۔ دور حاضر کے مثبت اور منفی رویے بھی ان کی تخلیق کے حصے ہیں۔ آج کے دور میں سماج میں جو ظلم و جبر اور جنسی استحصال ہیں ان کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور اپنے ذہن و دل سے محسوس کیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر موجود ہیں جس میں تیزی کچھ حد تک شدت لیے ہوئے ہے اور سختی بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی ہمیں ان کے یہاں جذباتی رویے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن کلی طور پر وہ ایک سلجھی ہوئی سنجیدہ خاتون اور ایک سلیقہ شعار ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلیقہ مند شخصیت بھی ہیں۔

شہناز نبی ایک صحتمند خاتون ہیں۔ رنگ متوسط ہے۔ چہرہ نہ زیادہ لمبا نہ گول ہے۔ ناک بھی متوسط ہے۔ قد متداول ہے۔ جسمانی ساخت میں کچھ حد تک جسامت ہے۔ لہجہ میٹھا ہونے کے ساتھ کہیں کہیں تیزی بھی لیے ہوتا ہے۔ حقیقت پسندی ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ باتوں کو گھما پھرا کر پیش نہیں کرتی ہیں بلکہ دوٹوک انداز میں بات کرتی ہیں جس سے کبھی کبھی گفتگو کرنے والوں کو ان کے مزاج میں سختی معلوم ہوتی ہے لیکن کچھ دیر بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کی اس سختی میں بھی کہیں نہ کہیں اصلاح پسندی کا جذبہ موجود ہے۔

شہناز نبی کے یہاں سماج کے ظلم و جبر دیکھ کر انسانی فطرت کے جذباتی رویے دیکھے جا سکتے ہیں۔ سماجی اور فلاحی کاموں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ساتھ ہی مظلوموں کی آواز کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے لیکن جو شوشہ ان کی زندگی میں عام انسان کے مطابق کمی کا احساس دلاتا ہے وہ یہ کہ انھوں نے زندگی کے تمام لوازمات کو تو پورا کیا ہے لیکن ازدواجی زندگی سے منسلک نہیں ہوئیں۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے جس کی وجہ متذکرہ سطروں میں پیش کیے اسباب بھی ہو سکتے ہیں ویسے اردو ادب میں کچھ ایسی مشہور و معروف خواتین بھی گذری ہیں جنھوں نے ازدواجی زندگی سے خود کو دور رکھا ہے شہناز نبی بھی ان میں سے ایک ہیں۔

شہناز نبی بڑی خوددار ہیں۔ اپنے ضروریات کے کام وہ خود کرتی ہیں۔ وقت کا بہترین استعمال کرتی ہیں۔ فضولیات سے دور رہتی ہیں۔ صحت کے معاملے میں چاک و چوبند ہیں۔ کھانے پینے کے اصول کی پابندی کرتی ہیں۔ دیر رات تک کتابوں کے ساتھ اپنا وقت گذارتی ہیں جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ مطالعے کی کس حد تک شوقین ہیں۔ یہی ساری چیزیں انھیں خواتین قلمکاروں میں انفرادیت عطا کرتی ہیں۔

سبکدوشی کے بعد بھی شہناز نبی نے اپنے آپ کو اس طرح رکھا ہے کہ ان کی صحت میں کہیں بھی کمی دیکھنے کو

نہیں ملتی۔ کھانے میں انھیں مچھلی، گوشت، مرغ، انڈے پسند ہیں۔ پھلوں کی بھی شوقین ہیں۔ شہناز نبی اپنی زندگی کو نفاست بھرے انداز میں گذارتی ہیں صاف ستھرے اور، مہذب ترین کپڑوں کا استعمال کرتی ہیں۔ یہ زیادہ تر شلوار قمیض پہنتی ہیں۔ تقریباً ہر رنگ ان کو پسند ہے۔ بناؤ سنگھار کا بھی خیال رکھتی ہیں۔

شہناز نبی ہندوستانی تہذیب کی پاسداری کرنے والی ایک خاتون ہیں انھوں نے اب تک پنی زندگی میں تمام رشتوں کی پاسداری کی ہے۔ کبھی بیٹی بن کر، کبھی بہن بن کر، کبھی خالہ تو کبھی پھوپھو بن کر، کبھی استاد، نگراں بن کر تو کبھی دوست بن کر۔ وہ اپنے والدین سے بے حد قریب تھیں۔ وہ ان کی ایک فرماں بردار بیٹی تھیں۔ اپنی ماں سے کچھ زیادہ ہی قریب تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں ماں کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔

شہناز نبی اپنے بھائی اور بہنوں سے بہت پیار کرتی ہیں، ان کے زندگی کے تمام معاملات پر وہ ان کی معاون ثابت ہوئی ہیں۔ یہ اپنی بہنوں سے بہت قریب ہیں۔ ان کی بہن نیلو نبی اکثر ان کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اپنے تخلیق کردہ ڈراموں کی کرداروں کی پیش کش میں اپنی بہن کو بھی ایک کردار کے طور پر اسٹیج پہ ڈرامے پیش کروائی ہیں۔ ان لوگوں کو سیر و تفریح میں بھی ساتھ میں رکھتی ہیں۔

شہناز نبی اپنے بڑوں کا احترام کرتی ہیں اور چھوٹوں سے محبت کرتی ہیں اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتی ہیں۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ وہ اپنے دوست واحباب کا احترام کرتی ہیں۔ ان سے محبت سے پیش آتی ہیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہیں۔ اردو ادب کی دنیا کے بڑے ادباء وشعراء اور ناقد بھی ان کے قریب ہیں اور ان سے ان کے دوستانہ مراسم ہے۔

اردو کے بڑے ناقد وادیب مرحوم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ان کو خاصا لگاؤ تھا۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اپنے وقت کے بڑے ناقد تھے انھوں نے ادباء اور شعراء کی قدر بھی متعین کی ہے۔ فاروقی صاحب کی ایک خاصیت یہ رہی ہے کہ وہ تنقید بے لاگ کرتے تھے اور فن پارے کے بنا پر اس کے خالق کی تعریف کرتے تھے۔ انھوں نے شہناز نبی اور ان کے فن پاروں پر بھی اپنے تاثرات کو قلم بند کیے ہیں۔

> ''شہناز نبی جدید دور کی صاحب طرز شاعرہ ہیں۔ وہ کلاسیکی ادب کی روح سے
> آشنا ہیں لیکن روایت پرستی کے بجائے وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتی ہیں

اور زندگی اور معاشرت کی تبدیلیوں کی روشنی میں ادب کے سانچوں اور اسالیب
میں تبدیلیاں ضروری سمجھتی ہیں۔''9

زندگی کے اکثر موقعوں پر پڑھنے لکھنے کے علاوہ بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے یہاں دیگر امور میں بھی ملتے رہے ہیں۔ فاروقی صاحب کے انتقال پر شہناز نبی بے حد رنجیدہ اور افسردہ تھیں۔ آج بھی ان کے ذکر پر ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ ان کو ایک بھائی، رہنما اور سرپرست کی حیثیت سے دیکھتی تھیں۔

شہناز نبی اپنے دوستوں کے ساتھ خلوص اور ہمدردی کا جذبہ رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان سے واقفیت رکھنے والے ان کی ہمدردی اور مخلصی سے متاثر ہیں۔ اگر کوئی ان سے پہلی بار ملے تو ان کے اخلاق، سلوک، برتاؤ پر اس طرح سے اپنی رائے قائم نہیں کر سکتا جس طرح جو ان کے قریب ہیں، کرتے ہیں۔ ان کے دوست محمود ملک صاحب شہناز نبی کے متعلق کہتے ہیں:۔

''شہناز نبی ایک بہترین انسان ہیں۔ ان کے یہاں حسن اخلاق اور ایثار کا جذبہ موجود ہے۔ وہ اپنے اقربا کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہوتی ہیں۔ میرا اور مرے اہل خانہ کا ان سے اچھے تعلقات ہیں۔ آج کے دور میں مخلص دوست بہت کم ملتے ہیں۔ اس گلوبلائیزیشن کے دور میں جہاں ہر جگہ افراتفری ہے، بے چہرگی ہے۔ سب کسب مال میں ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی ہوڑ میں لگے ہیں۔ حرص و لالچ کا بازار گرم ہے ایسے میں ایک مخلص دوست کا ملنا بہت مشکل ہے اور اس دور میں بھی شہناز نبی دل کی صاف اور مخلص دوست ہیں۔ وہ زندگی کے ہر اچھے برے موڑ پر کام آنے والی ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ آپ ان کے تخلیقی سرمائے پر کام کر رہی ہیں۔''10

پروفیسر شہناز نبی کا ادبی حلقہ ملک اور بیرون ملک میں بھی رہا ہے اور وہاں کے قلم کاروں سے ان کے دوستانہ مراسم بھی ہے۔ ان کے کچھ دوست ایسے ہیں جو ان کے قریب ہیں اور ان سے سوشل میڈیا کے ذریعے اکثر ان کی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ شہناز نبی اس تعلق سے کہتی ہیں:۔

''پاکستان میں مری ایک دوست شازیہ ہے جو مجھ سے بے حد قریب ہے۔ ہم

دونوں علم وادب کے رموز پر بحث کرتے ہیں۔شاعری اورتنقید کے کسی بھی مسئلے پر بھی ہماری لمبی گفت شنید ہوتی ہے۔ادب کے علاوہ معاشرتی اور سماجی زندگی کے بارے میں ہم لوگ باتیں کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے بدلتے زمانے، بدلتی تہذیب، کی کش مکش اور تصادم کے اثرات کو بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں اور دونوں اس کے مثبت اور منفی اثرات سے ہونے والے فائدے اور نقصانات کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہیں جو میری تخلیق میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔میرا اور اس کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ وہ کسی بھی وقت مجھے یاد کر لیتی ہے یہاں تک کہ رات کے بارہ بجے ہوں یا ایک وہ کسی بھی پہر مجھے کال کر لیتی ہے اور بلا تکلف ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔'' 11

شہناز نبی ایک بہترین انسا کے ساتھ ایک بہترین استاد بھی ہیں۔ان کا اپنے شاگردوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ رہا ہے۔وہ ان سے بڑے ہی چاؤ اور محبت سے ملتی ہیں۔بچوں کی تمام مشکلات اور معاملات کو بڑے سنجیدگی سے سنتی ہیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔

شہناز نبی نے الگ الگ شعبوں میں اپنی خدمات کو انجام دیا ہے۔وہ کلکتہ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ بھی رہی ہیں۔ان کی صدارت میں شعبے نے بہت ترقی بھی کی۔وہ شعبے کے تمام کام اس طرح سے کرتی تھیں کہ ساتھی استاد ان سے خوش رہتے تھے کسی کو ان سے کوئی گلہ نہیں رہتا تھا۔اپنی صدارت میں انھوں نے شعبے سے نکلنے والا مجلّہ 'دستاویز' جو کہ برسوں سے نکلنا بند ہو گیا تھا اس کو دوبارہ سے 2003-04 میں شروع کروایا۔انھوں نے شعبے میں پہلی بار استادوں کے ری فریشر کورس کا بھی اہتمام کروایا۔شعبے میں ایم۔فل کورس کا آغاز بھی انھوں نے ہی کیا۔اپنی صدارت کے دوران انھوں نے ہر سال شعبے میں سیمینار کروایا۔ایم۔اے۔کے طلبہ وطالبات کے لیے نصاب تیار کیا۔ہندوستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں شعبہ اردو بنگال یونی ورسٹی کی نمائندگی بھی کی۔

شہناز نبی فلاحی اور سماجی کاموں کے لیے آگے آگے رہتی ہیں۔اس کے لیے وہ کئی اداروں کی رکن بھی رہی ہیں لیکن رکنیت سے الگ ہو کر بھی انھوں نے غریب بچوں کی زندگی کے لیے، ان کی تعلیم کے لیے ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کرتی ہیں اور ہر ممکن ان کی مدد کرتی ہیں۔

دور حاضر میں سماج کی کروٹ نے جو الگ الگ طرح کے گل کھلائے ہیں اس میں کمزوروں پر ظلم، ذات

پات کے بنا پر بھید بھاؤ، چھوا چھوت اور کمزور لوگوں کا استحصال یہ سب آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں اس کے خلاف بھی شہناز نبی نے آواز اٹھائی ہے اور اس میں کامیاب ہونے کے لیے انھوں نے ان وسیلوں کو بھی اپنایا ہے جس کے ذریعے کسی کے بہتے آنسوں کو پونچھا جا سکتا ہے ۔اس کے لیے انھوں نے سیاست کا بھی دامن تھاما اور 2005 میں میونسپل الیکشن جیت کرا کاؤنٹینٹس کمیٹی کی چیئر پرسن بنیں اور اس کے سہارے انھوں نے لوگوں کی مدد کی۔

شہناز نبی نے کئی فلاحی اسکیموں کے ذریعہ اپنے مخلصانہ خدمات سے اردو ادب کو بھی اونچائیوں پر پہنچانے کی کوشش کی۔ 2007 میں وہ بنگال اردو اکیڈمی کی چیئر پرسن بنیں اور اردو کے فروغ میں اپنی بے لوث خدمات انجام دیں۔ بنگال اردو اکیڈمی نے ان کی سرپرستی میں 2009 میں پہلی بار کتاب میلے کا انعقاد کروایا جس کا سہرا ان ہی کے سر جاتا ہے ۔اردو زبان کی خدمت کے لیے وہ اپنی سرپرستی سہ ماہی رسالہ ''رہروان ادب'' بھی نکالتی ہیں جس میں تحقیق وتنقید سے متعلق پرمغز مضامین ہوتے ہیں۔غرضیکہ جہاں ترقی کے آثار دکھائی دیتے ہیں شہناز نبی نے وہاں کچھ کرنے کی کوشش کی جس سے سماج اور زبان وادب کو فائدہ ہو۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی ایک ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ایثار وقربانی کا جذبہ ان کے دل میں بھرا ہوا ہے۔ بحثییت انسان اپنی ذمے داری کو جانتے ہوئے وہ تمام رشتوں کو بھی اپنے حسن اخلاق سے بخوبی نبھایا ہے اور ایک بہترین ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان ہونے کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔

*****

حواشی:

1۔ شہناز نبی، جواب برائے سوالنامہ

2۔ ایضاً۔۔۔۔

3۔ وہاب اشرفی، عالمی تحریک نسائیت، مضمرات وممکنات، ص 301

4۔ کہکشاں تبسم، نسائی شعری آفاق، ص 328

5۔ شہناز نبی، جواب برائے سوالنامہ

6۔ رسالہ کاروان ادب، شمس الرحمٰن فاروقی، مضمون 'شہناز نبی'، ص53

7۔ شہناز نبی، جواب برائے سوالنامہ

8۔ فرخ جاوید، عمرانیات، ص 95

9۔ رسالہ کاروان ادب، شمس الرحمٰن فاروقی، مضمون 'شہناز نبی'، ص53

10۔ محمود ملک، انٹرویو بذریعہ فون، 20 مارچ 2020

11۔ شہناز نبی، مکالمہ بذریعہ فون، 5 مئی 2021

باب دوم: شہناز نبی بحیثیت شاعر

(الف) بحیثیت غزل گو:

غزل اردو زبان کی مقبول ترین صنف ہے۔ اردو شاعری کا نام آتے ہی ہمارے تصور میں جو پہلی صنف ابھرتی ہے وہ غزل ہی ہے۔غزل کی اہمت مسلم ہے اس بات کا اعتراف قریب قریب تمام اہل ادب کرتے ہیں۔اردو کے نامور ادیب رشید احمد صدیقی نے تو غزل کو' اردو شاعری کی آبرو' قرار دیا ہے۔غزل کی اہمیت اور اردو ادب میں اس کے مقام و مرتبے کے متعلق ڈاکٹر منصور خوشتر رقمطراز ہیں:

> ''غزل اردو کی سب سے مشہور صنف سخن ہے۔ ہر چند کی ہر دور میں اس کی شدید مخالفت بھی ہوئی ہے کبھی اسے ''نیم وحشی صنف سخن'' کہا گیا تو کبھی ''بے دریغ اس کی گردن اڑا دینے'' کی بات کی گئی۔اس کے باوجود غزل کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوسکی بلکہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اردو غزل کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔''1؎

غزل کی تاریخی ارتقاء پر اگر روشنی ڈالی جائے تو اردو ادب کی بیشتر اصناف کی طرح یہ بھی عرب کے صحرا سے شروع ہوکر ایران کی سرحد کو پار کرتے ہوئے ہمارے ملک ہندوستان تک پہنچی ہے۔عرب میں شاعری کی بنیاد عربی قصائد ہیں جس کی تشبیب میں غزل شامل تھی جسے 'تغزل' کہا جاتا تھا۔غزل کا سرا ان ہی قصیدوں سے جڑا ہوا ہے۔

اس بات کا سبھی تو ناقدین نے اعتراف کرتے ہیں کہ اردو زبان کی ترقی میں صوفیائے کرام کا اہم رول رہا ہے۔انھوں نے نہ صرف اردو زبان کی ترقی میں اپنی خدمات انجام دیں بلکہ وقتاً فوقتاً ہماری زبان کو نئے نئے تجربات سے بھی متعارف کروایا۔بعض اصناف کی طرح غزل کے بھی اولین نمونے ہمیں صوفیائے کرام کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس سلسلے میں کچھ ناقدین پہلا نام خواجہ مسعود کا لیتے ہیں لیکن ان کے کلام کا کوئی نمونہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔بابا فرید گنج شکر کے یہاں چند نمونے ملتے ہیں لیکن باضابطہ طور پر اردو غزل کی تاریخ میں حضرت امیر خسرو نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے فارسی اور اردو دونوں ہی زبان میں غزلیں کہیں اور اس طرح سے اردو غزل کی اولین شکل وجود میں آئی۔

اردو زبان کی ترقی اور ترویج میں خطۂ دکن کا اہم رول رہا ہے۔ گوکہ امیر خسرؔو کے یہاں ہمیں غزل کے اولین نقوش ملتے ہیں لیکن اردو غزل کو رواج دینے کا سہرا دکن کے شاعروں کے سر جاتا ہے۔ دکن کے اولیں غزل گو شاعروں میں مشتاق بیدری، لطفی، قطب الدین قادری، فیروز بیدری محمود، ملا خیالی، محمد قلی قطب شاہ، شیخ احمد گجراتی، سید اسحاق سرمست، شہباز حسینی، خواجہ دیدار فانی، ملک خوشنود، کمال خاں رستمی، حسن شوقی، شیخ غلام محمد اول، ملا وجہی، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، شاہ امین الدین اعلی، علی عادل شاہ ثانی، نصرتی، ہاشمی، محمد امین ایاغی، ابوالحسن تانا شاہ، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی کا نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعراء حضرات نے اپنے اپنے طور سے اردو غزل کی آبیاری میں اپنی خدمات انجام دیں جو غزل کی تاریخ میں قابل قدر ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے پہل غزل کے اولین نمونے شمالی ہند میں ملتے تو ہیں لیکن اس کی ترقی جنوب ہند کے شاعروں کے ہاتھوں ہوئی اور ولؔی دکنی کے دہلی آنے کے بعد دوبارہ سے اس نے شمالی ہند کا رخ کیا اور اس وقت تک اس نے ترقی کی کئی منازل طے کر چکی تھی لیکن یہاں آکر غزل اور زیادہ نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

صنف غزل اسی طرح پھلتی پھولتی مختلف رنگ اور مختلف لہجہ اختیار کیے آگے بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ یہ ابہام گوئی کا شکار ہوگئی جس کی وجہ سے اردو غزل پر کالے سایے منڈلانے لگے تھے۔ ابہام کے کثرت استعمال نے غزل کی شعریت اور تغزل کو مجروح کر دیا تھا جس کی وجہ سے غزل عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہونے لگی جس کی وجہ سے اس کی مقبولیت میں فرق آنے لگا۔ کچھ شاعروں نے تو ایہام گوئی کو ہی اپنی شاعری کا بنیاد بنالیا تھا ان میں آبؔرو، ناجؔی، مضموؔن، حاتؔم خاص ہیں۔ ایہام گوئی کے جہاں منفی پہلو ہیں وہیں مثبت بھی ہیں لیکن غزل کی یہ صورت قابل قبول قرار نہیں پائی اور بالآخر غزل اس کی بیڑیوں سے آزاد ہوکر کلاسکیت کی طرف قدم بڑھایا اور یہیں سے میؔر جیسا باکمال عوامی شاعر صنف غزل کے گیسو سنوارنے لگا۔

اردو غزل کی تاریخ میں میؔر و سوؔدا کا عہد عہدِ زریں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس وقت غزل کمال کی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ میؔر و سوؔدا کے عہد میں طرح طرح کے نئے نئے تجربات کئے گئے جس نے غزل کے حسن میں چار چاند لگائے۔ اس دور کے شعراء نے غزل کو عوامی بنا دیا یعنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا۔ چونکہ شاعری دلی کیفیات کی ترجمان ہوتی ہے اور غزل اس کے لیے سب سے اہم صنف ہے جس میں داخلی جذبات و کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس دور کے شعراء نے اردو غزل کے لیے نئے راستے ہموار کئے جس پر چل کر غزل نے لوگوں

سے ایک روحانی رشتہ جوڑا۔

میرؔ وسوداؔ کے عہد میں شعراء نے غزل کوسنوارا اورنکھارا ہی باقی رہی کسر غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ نے پوری کر دی۔ان کے دور میں غزل اپنے شباب پر پہنچ گئی۔اس کے بعد آنے والے شاعروں نے غزل کوآگے بڑھانے کا کام کیا جس میں داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، حالؔی، اقبالؔ، شادؔ عظیم آبادی، صفیؔ لکھنوی، ریاضؔ خیرآبادی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی حسرتؔ موہانی، آرزوؔ لکھنوی وغیرہ غزل گوشاعروں کی حیثیت سے نمایاں ہیں۔جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ اردوادب کی ترویج اورترقی پرمختلف تحریکوں کا اثر رہا ہے جس کے زیر اثر اردوادب نیا نیا رنگ وروپ بدلتا رہا کبھی نیارنگ اپنایا تو کبھی اس سے پیچھا چھڑایا۔اسی طرح اردوغزل پر بھی مختلف تحریکات کا اثر بالواسطہ پڑا اور اس کے زیر اثر شاعروں نے غزل کواپنے اپنے انداز سے نکھارا سنوارا۔رومانی تحریک،ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت۔غرض کہ ہر دور میں، ہر تحریک کے مشہورومعروف شاعروں نے غزل کوتقویت عطا کی۔

اردوغزل کی جہاں ایک طرف مرد حضرات آبیاری کررہے تھے وہیں ہماری شاعرات نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مردوں کے شانہ بہ شانہ چل کر شعروادب کی ترقی میں اپنا اپنا تعاون دیا۔اس سلسلے میں پہلا نام ماہ لقا بائی چندا کا آتا ہے یہ پہلی صاحب دیوان شاعرہ گذری ہیں۔ان کے بعد آنے والی نسلوں میں خواتین شاعرات کی کھیپ درکھیپ آتی رہی۔یہ مینائیں مختلف رنگ ولہجے میں غزل سرائی کرتی گئیں۔خواتین شاعرات کا جہاں بھی ذکر آئے گا وہاں اداؔ جعفری کا نام صف اول کی شاعرات میں لیا جائے گا۔انھوں نے غزل کو باقاعدگی سے فن کی کسوٹی پر پرکھا اور پہلی کامیاب غزل گوشاعرہ کے طور پر ابھریں۔اداؔ جعفری نے اردوغزل کی جڑ کوتقویت عطا کی تو ان کے بعد کی شاعرات اسی جڑ کی مضبوط شاخوں پر اپنی رنگ برنگ غزلوں کے پھول کھلائیں۔ان شاعرات میں زہرہ نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

اداؔ جعفری کے بعد پروین شاکر، کشور ناہید بعد کی آنے والی شاعرات کے لیے مشعل راہ بنیں۔ان چراغوں کی روشنی کی مدد سے نئی شاعرات نے اپنے چراغ روشن کیئے۔اورغزل کوآگے بڑھانے کا سلسلہ رواں رکھا۔اس طرح خواتین شاعرات کا ایک سلسلہ چل پڑا جو آج بھی اپنی منزل کی طرف جوش وخروش کے ساتھ گامزن ہے۔نئی شاعرات کے سامنے ایک وژن ہے۔ان کا منفرد لب ولہجہ ہے۔نیا انداز ہے۔نئے مضامین ہیں جس کی بدولت آج کی شاعرات مرد شاعر حضرات کے شانے سے شانے ملا کر چل رہی ہیں۔انھوں نے ادب میں اپنا منفرد

مقام بنالیا ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہیں۔

عصر حاضر کی غزل گو شاعرات میں شہناز نبی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے باقاعدہ طور پر اپنے شعری سفر کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''بھیگی رتوں کی کتھا'' منظر عام پر آیا۔ ان کے اب تک غزل کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں پہلا مجموعہ ''بھیگی رتوں کی کتھا'' 1990 میں دوسرا مجموعہ ''شرار جستہ'' 2013 میں اور تیسرا مجموعہ ''سخن نیم شب'' 2015 میں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

چونکہ یہ باب شہناز نبی بحیثیت شاعر پر منحصر ہے۔ میں نے اس باب کو دو ذیلی عنوانات میں منقسم کیا ہے بحیثیت غزل گو اور بحیثیت نظم گو کے عنوان سے تقسیم کرتے ہوئے ان کے فن پر گفتگو کی گئی ہے اور شاعری میں شہناز نبی کے مقام و مرتبے کے تعین کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

موضوعات:

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ شاعری تخیل کی دنیا میں پروازی کا نام ہے لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ شاعری میں عصری حقائق کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ شاعر تخیل کی دنیا میں پرواز ضرور کرتا ہے لیکن اپنے موضوعات کو وہ اپنے آس پاس کے ماحول، ذاتی تجربے اور مشاہدے ہی کے بنا پر اخذ کرتا ہے۔ ہر عہد اپنا ایک نیا موضوع رکھتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے افکار، نظریات و خیالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھیں تو عہدِ ولؔی سے میرؔ تک شاعری کا موضوع حسن عشق و تصوف رہا ہے۔ عہدِ غالبؔ سے اقبالؔ تک شاعری میں عصری حقائق اور آفاقی وژن شامل ہو جاتا ہے۔ ترقی پسندوں کا نظریہ ان سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں انقلاب کی گھن گرج دیکھنے کو ملتی ہے تو وہیں جدید شعرا کے یہاں علامتوں و استعارات کے ساتھ دیو مالائی عناصر پر مبنی موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور میں وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت موضوع بدلتے رہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر شہناز نبی کے موضوعات کی بات کی جائے تو وہ عصر حاضر کی شاعرہ ہیں ان کے موضوعات بھی عصر حاضر کے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ غزل جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ شاعر جو کچھ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے وہی اپنے شعر میں پیش کرتا ہے۔ شہناز نبی کے یہاں ہمیں ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سماجی سیاسی غرضیکہ ہر طرح کے موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پروفیسر محمد نعمان خان شہناز نبی کے بارے

میں لکھتے ہیں:۔

’’پروفیسر شہناز نبی کا شمار عصرِ حاضر کی معروف، سنجیدہ، پختہ کلام شاعرات میں ہوتا ہے۔انھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف سخن میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ کیا ہے۔کثیر اللسان اور وسیع مطالعہ ہونے کے سبب ان کے کلام میں زبان وبیان کی پختگی،فکر کی گہرائی،تانیثیت اور بدلتے ہوئے سیاسی ،سماجی منظرنامے کی عکاسی ایک خاص مکتب فکر کے بطور ہے۔موضوعاتی تنوع،فکری عمیق،تخلیقی رچاؤ،عصری آگہی،معنیاتی دروں بینی کی آمیزش نے ان میں پختہ اعتماد پیدا کر دیا ہے۔‘‘2؎

شہناز نبی کی غزلوں میں مشاہدات، تجربات، احساسات وجذبات کارفرماں ہیں۔ان کی غزلوں میں خیال کی وسعت اور گہرائی ہے۔انھوں نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت سماج کے حالات بدل رہے تھے ان بدلتے ہوئے حالات، واقعات وحادثات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔1980 کے بعد جہاں انسانیت کا گلا گھٹنا شروع ہوا۔خودغرضی، دھوکہ دہی،استحصال جیسے گھناؤنے واقعات رونما ہونے لگیں اور زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں خود پرستی اور سرمایہ داری کی گرفت مظبوط ہونے لگی اور قانون بھی انسان کے محافظ اور امن کا ضامن نہ رہا اور نہ ہی ایک انسان دوسرے انسان کا ہمدرد رہا۔ جہاں حرص ولالچ کا بازار گرم ہے اور ایک دوسرے پہ فوقیت لے جانے میں لگے ہوئے ہیں۔زمانے کی اسی الٹ پھیر اور سماج کی افراتفری، وقت کا بدلاؤ، مشینی زندگی،سب کچھ حاصل کر لینے کا خواب، میڈیا اور گلوبلائیزیشن کا دور دورہ، دنیا کا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر لینے کے باوجود بھی انسان کی بے حسی، اخلاقی قدروں کی گراوٹ،شہر ہو یا گاؤں ہر جگہ بدامنی اور خوف ودہشت کا ماحول ہے ان تمام چیزوں پر شہناز نبی کی غزلیں محیط ہیں۔پروفیسر محمد نعمان خان لکھتے ہیں:۔

’’شہناز نبی کی غزلوں کی اشاریت،رمزیت،معنویت اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ غزل کی مزاج داں،اس کی تہذیب اور عرض ہنر کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ان کا لہجہ انداز اور اسلوب اگرچہ جدید اور قدرطنزیہ ہے لیکن انھوں نے کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کر کے اس سے بہ حسب توفیق استداد استفادہ بھی کیا ہے۔‘‘3؎

درج ذیل سطروں میں ان کے ایسے اشعار جن کے اندر وہ موضوع اور نکات موجود ہیں جو ان کی غزلیہ سرمایے میں ہیں۔

کیا جانے کس سفر کا سامان ہو رہا ہے
گھر جیسے حشر کا میدان ہو رہا ہے
اک چاند میرے دل میں چمکا تھا برسوں پہلے
پر آئینہ ابھی تک حیران ہو رہا ہے
چاروں طرف دھوئیں کی بڑھتی ہوئی لکیریں
یہ شہر ہے کہ جیسے شمشان ہو رہا ہے
پہچانتے نہیں ہم اپنے پڑوسیوں کو
کثرت سے ہر محلّہ گنجان ہو رہا ہے
ہم نے کبھی سنی تھی رونق نواحِ غم کی
لیکن یہ قریہ اب تو ویران ہو رہا ہے
شاید وہی پتہ دے اس جر گۂ ستم کا
جو ہر معاملے سے انجان ہو رہا ہے
آیا ہے بعد مدت اپنوں سے کوئی ملنے
اپنے ہی گھر میں لیکن مہمان ہو رہا ہے

ان اشعار میں انسان کی بے چہرگی اور اس کے تنہائی کی روداد کو بیان کیا گیا ہے۔آج گھر گھر کے اندر قیامت بپا ہے۔ بھائی بھائی سے لڑ رہا ہے اولاد اور والدین میں تفرقہ پایا جاتا ہے۔رشتے کی پامالی کی وجہ سے گھر میں سکون نام کی چیز نہیں ہے۔فرقہ وارانہ فساد، مذہبی شدت پسندی نے شہر کے کونے کونے میں فساد برپا کیا ہوا ہے انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔اس ترقی یافتہ دور میں انسان اپنے گھر میں ایسے انجان بن گیا ہے جس طرح مہمان ہوتا ہے۔افراد خانہ میں دوری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ سب کو اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔اسلاف اور ماضی کی قدروں کا فقدان دورحاضر میں رواں ہے جس کی وجہ سے انسان بے چینی اور بے سکونی کی زندگی گذار رہا ہے۔ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شہناز نبی کی دورحاضر سے واقفیت گہری ہے۔

زمین سے پیار تھا لیکن اڑان سے پہلے
پھر آسمان رہا آسمان سے پہلے
ہمیں یقین ہے کہ تازہ کمک نہ پہنچے گی
یہ لڑ رہے ہیں عصر کی اذان سے پہلے
ہم ایسے شہر کے باشندگان ہیں کہ جہاں
قلم بھی گنگ ہوئے ہیں زبان سے پہلے

ان غزلیہ اشعار میں شاعرہ نے یہ بتایا ہے کہ آج کا معاشرہ ایسی صورت اختیار کر چکا ہے جہاں مذہبی اور سیاسی خرافات نے اور حاکموں نے سماج میں رہنے والے لوگوں کو وادیبوں کو اس طرح گنگ بنا دیا ہے کہ وہ نہ تو اپنے حق کی بات کہہ سکتے ہیں اور نا ہی لکھ سکتے ہیں۔ اس طرح دور حاضر میں انسان کی آزادی پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ ان مسئلوں کو شہناز نبی نے بڑے ہی چابکدستی سے اپنے ان اشعار میں پرویا ہے۔

سنہری دھوپ نگل کر نکھر گئے پتے
چلی جو زرد ہوا تو بکھر گئے پتے
ہوئے جو خشک تو کب ان کا خود پہ زور رہا
جدھر کو لے اڑی آندھی ادھر گئے پتے
ہر اک شاخ بلاتی رہی پسارے ہاتھ
شجر کی گود سے لیکن اتر گئے پتے

ان اشعار میں تہذیبی بحران اور فقدان موجود ہیں۔ ماضی کی تہذیب میں جہاں اولا داور والدین میں محبت کے عنصر غالب رہتے تھے۔ بھائی بہن، خالہ، پھوپھی، چچا وغیرہ کے رشتوں میں مٹھاس واپنائیت ہوتی تھی۔ بچے ان کی عزت اور قدر ومنزلت کو پہچانتے و جانتے تھے لیکن نئی تہذیب کی ایسی ہوا چلی کہ اس کے زیر اثر آج کے بچے و نوجوان ان تمام لوازمات میں بکھر چکے ہیں جب یہ بڑے ہوئے تو دنیا کی چمک دمق اور ترقی کی خواہش نے انھیں جدھر چاہا ادھر موڑ دیا۔ اپنی اپنی تہذیب کو نئی نسل نے بھلا دیا ہے۔ ان چیزوں کو شہناز نبی نے اپنی غزلوں کے ذریعے قاری وسامعین کے سامنے رکھا ہے۔

دلوں میں خوف نگاہوں میں بد حواسی ہے

کسی بھی طور جئے جاتے ہیں یہ کافی ہے
یہ کیسا شہر ہے خوابوں کی رہگذر سے پرے
جہاں پہ تو نیند ادھوری تو رات آدھی ہے
غبار شب نے میرا راستہ ہی روک لیا
سحر سے پہلے ابھی امتحان باقی ہے

شہناز نبی کے یہ اشعار حالات حاضرہ پر منعکس ہیں۔ان میں یہ باور کرایا گیا ہے کہ زمانۂ حال کی ہوا ایسی زہر آلود اور خوفناک ہو چکی ہے کہ ہر انسان ڈر اور خوف سے بدحواس ہو کر اپنی زندگی کے مراحل طے کرتا چلا جا رہا ہے۔فرقہ وارانہ فساد، ظلم واستبداد معاصر زندگی میں انسانوں کے دل ودماغ پر دہشت کا پنجا گاڑ رکھا ہے جس کی وجہ سے انسان بے اطمینانی و بےسکونی کی زندگی گذارنے کو مجبور ہے۔شہروں کی حالت ابتر ہو چکی ہے۔وہاں ظلم وستم کی داستاں زیادہ بڑھ چکی ہے۔اجنبیت وتنہائی پہرہ دے رہی ہے۔انسان کی شہری زندگی ایسی ہو چکی ہے کہ زندگی کی گہما گہمی میں رات ودن کا فطری نظام بھی بدل چکا ہے۔اس کے لیے نیند ادھوری تو رات آدھی بن گئی ہے اور دور حاضر کا یہ طرزعمل اس کا خاصا بن چکا ہے جس کی وجہ سے شہری بود وباس میں بیقراری و بےچینی گھر کر چکی ہے۔انسان دن بھر محنت کرکے آتا ہے اور رات کو صبح ہونے سے پہلے اس کے دل میں یہ جاگزیں رہتا ہے کہ ابھی کس کس امتحان سے گذرنا پڑے گا۔ان ہی واقعات اور حالات کو ان کے یہاں موضوع کے طور پر بحث میں لایا گیا ہے۔

شہناز نبی نے سماج اور معاشرے کو اور اس میں ہونے والے تمام امور وحوادث کو قریب سے دیکھا ہے اور جانا ہے۔ہر دہائی میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور ان تبدیلیوں سے سماج الگ الگ موڑ اختیار کرتا ہے ان تمام تبدیلیوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔جس طرح سے انھوں نے شہر میں ہو رہے ہے ظلم وستم کی داستان کو اپنی شاعری میں قلم بند کیا ہے اسی طرح سے عورتوں کے مسائل وبچیوں کی زندگی پر اپنی سوچ اور تجربات کو شاعری کے قلب میں ڈھالا ہے اور ان کے اسی رویے کو ہم ان کی شاعری کا بنیاد کہہ سکتے ہیں۔خواتین کے مسائل کو انھوں نے سنجیدگی ،خیال آفرینی اور تانیثی لب ولہجے کے ساتھ غزلوں کے ذریعے لوگوں کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس کے بیان کے لیے انھوں نے جذباتی رویہ اپنایا ہے جس میں ہم آہنگی ہے تو کہیں کہیں کچھ شدت بھی ہے۔

یہ پر وبال ہے مجھے
اس لیے تو کتر رہی ہوں میں
خیر کی سب نشانیاں اس میں
اور اک وجہِ شرر رہی ہوں میں
شہرِ بیداد میں بھٹکنا کیا
واقفِ رہگذر رہی ہوں میں
زہر تنہائی کے سمندر میں
لمحہ لمحہ اتر رہی ہوں میں

مندرجہ بالا غزلیہ اشعار میں شہناز نبی نے عورتوں کے اس خیال کو اجاگر کیا ہے اور ان کی دلی کیفیت کو سامنے لایا ہے کہ عورت اس سماج میں ایسی ہو چکی ہیں کہ اس کے لیے دنیا کی ترقی میں آل اولاد، خاندان کسی نہ کسی زاویے سے وبال جان ہوتے ہیں کہنے کے لیے تو ہر کوئی اپنا پیار عورتوں کے ساتھ جتاتا ہے لیکن وقت پر سگے رشتے بھی عوروتوں کے ساتھ ناانصافی کر جاتے ہیں جس کے بنا پر عورت اپنی ذات میں گھٹ گھٹ کر جیتی ہے۔ اس کی خوشی اور آزادی مفقود ہوتی ہے اور محکومیت کا سایہ ان کے سر پہ سایہ فگن رہتا ہے۔ شاعرہ نے طنزیہ لب و لہجے میں تیکھی بات کہی ہے کہ اس مرد اساس سماج میں بھلائی اور اچھائی کا ضامن دنیا مردوں ہی کو مانتی آئی ہے اور برائی، گناہ کی وجہ عورتوں کو بتایا ہے۔ شعر میں انھوں نے اس سماج پر کاری ضرب لگائی ہے جو عورتوں کی مساویت کا دم بھرتا ہے اور ساتھ ساتھ لیکر چلنے کی باتیں کرتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے جس پر انھوں نے غم اور غصے کا اظہار کیا ہے۔ عورت اپنے خاندان، سماج میں اپنی پریشانیوں اور تکالیف کے سبب تنہائی کا شکار ہوتی ہے۔ کچھ تکالیف تو عورتوں کی ایسی ہوتی ہیں کہ جس کو وہ اپنے سگوں کو بھی نہیں بتا سکتی اور یہ قاعدہ قانون سماج نے بنا رکھا ہے کہ وہ اپنی تکلیف اپنے سوا کسی دوسرے پر ظاہر نہ ہونے دے اور اگر وہ بتاتی ہے تو اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔

باغباں نے کبھی یہ سوچا ہے
کلیاں کھل کے کیوں مسکرا نہ سکیں
کن کے ہونٹوں پہ چپ کی مہر لگی ہے
کون اشکوں میں گنگنا نہ سکیں

ان کی زنجیریں کب کی ٹوٹ گریں
اور وہ دو قدم بھی جا نہ سکیں
کوئی دن کھل کے سانس لینا تھا
چڑیاں بندش میں چہچہاں نہ سکیں
اپنی ہی روشنی سے تنگ ہوئیں
شمعیں جی بھر کے جھلملا نہ سکیں

شہناز نبی عورتوں کے جذبات واحساسات اور دور حاضر کے ان کے مسائل وکوائف پر باریک نظر رکھتی ہیں۔مندرجہ بالا اشعار میں انھوں نے ان چیزوں کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے جو عورتوں کی ذات اور حقوق سے منسلک ہیں۔فلسفیانہ انداز میں انھوں نے اشعار میں کہا ہے کہ آج زمانہ ترقی کر گیا ہے اور دنیا کے ہر خطے میں مساویت کی بات ہو رہی ہے۔ان کی آزادی، ان کی مرضی اور ان کے کھل کے زندگی بسر کرنے پر بڑے بڑے مفکر وں کے مقالات اور تحریریں موجود ہیں لیکن اس سماج میں ان کے حقوق پر بات کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آتی ہے کہ اتنے سارے نعرے اور مقالے لکھنے کے باوجود بھی آج بھی عورتیں کیوں کھل کر جی نہیں پا رہی ہیں؟ اپنے حقوق سے محروم کیوں ہیں؟ جو مفکر و مدبر عورتوں کے حقوق اور آزادی کی بات کرتے ہیں جب حقیقی منظر ان کے سامنے آتا ہے اور عورتوں کے استحصال کے واقعات سامنے آتے ہیں تو وہ کچھ نہیں بولتے ہیں۔ان کے لبوں پہ مہر سی لگ جاتی ہے جس کے بنا پر نسائی جذبات آنسوؤں کے درمیاں کھل کر آواز نہیں دے پاتا ہے۔کہنے کو تو عورتوں پر لگی بندشیں ختم ہوگئیں ہیں اور ان کو کھل کر جینے کا حق ہے۔سماج میں ان کو ہر وہ کام کرنے کی آزادی ہے جو ان کے مرضی کے مطابق ہوں۔اس کے باوجود بھی وہ اپنی مرضی سے وہ نہ کہیں آسکتی ہیں نہ جاسکتی ہیں۔سماج میں ان کا کھل کر جینا، اپنی مرضی کے مطابق کھانا، پینا، پہننا آج بھی مقید ہے۔نئے زمانے کے بنائے گئے قوانین وضوابط جو عورتوں کو ان کے حقوق دلانے کی بات کرتے ہیں آج ان کی ہی آڑ میں عورتوں کا معاشرتی وجنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ترقی دلانے کے نام پر جدید دور میں عورتوں کا استحصال بھی جدید طریقوں سے ہو رہا ہے۔اس لیے شاعرہ نے اپنے اشعار میں طنزیہ انداز اپناتے ہوئے سماج کے اس دوہرے پن کو اجاگر کیا ہے کہ عورت کے متعلق کہنے کو کچھ ہے اور کرنے کو کچھ ہیں۔

کب تک جھمکا کنگن میں
کب تک گھر اور آنگن میں
چوکا، چکی، نل اور کل
کب تک برتن باسن میں
دھندلا دھندلا ہر منظر
آنکھوں پر اک چلمن میں
پھندوں پر پھندے ہیں
گورکھ دھندا، الجھن میں
یادوں کا آسیبی گھر
بھوتوں کا اک مسکن میں

شہناز نبی نے ان غزلیہ اشعار میں عورتوں پر لگائی گئی پابندی اوران کا گھر آنگن تک کے انحصار کوموضوع بنا کر اپنے جذبات کوسلیقے سے پیش کیا ہے۔انھوں نے سماج کے سامنے یہ بات رکھی ہے کہ آخر کب تک عورت صرف ان ہی کام کے لیے مختص رہے گی جس سے اس کی آزادی اور گھر سے باہر آنے جانے والے مسدود رہیں گے۔کب تک عورت گھر اور آنگن کی چہار دیواری کے اندر رہے گی اور کب تک چولہا، چوکا اور برتن مانجھنے اور دھونے کے کام اس کی ذات کے ممیّزات خاص رہیں گے؟۔عورت کے تعلق سے مرد اساس سماج کا یہ گورکھ دھندا کب تک چلے گا ؟۔شاعرہ نے ان اشعار میں عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور لوگوں کو آگاہ کیا ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ عورت کو چاہیے کہ وہ صرف گھر کی زینت بن کے جھمکا کنگن کے ساتھ گھر میں محصور نہ رہیں بلکہ انھیں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنا چاہیے اور اپنا حق خود سے حاصل کرنا چاہیے۔ان اشعار میں شہناز نبی نے نسائی کرب اور اس کے خدوخال کو، مرد اساس معاشرے کے مروجہ اصولوں پر احتجاج اور عورتوں کے کھل کر جینے کی آزادی کوموضوع بنایا ہے۔

ثبات تبسم ہے گلشن سے ظاہر
سوالات کیوں ہیں فقط اک کلی سے
مرے زخم بھرتے کیوں نہیں دوا سے

مرا درد پوچھوں مری اس صدی سے
رکھا پیشِ آئینہ چہروں کو اکثر
ملا کیا مجھے ایسی دیدہ وری سے
جو چاہو کہ چپ چاپ دیکھوں تماشہ
مجھے چھین لینا مری سر کشی سے

زمانۂ قدیم سے لیکر زمانہ جدید تک عورتوں پر جو پابندی مرد اساس سماج نے لگائی ہے جس سے وہ اب تک اپنے حقوق سے محروم ہیں اس کی طرف اشارہ شہناز نبی نے بڑے رمزیت کے ساتھ ان اشعار میں کیا ہے جس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ دور حاضر میں عورتوں کا کیا مقام ہے؟ لوگوں کے درمیان عورتوں کی اہمیت اور وقعت کیا ہے۔ سماج عورتوں کو آج کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے۔ وہ عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے پر لگائے جانے والے سوالیہ نشان جیسے کیوں؟ کہاں؟ کب؟ کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ آج جب کہ زمانہ اتنا ترقی کر چکا ہے لیکن عورتوں کی حالت میں اتنی تبدیلی نہیں آئی جتنے کی وہ حقدار ہیں۔ آج بھی سماج میں ان کا استحصال ہوتا ہے اور وہ گھٹن بھری زندگی جینے کو مجبور ہیں۔ آج کی عورت ہر طرح کی قید سے آزادی چاہتی ہے اب وہ محض ایک تماشائی بن کر نہیں جی سکتی۔ وہ سماج کو یہ باور کراتی ہیں کہ اگر مرد اساس سماج یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنے اوپر ہو رہے ظلم کو چپ چاپ سہتی رہے تو اس کو چاہیے کہ ہمارے اندر سے انسانی رمزیت کو نکال دے اور ہم ایک زندہ نعش کی طرح رہیں پھر یہ سماج جو چاہے کرے۔ اس پوری غزل میں ان کا احتجاجی، انقلابی اور جذباتی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی تانیثی لہجہ ان کا خاصا ہے۔

یوں کب تک ا نگنت حصوں میں مجھکو بٹتے رہنا ہے
رواں ہوں میں کناروں سے کہاں تک لڑنا ہے
وہ اک آواز اپنے پاؤں کی کمرے کو بھر دے گی
ہمیں بے جسم سائے کی طرح بس چلتے رہنا ہے
کبھی اس کرب کی بابت بھی کوئی سوچتا ہوگا
جنھیں شاخوں پہ کھلنے کی سزا میں ہنستے رہنا ہے
کہیں کوئی کسر باقی ہے کیا تکمیل میں اپنی

یہ رب ہی جانے اس خاکی کو کب تک سنتے رہنا ہے

شہناز نبی کے یہاں نسائی شعور کا کرب مؤثر انداز میں موجود ہے۔ان کی شاعری میں پہلو بہ پہلو نسائی ذات کے فکری زاویوں کی شناخت ہے۔جس میں عورت کے متعلق ان کا دکھ درد ہے،ہمنوائی ہے اور جذباتِ شدت ہے۔انھوں نے عورت کے ہر زاویے کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے جو عورت کے متعلق سماج میں پھیلا ہوا ہے۔وہ اشارے میں کہتی ہیں کہ عورتوں کے مقدر میں یہی ہے کہ وہ انگنت نگاہوں کا سامنا کرتی رہیں اور حاشیائی زندگی بنا کسی اہمیت و وقعت کے جیتی رہیں۔وہ سوال کرتی ہیں کہ اپنے ہی گھر میں آخر کب تک عورت بے جسم سائے کی طرح کھوکھلی زندگی جینے کو مجبور رہے گی؟ حالانکہ عورتوں ہی کے ذریعے سماج پھلتا پھولتا ہے لیکن کبھی یہ سماج ان عورتوں کے دکھ کے بارے میں نہیں سوچتا ہے کہ وہ کن کن تکالیف کا سامنا کر کے سماج کے باغ میں پھول کھلاتی ہیں بلکہ وہ تو طرح طرح سے عورت ذات کو زدوکوب کرتا ہے کبھی باتوں سے،کبھی افعال سے تو کبھی استحصال سے یہاں تک کہ ان کے وجود میں بھی کمی نکالتا ہے جبکہ ان کی بھی تخلیق اللہ نے کی ہے۔اس متعلق شہناز نبی نے بڑے ہی نرم اور متاثر کن انداز میں کہتی ہیں کہ کیا عورت کو بنانے میں اللہ نے کوئی کمی رکھی جس کی وجہ سے آج سماج میں لوگ عورت ذات کے وجو پر انگلی اٹھاتے ہیں اور ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔یہ غزلیہ اشعار شہناز نبی کا عورتوں کے متعلق لگاؤ اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے مسائل کا بیان ہے جو مرد سماج میں پایا جاتا ہے جہاں عورت ذات مقہور و مظلوم کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے اور مایوسی و ناامیدی ان کی زندگی کا حصہ ہے۔

پیڑوں کے سہارے آزاد ہوئیں بیلیں
جنگل سے یہ کہہ دینا کہ خود پہ پلیں گے ہم
اب سخت ہوئی جاتی ہے مٹی مرے مولیٰ
دنیا کے نئے سانچے میں کتنا ڈھلیں گے ہم
ہر کوئی دلا جاتا ہے یاد تری آ کر
بچ بچ کے تری دنیا سے کتنا چلیں گے ہم
آزادیٔ زنداں کا مژدہ ہے بہت جھوٹا
اوروں نے چھلا ہم کو خود کو نہ چھلیں گے ہم

شہناز نبی تانیثیت اور تانیثی مسائل کو بڑے ہی بے باکی اور تیز طرار انداز میں اپنی تخلیقات میں پیش کی

ہیں چاہے وہ نظم ہو یا غزل۔اس کی ایک کڑی مذکورہ بالا اشعار بھی ہیں جس میں انھوں نے صاف طور پر سماج کے نمائندگان سے کہہ رہی ہیں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم خود سے اپنی زندگی جیئیں گے۔اپنی مرضی کے مالک ہوں گے۔اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں گے۔یہ سماج جان لے کہ اب ہم کسی کے سہارے کے محتاج نہیں ہیں۔ہم اس لائق ہیں کہ زندگی کے تمام رموز واوقاف کو جان سکیں اور اچھے برے کی تمیز کر سکیں۔اب ہم کسی کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط پہ نہیں چل سکتے۔ہم آزاد ہو کر اپنی زندگی گذاریں گے۔ہم میں اور مردوں میں اللہ نے کوئی تفاوت نہیں بنایا ہے اس لیے سماج کی بنائی گئی اس تفریق کو ہم نہیں مانیں گے۔شہناز نبی کا یہ تانیثی لب ولہجہ جس کے اندر ایک عورت کے ان تمام جذبات کی ترجمانی ہے جس میں عورت سماج میں اپنے حقوق خود سے حاصل کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور سماج مین جینے ،ترقی کرنے اور مستقبل سنوارنے ،اور نیا سماج بنانے میں کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔کہکشاں تبسم شہناز نبی کے بارے میں لکھتی ہیں:۔

> ''شہناز نبی کی غزلیں باشعور نسائی شخصیت کے فکر کی ترجمان ہیں۔'بھیگی رتوں کی کتھا' ان کی غزلوں کا واحد مجموعہ ہے جس میں روزمرہ کی بولی محاوروں کا تخلیقی سطح پر خوب صورت استعمال شاعرہ کے جمالیاتی آہنگ کا مظہر ہے۔تازگیِ فکر و احساس کے ساتھ وہ ہم عصر شعری منظر نامہ میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔''4؎

شہناز نبی ان نام نہاد کے مفکرین ،سیاست داں اور رہنماؤں کی عورت کو آزاد کرنے والی بات کو دھوکہ بتاتی ہیں۔ان کے مطابق ان کی باتیں بس کہنے بھر ہوتی ہیں اور حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔وہ عورتوں کی ایسی آزادی کو جھوٹ قرار دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کے قول اور فعل میں بہت فرق ہوتا ہے۔آزادی کے نام پر آج تک وہ ہم کو چھلتے آئیں ہیں دھوکہ دیتے آئے ہیں اب بہت ہو گیا ہے اب ہم دھوکے میں نہ آ سکتے ہیں اور نہ خود کو اس دھوکے میں رکھیں گے اب اپنے وجود کی لڑائی ہم خود لڑیں گے۔

سمٹے ہوئے پروں کو کسی دن کھول کے
اڑ جاؤں گی فضاؤں کے تیور ٹٹول کے
جی چاہتا ہے اک نئے انداز سے جیوں
ہستی کی تہہ بہ تہہ سبھی پرتوں کو کھول کے

شہناز نبی نے ان اشعار میں زمانے سے جو عورتوں کو جدلوتی نشانے پر رکھا گیا ہے اس کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے صدیوں سے حاشیے پر رکھی گئی عورت کے کرب کو شاعرانہ انداز میں حقیقت پسندی، تاریخی بصارت وجسارت کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بیتے دنوں میں زمانے سے عورتوں کا استحصال ہوتا چلا آ رہا ہے جس پر ان کا شدید ردعمل اور احتجاج دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ سماج کو بدل کر رکھ دینے کی متمنی ہیں۔تانیثیت اور نسائیت کے یہی تمام عناصر ان کی غزلوں کے موضوع ہیں جن کو انھوں نے الگ الگ طریقے سے الگ الگ پیرائے میں ہنر مندی اور توانائی کے ساتھ اپنے مخصوص تیور میں پیش کیا ہے۔

شہناز نبی نے اپنی غزلوں میں سماج و معاشرے میں ہو رہے واقعات وحادثات کو اپنے مشاہدے اور تجربات کے ذریعے اور ان کے اسباب وعلل کے ساتھ پیش کیا ہے چاہے وہ رشتے کی پامالی ہو، تہذیبی زوال ہو، بے چہرگی و بے چینی ہو، تانیثی یا نسائی مسائل ہوں۔اسی طرح انھوں نے ملک کے سیاسی مسائل اور رہنماؤں کے افکار ونظریات اور ان کی ریشہ دوانیوں کو اپنے غزلوں کا موضوع بنایا ہے جس سے ان کی شاعری میں آفاقیت پیدا ہوتی ہے۔اس سلسلے کے کچھ اشعار نمونے کے طور پہ پیش کیے جا رہے ہیں:

تیغِ قاتل کے مٹ گئے دھبے
خون یہ کس کا بے زبان ہوا

بات بے بات سر لیا جائے
شہر گویا کوئی مسان ہوا

ہم نے کس کی ہنسی اڑائی تھی
خندہ زن ہم پہ آسمان ہوا

پھر نہ رعیت مگن نہ راجہ خوش
یوں بھی انجامِ داستان ہوا

شہناز نبی نے سیاسی چالبازیوں اور اس سے ابھرنے والے واقعات وحادثات کو اپنے تجربے اور دید کے مطابق اس سے ہو رہے ظلم وستم، سماج میں پھیلی افراتفری، اثر ورسوخ والوں کا سیاسی طاقت کی وجہ سے مظلوموں پر کر رہے ظلم وجبر کو پیش کیا ہے۔سیاست بد کا ظلم سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔سیاسی رسوخ استعمال کر کے قاتل مبرا ہو جاتا

ہے اور مظلوم ہی کٹ گھرے کے دائرے میں آجاتا ہے۔

شہناز نبی کے ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں جو سیاسی مسائل ہیں وہ حالات حاضرہ میں در پیش مسائل ہیں اس کے ساتھ ہی رمزیت میں تقسیم ہند کا جو المیہ ہے اس کا دکھ درد بھی ہے۔ سیاست کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں جو نفرت پروان چڑھتی ہے اس سے مذہبی فرقہ وارانہ فساد برپا ہوتا ہے۔ قومی یک جہتی کا زوال ہوتا ہے۔ اشعار میں سیاسی طاقت کے بے جا استعال کا ذکر ہے شاعرہ بتاتی ہیں کہ سیاست کے سہارے آج قاتل بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے قتل کے تمام ثبوت مٹا دیے جاتے ہیں تا کہ مجرم کی شناخت نہ ہو سکے۔ سیاسی رہنماؤں اور حاکموں کی وجہ سے کتنے لوگ گھر سے بے گھر ہو جاتے ہیں۔ دکھ اور مصیبتوں کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑتا ہے لیکن اسی میں سیاسی رہنماؤں کا فائدہ ہے کیونکہ سیات تفرقہ ڈالنے کا کام کرتی ہے اور تفرقے سے گروہ بندی پیدا ہوتی ہے جس سے نیتاؤں کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس طرح سیاسی مسائل ان کی غزلوں کے موضوع بنے ہیں۔

یہ کس نے عداوت کی سجائی ہیں چتائیں
کیوں بستی ابھی سے مری شمشان بنی ہے
تج دو یہ ذکاوت، کہیں پھینک آؤ تدبر
پہلے جو سیاست تھی وہ ہیجان بنی ہے

یہ کیسی آگ ہے جو چناروں کو کھا گئی
ان جنتوں میں اڑتی ہوئی کیس دھول ہے

شہناز نبی نے سیاست سے پیدا ہونے فسادات، جور و جبر کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے جس سے ان کے غزلیہ اشعار میں سیاست کے وہ تمام افعال و اعمال قارئین کے سامنے آتے ہیں جس کی آڑ لیکر سیاسی رہنما اپنا کھیل کھیلتے ہیں اور اس کھیل سے انسانی زندگی تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ کشمیر سے لیکر ملک کے تمام حصے میں نفرت کا جو بیج سیاست نے ڈالا ہے اس قومی یک جہتی کو خطرہ لاحق ہے۔ اس نفرت کے تحت لوگوں کے گھر جلا دیے جاتے ہیں بستیاں اجاڑ دی جاتی ہیں اور اجاڑنے والوں کے خلاف کوئی آواز بھی نہیں اٹھاتا ہے کیونکہ سزا اور انصاف دینے والے بھی اکثر اس میں شامل ہوتے ہیں۔

تیسرے شعر میں شہناز نبی نے کشمیر کے منظر نامے کو چبھتے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے اور سیاست کے کالے کرتوتوں کو شعر کے ذریعے عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ آج کشمیر کا جو حال ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ کشمیر جہاں قدرت کی بہترین اور حسین عطیات موجود ہیں جسے جنت سے ملقب کیا جاتا ہے۔ قدرت نے تو اسے بہت ہی حسین بنایا ہے لیکن سیاست نے وہاں ایسی آگ لگائی ہے جس نے وہاں کے خوبصورت مناظر کو دھواں دھواں کر دیا ہے۔ آئے دن خون خرابے کے واقعات وہاں رونما ہوتے ہیں۔ ماؤں کی کوکھ اجڑ جاتی ہیں۔ عورتیں بیوا ہو جاتی ہیں۔ جس طرح کی خون ریزی اس خطے میں ہوتی ہے ویسی شاید ملک کے کسی دوسرے حصے میں ہو اور اس کے ذمے دار کہیں نہ کہیں سیاست ہی ہے۔ سیاست کی کچھ ایسی کارفرمائیاں ہوتی ہیں کہ بستیاں کی بستیاں شمشان بنتی جا رہی ہیں۔ چتائیں سجتی جاتی ہیں لیکن سیاسی لوگوں کو اس کا کوئی دکھ نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ سب تو ان کے لیے سیاست کا ایک جز ہوتا ہے وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ اسی طرح خون ریزی ہوتی رہے جس کی آڑ میں وہ اپنی گھناؤنی چال چلتے رہیں۔ آج کی سیاست کی اسی بدحالی و بدکاری اور بے حسی کو شہناز نبی نے جگہ جگہ موضوعِ غزل بنایا ہے۔

ہر طرف مری کراہیں سسکیاں
گنبدِ بے درد صدائیں سسکیاں
دور تک کرتی رہیں پیچھا میرا
ڈبڈبائی سی نگاہیں سسکیاں
بیچ میں تھے سرحدوں کے سلسلے
دونوں جانب تھیں دعائیں سسکیاں
ایک منظر دیدۂ بے خواب میں
آگ ،خون، ملبے،کراہیں،سسکیاں
کیسا ماتم ہے زمیں تا آسماں
اشک آلود فضائیں سسکیاں

سیاست کے پیٹ سے جنم لینے والے الم ناک و کربناک تقسیم ہند کے المیے کو بھی شہناز نبی نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ اسی ضمن کے یہ اشعار ہیں جس کے اندر انھوں نے تقسیم ہند سے جو خونی داستاں رونما ہوئیں لوگوں

میں خوف وہراس، مجبوریاں اور سسکیاں جنم لیں اس روداد کوانھوں نے ان اشعار میں پیش کیا ہے۔

شہناز نبی کی غزلوں کا پیمانہ وسیع ہے۔ یہ سماج کے تمام لوازمات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ان کی غزلوں میں ماضی، حال اور مستقبل کی وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو انسانی زندگی سے منسلک ہیں۔اگر انھوں نے دور حاضر میں سماج میں پھیلی ہوئی اچھائی برائی، نئی تہذیب کے نفع ونقصان کواپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے تو وہیں انھوں نے ماضی کی قدروں کی اور ہماری پرانی تہذیب کو بھی اپنی غزلوں کا حصہ بنایا ہے۔ یہ بات محقق ہے کہ مابعد جدید شاعروں نے جہاں لامرکزیت اور مہا بیانیہ کی تردید کی ہے اپنے ذہن کو نظریاتی سطح سے اٹھا کر بلند کیا ہے اور لا مرکزیت کے تحت ہر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان سب نے ایک بات کی پاسداری کی ہے کہ انھوں نے ماضی کی تہذیب کو اور اپنے اسلاف کی قدروں کو بھلایا نہیں ہے۔ان تمام اثاثوں کا ذکر ان کی تخلیقات میں موجود ہیں جو ہماری تہذیب کی علامت ہوا کرتی تھیں۔گاؤں دیہات کے تذکرے ،وہاں کا رہن سہن ،وہاں کا ماحول، زرعی زندگی ان تمام چیزوں کا ذکر آج کے فنکاروں میں ملتا ہے۔شہناز نبی کی غزلوں میں بھی یہ تمام چیزیں موجود ہیں۔ وہ ماضی کے اقدار کی پاسداری کرتی ہیں۔ مابعد جدیدیت ان کے یہاں موجود ہے۔مہا بیانیہ کی تردید ہے۔ان کی غزلوں میں ماضی کی تہذیب کی پاسداری اور حاشیائی چیزوں کا ذکر ہے۔ ماضی کی تہذیب کی یاد میں انھوں نے اپنی غزلوں میں گاؤں دیہات کے تذکرے کیے ہیں۔وہاں کی زرعی زندگی کے حالات کا محاسبہ کیا ہے۔ وہاں کی فصلوں کے مناضر کا ذکر کیا ہے۔گھر، آنگن اور صحن کا بیان ملتا ہے۔ نانی، اماں کی کہانیوں کا تذکرہ بھی ہے۔ کچھ ایسے اشعار جن کے اندر ماضی کی یادیں ہیں اور تہذیب کا بیان ہیں نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں:

پل کے نیچے والی بستی سے دل جڑا سا رہتا تھا
نانی کے آنگن میں ماں کا چہرہ کھلا سا رہتا تھا
کنوئیں کنارے بیٹھ کے بہنیں برتن مانجھا کرتی تھیں
اونچی نیچی آوازوں کا شور مچا سا رہتا تھا
پیڑ کے نیچے کھٹیا ڈال کے رات کو ہم سو جاتے تھے
املی کے پتوں میں نٹ کھٹ چاند چھپا سا رہتا تھا
ساون کی بوندوں میں سارے پیڑ ہرے ہو جاتے تھے

آنگن سوندھی مٹّی کی خوشبو میں رچا سا رہتا تھا
اب اس کی دیواریں اپنی عمر سی پختہ ہیں
جن پر کدو کی بیلوں کا جال بچھا سا رہتا تھا

اس غزل سے شہناز نبی کی تخلیقی توانائی اور ان کی ماضی کی یادیں اور تہذیب سے لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔انھوں نے ان چیزوں کا ذکر اپنی غزلوں میں کیا ہے جو شاید آج نئی تہذیب سے غائب ہے جیسے برتن مانجھنے کا عمل جو کنوئیں کے کنارے پر ہوا کرتا تھا آج کنواں بھی غائب ہے اور یہ عمل بھی۔ یہ ہماری تہذیب کا حصہ تھا جہاں پیار کی خوشبو اور محبت کی چاہ تھی۔ایسی بستیاں آباد ہوا کرتی تھیں جہاں پر کھلا کھلا آسمان ہوتا تھا اور آسمان کے نیچے موسم کے سارے مناظر کے اثرات سے لوگ محظوظ ہوتے تھے۔ساون کی بوچھاروں سے نہ صرف پیڑ پودے ہرے ہوتے تھے بلکہ انسان بھی خوش ہو جاتے تھے ان کی خوشیاں دوگنی ہو جاتی تھیں۔نانی اماں بچوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ چھپر کی چھت پر کدو اور لوکی کے جال بچھے رہتے تھے۔ کچی سڑکوں پر بچے طرح طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔راتوں کو پیڑ کے نیچے کھاٹ بچھا کر لوگ چاند کی آنکھ مچولی سے خوش ہوتے تھے اور پرسکون نیند میں کھو جاتے تھے۔ماضی کی یہ تمام باتیں اب یاد بن کر رہ گئی ہیں۔نئی نسل ان ان مناظر کو دیکھنے سے محروم ہے لیکن ہمارے ادباء اور شعرا نے اس کو سنجو کر اپنی یاد میں رکھا ہے اور صفحۂ قرطاس پر لایا ہے ان ہی میں سے ایک شہناز نبی بھی ہیں۔ان ادیبوں کی بدولت آنے والی نسل یہ جان سکے گی کہ ہمارے ماضی میں کیا تھا، کیسے مناظر تھے،لوگوں کا رہن سہن کیسا تھا۔یہ ایک اہم کام ہے جس کو ہمارے فنکاروں نے اپنے سر لے رکھا ہے۔

جانے چوپال سجے ،کب نرم الاؤ روشن ہو
برگد کے اس پیڑ کے نیچے قصہ کوئی سناتے جاؤ

یہ چند نوحے نئی نسل کو رقم کر دیں
ہمارے عہد میں پریوں کی داستان کہاں

شہناز نبی نے ماضی کے مناظر و محبت بھری تہذیب کا بیان بڑے رچ رچاؤ کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسے اشعار لکھے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ماضی کی تہذیب انھیں بہت

ستاتی ہیں جن سے ان کا دلی لگاؤ ہے۔اس کے خاتمے پر انھوں نے مایوسی کا اظہار کیا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ کاش وہی تہذیب آج بھی ہوتی جس میں محبت تھی۔حرص وہوس کا سایہ نہ تھا۔سب لوگ ایک جسم کی طرح تھے کسی ایک کو دکھ ہوتا تھا تو دوسرا سے محسوس کرتا تھا۔

داستانیں اگلے وقتوں کی سنائے کون اب
قصہ بنتے لوگ مٹی کی تہوں میں اب سو گئے
گاؤں کی پگڈنڈیوں نے پاؤں تھامے تھے بہت
شہر کی پتھر زمیں کو جانے والے تو گئے
ڈوبتے سورج کی آنکھیں کرب سے پتھرا گئیں
لوٹنے والے پرندے وسعتوں میں کھو گئے

شہناز نبی کے یہاں پرانی یادوں کی اہمیت اور قدر ومنزلت دیکھنے کو ملتی ہے۔دیہی زندگی سے واقفیت ان کی تخلیق کو بہتر بناتی ہے۔انھوں نے گاؤں سے ماخوذ تمام چیزوں کو اپنی یادوں میں بسایا ہے اور اس کے فقدان پہ وہ مایوس ہیں۔دور حاضر کی مشینی زندگی اور انسان کا ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے مقابلہ جاتی حیات سے وہ خوش نہیں ہیں۔یہ آثار ان کی غزلوں میں صاف دیکھائی دیتا ہے۔پرانی تہذیب اور ہمارے بزرگوں کی یاد میں انھوں نے اشعار کہے ہیں۔وہ بزرگ جو اس دنیا سے چلے گئے اور اپنے ساتھ اس تہذیب کو بھی لے گئے جو الفت و محبت کا گہوارہ تھی جس تہذیب میں لوگ جن پریوں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے آج بس ان کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔نئی تہذیب میں وہ تمام چیزیں فنا ہوگئیں ہیں۔گاؤں اور دیہات کے لوگوں نے محبت وانکساری کے جو پودے لگائے تھے شہر نے اسے اکھاڑ پھینکا ہے۔اس طرح ماضی اور حال کا تہذیبی تصادم اور شاعرہ کی ذہنی کش مکش جو پرانی تہذیب کے فقدان اور نئی تہذیب کے آمد پر ہے ان کی غزلوں میں ملتے ہیں۔

وہ جس کی حسرتیں ہر بار چھو لیتی ہیں بادل کو
میں اس کی انگلیوں میں اک غبارہ دیکھنا چاہوں
میرے گھر سے میرا آنگن چرا کر لے گیا کوئی
میں وہ مٹی کا چولہا اور اسارا دیکھنا چاہوں
میرے بچپن کو مجھ سے چھیننے والوں بتادوں میں

میں اپنی زندگی کا ہر شمارہ دیکھنا چاہوں

شہناز نبی نے پرانی تہذیب کے رسم ورواج کے ساتھ اس تہذیب میں جو محبت اور رشتوں کی پاسداری تھی اس کا بیان حسرت کے ساتھ کرتی ہیں جس میں بڑوں کا پیار اور چھوٹوں سے شفقت کا ذکر ملتا ہے۔ ہندوستان اور دیہی عناصر کی بودوباس ملتی ہے۔ انھوں نے ان اشعار میں ماضی کی تہذیب کی منظر کشی اس طرح سے کی ہے کہ بڑے لوگو بچوں کی لیکر میلے ٹھیلے میں لیکر جایا کرتے تھے ان کی انگلیاں پکڑ کر سارا مناظر دکھاتے تھے طرح طرح کی چیزیں خریدتے تھے اور غبارے کی ڈوری کو ان کی انگلی میں باندھ دیا کرتے تھے۔ اس کی آرزو آج کے بچے بھی کرتے ہیں لیکن آج کے اس مشینی دور میں والدین کو اتنی فرصت ہی نہیں مل پاتی ہے۔ آج کی بلڈنگوں اور فلیٹوں نے گھر سے آنگن چھین لیا ہے۔ نئی نسل نے نہ مٹی کو چولہا دیکھا ہے اور نہ اسارا۔ شاعرہ نے ان چیزوں کو بڑے مؤثر انداز میں اپنی غزلوں کا حصہ بنایا ہے۔

شہناز نبی نے زمانے کی تبدیلیاں اور اس کی روداد کو، ماضی کی تہذیبی اقدار، نئی تہذیب کی آہٹ اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کو، نسائی اور تانیثی مسائل کو قرینے اور سلیقے سے اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے عشق کے رموز پر بھی غزلیں کہی ہیں جن میں عاشق ومعشوق کے ہجر و وصال کی باتیں ہیں۔ جذبات کے خوش آگیں اور دل سوزی کا بیان ہے جس طرح ان کی غزلوں میں حیات کے تمام لوازمات موجود ہیں اسی طرح عشق بھی اپنے سبھی شکلوں کے ساتھ موجود ہے اور عشقیہ شاعری بھی ان کی غزلوں کا ایک حصہ ہے۔ ایسے اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں جس کے اندر عشق کی لطافت اور نزاکت موجود ہے۔

بھیڑ میں کس قدر تنہا لگا
اجنبی تھا پھر بھی وہ اپنا لگا
آہٹیں میرے لیے کب تھیں مگر
خاموشی کا ٹوٹنا اچھا لگا
لاتعلق سا ہے وہ کچھ ان دنوں
خود میں جینا مجھکو بھی اچھا لگا

شہناز نبی نے ان اشعار میں محبوب کے ایسے وصف کے بارے میں بتایا ہے کہ محبوب بھیڑ میں سب سے لا

تعلق تھا وہ اپنی چاہت کی تلاش میں تھا جس کی وجہ سے وہ اجنبی نہیں لگ رہا تھا وہ اس کو اپنا مانتی ہیں جو ظاہری طور پر تو تنہا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کی چاہت بھی موجود تھی۔ اس طرح انھوں نے محبت میں وصال کے بعد ہجر کے آثار کو غزل کا حصہ بنایا ہے۔ اس طرح کے اشعار شہناز نبی کے عشقیہ جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں عشق کی کش مکش ہے، ہجر و وصال کی باتیں ہیں، جدائی کا غم ہے، محبت میں سب کچھ ہارنے کا بیان ہے، عاشق کی بے رخی ہے، یک طرفہ پیار ہے غرض کہ عشق کے تمام رموز ان کی غزلوں میں موجود ہیں۔

پچھلی رت کے ساتھی مرے اب جو واپس آنا تم
دھوپ بھرے آنگن میں پھر سے اک شیشہ چمکانا تم
کب سے اس خاموش فضا کا بوجھ ہے میری پلکوں پر
بانجھ مناظر میں چاہت کا رنگ نیا بھر جانا تم
ساون بھادوں جیسے موسم کتنے آئے اور بیت گئے
میرے امرت ساگر اب کے مجھکو نہ ترسانا تم

شہناز نبی کے اس غزل میں ان کی عشق و محبت کی کیفیات موجود ہیں۔ جس میں محبوب کے بچھڑنے پھر اس کے آنے کی آس و امید ہے اور اس امید میں خوش ہونے کا گمان بھی جس میں پر مسرت کیفیت اور لطافت موجود ہے۔ ساون بھادوں کے موسم میں محبوب کی یادیں ہر ایک کو ستاتی ہے اور اس سے ملنے کی خواہش بھی جاگتی ہے۔ یہاں وہ محبوب سے اس طرح سے ملنا چاہتی ہیں کہ یہ ملن امرت جیسا ہو۔ اس طرح سے محبوب سے چاہت کی دوامیت ان کی غزلوں کا موضوع ہے۔ عشق کے بیان میں بھی انھوں نے الگ الگ پیرائے کو بروئے کار لایا ہے جو عشق میں رونما ہوتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں کہیں ایسی چاہت کہ محبوب ہمیشہ معشوق سے ملا رہے اسے اس کی جدائی کبھی میسر نہ ہو تو کہیں ہجر کی شدت اتنی ہے کہ غم اپنا وصف چھوڑ معشوق کے جینے کا سہارا بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان کی غزلوں میں عشق و محبت کی ایسی تمازت ہے جس میں جذبات کی لطافت موجود ہے۔ محبوب کی عزت، معشوق کی آبرو، تنہائی کی خلش، یاس و امید کے زیر و بم، یقین و گماں کے پیچ و خم سبھی کچھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

آہٹیں آج بھی بھٹکتی ہیں
کیا پتہ کس گلی میں رکا ہوگا
جانے کس کس نے میرا نام لیا

جانے کس کس سے وہ بچا ہوگا
وہ خلش جس نے مجھے مار رکھا
وہ بھی کیا اس میں مبتلا ہوگا
ڈال کر اپنی آنکھوں میں آنکھیں
کیا کبھی وہ خود سے ملا ہوگا

شہناز نبی نے جہاں سماج کے تمام رموز اور واقعات کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے تو وہیں ان کی غزلوں میں حقیقت طرازی اور فلسفیت موجود ہے۔انھوں نے جہاں سماج کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے اور اس کا ذکر اپنی غزلوں میں کیا ہے وہیں اپنے مفکرانہ صلاحیت کا اظہار بھی کیا ہے۔انھوں نے زندگی کے حقائق اور انسانی فلسفۂ وجود کو نہایت آسانی کے ساتھ شعر میں لکھا ہے کہ وہ زندگی کے رموز اور حقائق سے پوری طرح بہرہ ور معلوم ہوتی ہیں۔انھوں نے زندگی کا فلسفہ اس درج ذیل شعر میں کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے

زندگی سانسوں کا ایک الجھاؤ ہے
دل کی دھڑکن پر ٹکا ایک مرحلہ

شہناز نبی بتاتی ہیں کہ انسان کی سانسیں ہی اس کی زندگی ہے۔انسان اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کے دل کی دھڑکن جاری وساری ہیں اور زندگی کا یہ امر مسلم ہے کہ انسان کی دھڑکن جب بند ہوتی ہے تو وہ مر جاتا ہے۔ایک اور شعر ملاحظہ ہوں جس میں انھوں نے زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے۔

گراتا ہے شاخوں سے وہ ہر روز پتے
میری حد جہاں میں بتانے کی خاطر

اس شعر میں زندگی کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی حیثیت بتانے کا فلسفہ موجود ہے کہ اس دار فانی میں کسی بھی انسان کو دائمیت نصیب نہیں ہے۔یہ حقیقت پر مبنی فلسفہ ہے جس کو شہناز نبی نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے کہ ہر جاندار کو موت کے آغوش میں ایک دن جانا ہے اور آئے دن انسان اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا بھی ہے۔

حیاتِ مستعارِ خیرہ سے رنجشیں کیسی
کہ یہ تعدادِ صبح وشام تو گھٹنے نہیں والی

درج بالا شعر میں انسانی زندگی کے اس فلسفے کو پیش کیا گیا ہے کہ زندگی ایک مستعار وعارضی چیز ہے۔اس

زندگی میں جو تکالیف آتی ہیں اور جو دکھ و غم ملتے ہیں وہ سب اس کا حصہ ہے۔ زندگی میں چاہے کتنا بھی دکھ و مصیبت آ جائے یہ صبح و شام ختم نہیں ہونے والی نہیں پھر اس سے شکایات کیسی؟ موت ہو، سانحہ ہو، انسان کی زندگی میں کچھ بھی واقعہ ہو جائے انسانی زندگی کا پہیہ صبح و شام چلتا رہتا ہے کیونکہ یہی نظام کائنات ہے۔

شہناز نبی نے جہاں زندگی اور زندگی کے مسائل کے فلسفے سے اپنی غزلوں کو سجایا ہے وہیں پر انھوں نے عشق کے فلسفے سے بھی لوگوں کو روشناش کرانے کی کوشش کی ہے۔

منزل کے آس پاس بھی منزل نہ مل سکے
اس راہ عشق کا یہی تو اصول ہے

اس شعر میں عشق کے اس فلسفے کا ذکر ملتا ہے کہ عشق میں کوئی بھی مکمل طور پر اپنی منزل کو نہیں پاتا ہے اس میں کسک باقی رہتی ہے اور یہی عشق کا امتیاز بھی ہے۔ عشق میں انسان کو ایسا لگتا ہے کہ اب اس نے اپنی منزل کو مکمل طور پر پالیا ہے لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی نے اپنی غزلوں کے موضوعات میں سیاسی و سماجی مسائل اور اس کے محرکات، حالات حاضرہ کی روداد، نئی و پرانی تہذیب کے اقدار و بحران، تانیثی و نسائی مسائل، عشقیہ بیان اور فلسفۂ حیات، ان تمام عناصر کو بڑے ہی چابکدستی اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے ہمیں شہناز نبی کے فکر کی گہرائی و گیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ سماج اور دنیا و مافیہا کی تمام چیزوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کے بنا پر انسانی زندگی کے تمام رموز کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ موضوعاتی سطح پر ان کی غزلوں میں وسعت و فراوانی ہے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ محمود ملک صاحب شہناز نبی کی شاعرانہ وصف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''شہناز نبی کو خدا نے غیر معمولی فنکارانہ بصیرت عطا کی ہے۔ وہ ایک حساس اور باخبر خاتون ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ دوسرے کے غم میں اور خوشیوں میں تو برابر شریک ہوتی ہیں مگر اپنے غم میں کسی کو شریک نہیں کرتیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندرون میں دو ہمزاد بستے ہیں ایک تو ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جبکہ دوسرا سماج کے دبے کچلے طبقے پر ہمدردی، اپنائیت اور

محبت کے پھول برساتا ہے۔اسی لیے ان کے اشعار پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے
کہ وہ غمِ جاناں کا ذکر کر رہی ہیں مگر ذرا ٹھہر کر تھم کر غور کیجیے تو اس میں ہمارے
معاشرے کے عام انسان بالخصوص عورتوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔''5؎

فنی جائزہ:

غزل کے لیے موضوع کا اہم ہونا جتنا ضروری ہے اتنا ہی غزل کہنے والے کا اس کے فن میں مہارت رکھنا ضروری ہے۔شہناز نبی نے مختلف النوع موضوع پر غزلیں کہی ہیں۔ان کے غزلیں ذات سے لے کر کائینات تک کی روداد ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں ان موضوعات کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے فنی لوازمات کو برتا ہے۔ان کی غزلوں میں فن کی خوبیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔شعری اصطلاحات جس کی اوٹ میں اشعار کے مطالب ومفاہیم بیان کیے جاتے ہیں ان کے یہاں خوبصورتی کے ساتھ موجود ہیں۔انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسی تراکیب اور قافیہ پیمائی کی ہے جس میں جدت اور دلکشی ہے۔ان کے لطیف اشعار اور ان کی کیفیات قلبی سکون عطا کرتے ہیں جس میں خیال آفرینی اور معنی آفرینی ہے۔ جدت طرازی،تخیل پردازی،طرز ادا، تشبیہات،استعارات،محاکات ہر ایک پہلو کو اچھوتے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کے کلام میں اشارات وکنایات کا استعمال بھی عمدگی کے ساتھ ملتا ہے جس سے اشعار نفس میں خوبصورتی پیدا ہوئی ہے۔فصاحت و بلاغت ان کی غزلیہ شاعری میں رواں ہے۔سادے اور پر کشش الفاظ ان کی غزلوں میں پنہا ہیں۔پیکر تراشی اور منظر کشی بھی ان کی غزلوں میں پائی جاتی ہے جس سے قاری کے سامنے واقعہ یا حادثہ شکل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے ان کے کلام کا اثر دیرپا رہتا ہے۔ ہر شاعر اپنے کلام کو خوبصورت بنانے کے لیے اور فن کو برتنے کے لیے علم بیان اور علم بدیع کا استعمال کرتا ہے۔ یہ شاعری کی بنیاد ہے۔

علم بیان:

علم بیان وہ علم ہے جس کے تحت کسی معنی کو ادا کرنے کے لیے الگ انداز اپنائے جاتے ہیں۔ یہ علم یہ سکھاتا ہے کہ کسی بات کو کس طرح سے مختلف انداز میں بیان کیا جائے کہ ایک معنی دوسرے سے زیادہ واضح اور دلکش ہو۔علم بیان اظہار کے ان طریقوں کو ظاہر کرتا ہے جس کے ذریعے کسی واقعے،خیال،کیفیت کی تصویر کھینچی جاتی ہے اور الگ

الگ پیرایے میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے جس سے ترسیل کا مقصد قائم رہتا ہے۔اس علم کے ذریعے اشعار میں رنگینی، شگفتگی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔علم بیان میں کئی اجزا شامل ہوتے ہیں ان میں جو خصوصیت کے ساتھ شاعری میں قابل ذکر ہیں اس میں تشبیہ، استعارہ، مجاز، کنایہ وغیرہ ہیں۔

شہناز نبی کی غزلوں میں علم بیان کے تقریباً سبھی اجزا کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے جس سے ان کی غزلوں میں شگفتگی اور دلکشی پیدا ہوئی ہے ۔ان صنعتوں میں تشبیہ، استعارہ، علامت ،مجاز ،کنایہ وغیرہ زیادہ تر ان کے وہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

تشبیہ:

تشبیہ کے معنی ہے''باہمی مشابہت'' جب کسی مشابہت کے باعث ایک چیز کو کسی دوسرے سے مشابہ قرار دیا جائے تو اس تشبیہ کہتے ہیں۔ یہ صنعت اکثر شعراء کے کلام میں ملتی ہے جس میں شعراء ایک چیز کو دوسری چیز کے مثل قرار دیتے ہیں۔تشبیہات کلام میں تازگی اور رونق پیدا کرتی ہے ۔اس کے ذریعے سے شعراء اپنے کلام میں بڑی سے بڑی چیز کو اس کی کیفیت، ہیئت اور صفت سے کسی بھی چھوٹی چیز کی وقعت کو بڑھا دیتے ہیں جس سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

شہناز نبی کے یہاں تشبیہات کا استعمال کم ملتا ہے کیونکہ انھوں نے زیادہ تر اپنی شاعری میں زندگی کے رموز اوقاف کو علامات، استعارات اور تلمیحات کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر لایا ہے۔ان کی شاعری کے تصوراتی اور خیالاتی عناصر انسانی زندگی سے جڑے ہوتے ہیں۔ ماورائی چیز ان کے یہاں نہیں ہے اس وجہ سے تشبیہات کم ملتی ہیں۔ان کے یہاں جو تشبیہات ملتی ہیں ان میں 'خواب' کی تشبیہ 'صحرا' سے، 'زندگی' کی تشبیہ 'اجڑے بیاباں' وغیرہ سے ہے۔ یہ اس طرح کی تشبیہات ہیں جو کسی نہ کسی زاویے سے زندگی سے منسلک ہوتے ہیں ۔کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

جگنو سا ایک خواب اگر پلکوں میں الجھا ہوگا
سناٹوں کے دشت میں کوئی یوں نہ بھٹکا ہوتا

اس شعر میں شہناز نبی نے 'خواب' کو 'جگنو' سے تشبیہ دی ہیں۔خواب میں جگنو کے اس وصف کو بیان کیا ہے جس میں جگنو روشنی پیدا کرتا ہے اور اس کے اجالے سے اردگرد جو چمک ہوتی ہے وہ تھوڑی ہی ہوتی ہے لیکن بڑی

دلکش اور دل آویز ہوتی ہے۔شاعرہ کی منشاء خواب کی تشبیہ جگنو سے دینے کی وجہ یہ ہے کہ خواب کی بھی چمک دمق جگنو کی طرح مسرت بخش ہو۔اس طرح کی تشبیہات جس کا تعلق زندگی کے کسی گوشے سے ہوتا ہے شہناز نبی کے یہاں کہیں نہ کہیں مل جاتی ہیں۔

گہرا ،گھنا ،اداس سا جنگل ہے میرا دل
جس میں تمہارے دھیان کا دریا رواں رہا
میری مدافعت میں فقط میرے لب کھلے
اندر کا خوف ہی تو میرا ہم زباں رہا

اس شعر میں دل کو گہرا، گھنا، اور اداس جنگل سے تعبیر کیا گیا ہے۔دل کی تشبیہ گہرے، گھنے جنگل سے شاعرہ نے اس لیے دیا ہے کہ آج کے سماج میں انسان کی کیفیت ہے کہ اس کے دل میں بہت سارے واقعات وحادثات گھر کر چکے ہیں۔ دل کے اندر افرا تفری ہے لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی جس طرح جنگل نباتات وجمادات سے گھرا ہوتا ہے اسی طرح دل بھی زندگی کے مصائب وعلائم سے گھرا ویران واداس سا ہے۔کوئی چہل پہل اور خوشی نہیں لیکن دل خالی بھی نہیں ہے۔دل جنگل کی طرح بھرا ہوا ہے پر گھنے پیڑ پودوں کی طرح گھنیری مصیبتوں سے۔اس طرح کی تشبیہ شہناز نبی کا منفرد وصف بیان کرتی ہے۔اکثر شعراء کے یہاں جب تشبیہ دی جاتی ہے تو اس میں پھول، چاند، کلی وغیرہ کا ستعمال ملتا ہے ان تشبیہات سے خوشی، چاہت، محبت، نرم وتازگی عیاں ہوتی ہیں لیکن شہناز نبی نے دل کی تشبیہ جنگل سے دی ہے جس کے اندر زندگی کی اس حقیقت کو دکھایا گیا ہے کہ آج اس افرا تفری اور گلوبلائیزیشن کے دور میں انسان اجتماعیت کی زندگی گذارنے کے باوجود بھی اداس وتنہا سا رہتا ہے۔

پھولوں کی طرح کھل کے ہنسوں پل میں بکھر جاؤں
خوشبو سی کسی یاد کے آنگن میں ٹھہر جاؤں

اس شعر میں ’ہنسنے‘ کی تشبیہ ’پھولوں‘ سے دی گئی ہے۔شاعرہ نے اس تشبیہ کو اس طرح سے شعر میں پیش کیا ہے کہ زندگی میں ہنسنا اس طرح سے ہے کہ اس میں پائیداری نہیں ہے جس طرح پھول چند ساعتوں کے لیے کھلتے ہیں پھر مرجھا جاتے ہیں اسی طرح ہماری زندگی میں خوشیاں پل بھر کے لیے آتی ہیں پھر چلی جاتی ہیں۔اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ’یاد‘ کی تشبیہ ’خوشبو‘ سے دی ہے اس مصرعے میں ایک طرح سے انھوں نے نصیحت کی ہے کہ

انسان اپنے اخلاق واطوار کو ایسا بنائے کہ وہ انسانوں کے درمیان خوشبو کی طرح رہے اور اس کے وجود سے دوسروں کو خوشی حاصل ہو۔

رگوں میں دوڑتا پھرتا وہ سورجوں سا اگر
یہ برف برف سی وادی پگھل پگھل جاتی

اس شعر کے پہلے مصرعے میں ایک انجان کی چاہت کی چاہ کو اس طرح سے بیان کیا ہے گیا ہے کہ اگر وہ میری زندگی کے خدوخال میں خوشی کے شرارے جلاتا تو مری زندگی جو ٹھہری ہوئی ہے مایوسی کے سبب برف جیسی جمود کا شکار ہے تو وہ پگھل جاتی اور زندگی کے تمام شعبۂ جات میں اس کا گذر ہوتا۔ شعر کے پہلے مصرعے میں 'محبوب' کو 'سورج' سے تشبیہ دی گئی ہے تو دوسرے میں زندگی کی 'جمودیت' کو 'برف' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سورج کی خاصیت ہوتی ہے روشنی وحدت پیدا کرنا، دوسرے معنی میں سورج رات کے پھیلے اندھیروں کے سکوت کو توڑتا ہے اور چہل پہل پیدا کرتا ہے۔ سورج کے اسی وصف کو دیکھتے ہوئے شہناز نبی نے محبوب کو اس سے تشبیہ دی ہے کہ اگر وہ سورج کی طرح بن جائے تو ان کی برف جیسی ٹھہری ہوئی زندگی رواں ہو جائے۔ یہ شہناز نبی کی کچھ انوکھی تشبیہ ہے کیونکہ اس میں مستعمل لفظ (سورجوں) غیر مانوس ہے وہ اس لیے کہ یہ حتمی امر ہے کہ سورج واحد ہے اور انھوں نے شعر میں سورج جمع مستعمل کیا ہے یہ شاعرہ کا اپنا ذاتی خیال اور تصور ہو سکتا ہے۔ انھوں نے سورج کی حرارت کو خیال میں رکھ کر تشبیہ دی ہو اور سورج کی تشبیہ انسانی زندگی کے افراد سے دی ہو اور افراد جمع ہوتے ہیں شاید اسی وجہ سے انھوں نے افرادوں کو سورجوں کہا ہو۔

استعارہ:

علم بیان کی ایک اہم صنعت 'استعارہ' ہوتی ہے۔ استعارہ کے لغوی معنی ہے 'مستعار لینا۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے لفظ "Metaphor" استعمال کیا جاتا ہے جو یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی 'آگے بڑھ جانا' ہے۔ استعارے میں جس کسی کو تشبیہ دی جاتی ہے تو اس میں کیفیت اور صفت وجز کو نہ کہہ کر من وعن وہی نام دے دیا جاتا ہے جس کو شاعر پیش کرنا چاہتا ہے۔

شہناز نبی نے اس صنعت کے ذریعے زندگی کے احوال وافعال کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کی اکثر غزلوں میں یہ صفت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں جس کو شہناز نبی نے اپنی غزلوں میں برتا

ہے۔

ہر دن نئے سورج نے ہمیں قہر سے تانکا
برسوں پہ گذر جائے ذرا رات ہنسی میں

متذکرہ شعر میں سورج ایک ایسی تہذیب کا استعارہ ہے جس کے اندر رشتے کی پامالی ہے۔ایثار و بھائی چارگی کا قمع ہے۔استحصال ہے۔اس کو انھوں نے سورج کہہ دیا ہے جس کی تپش سے آج انسان حیران و ششدر ہے۔اس طرح کے استعارے شہناز نبی نے اپنی غزلوں میں اچھوتے اور نرالے انداز میں پیش کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شہناز نبی نے زندگی کے ہر موڑ کو اچھے سے جانا اور پہچانا ہے جو انسانی زندگی میں درپیش ہوتے ہیں۔اس کے لیے انھوں نے استعارے کا ان استعمال کیا ہے جو اس کے عین مطابق ہوں اور اشعار کو سمجھنے میں کار آمد ثابت ہوں۔

آندھیاں آتی ہی رہتی ہیں تواتر سے مگر
ایک شجر ان کے مقابل میں اکھڑتا ہی رہے

شعر کے اندر 'شجر' بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔یہ ایک ایسے فرد کا استعارہ ہے جو عصر حاضر کی برائیوں سے تن تنہا لڑ رہا ہے اور اکھڑتا یا ڈگمگاتا بھی نہیں ہے۔اس زمانے میں ظلم وستم استمرار کے ساتھ موجود ہیں لیکن آج بھی ایسا شخص موجود ہیں جو شکست کھاتے ہوئے بھی ان ظلم وستم کا مقابلہ کرتا ہے۔شہناز نبی کا یہ استعارہ صادق طریقے سے ان کے شعر میں موجود ہے اور سہل ممتنع کی طرح آسانی سے اس استعارے کے ذریعہ معنی خیز اور اہمیت سے پر بات کو انھوں نے پیش کیا ہے۔

مٹنے دے ساحلوں سے نشانات پیشِ رو
پھر اپنے راستے پہ سمندر بحال کر

اس شعر کے اندر 'ساحل' اور 'سمندر' دونوں استعارہ ہے۔ساحل سے مراد زندگی جینے کے وہ طریقے ہیں جس کو رہنما اور ناصح بتاتے ہیں اور سمندر سے مراد زندگی جینے کے وہ تمام اعمال وافعال ہیں جو انسان خود سے بناتا ہے۔یہ لامحدود ہوتا ہے۔شہناز نبی نے رہنما کے بتائے ہوئے طریقے کو ساحل کہہ دیا ہے اور انسان جو اپنے سے جینے کا طریقہ اختیار کرتا ہے جس کے اندر کوئی قانون نہیں ہوتا ہے، کوئی حد نہیں ہوتی ہے، کوئی ٹھہراؤ نہیں ہوتا ہے جس

طرح سمندر کے حدود کا پتہ نہیں چلتا ہے، اسے سمندر کہہ دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں آگے وہ نصیحت بھی کرتی ہیں کہ انسان کو لوگوں کے بتائے ہوئے طریقے پہ منحصر نہیں ہونا چاہیے اس کو اپنی زندگی جینے کا طریقہ خود سے اختراع کرنا چاہیے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا راستہ خود بنانا چاہیے۔

مجھے بھلا دے کوئی میرا دل دکھانے کو
کہ اِک چراغ یہی رہ گیا بجھانے کو

شعر میں 'چراغ' بطور استعارہ مرقوم ہے۔ جو متکلم کی زندگی ہے۔ شعر کے اندر شاعرہ نے زمانے کی مصیبت بھری زندگی کو استعارۃً چراغ کہا ہے اور اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کے دل کے اندر کوئی چاہت اور انبساط نہیں ہے۔ اسے کوئی اپنا ہمنوا اور رفیق بنانے کو تیار نہیں۔ اس لیے شاعرہ عشق و عاشقی کا یہ زاویہ بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ جب عاشق اپنے محبوب کو بھلا دیتا ہے تو اس کا دل دکھتا ہے اور دل دکھنے کے سبب انسان کی زندگی مصیبت اور تکلیف سے پیوست ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں اسی پس منظر کے تحت وہ خواہش کرتی ہیں کہ کوئی مجھے بھی بھلا دے جس سے میرا دل دکھے اور میں خود ہی ایک چراغ کی طرح روپوش ہو جاؤں اس طرح انھوں نے زندگی کو چراغ سے مستعار لیا ہے۔

سلگتے شہروں سے اتنا دھواں اٹھا اب کے
پرندے دور بیابانوں میں بھٹکتے ہیں

مندرجہ بالا شعر میں 'دھواں' اور 'پرندے' دونوں استعاراتی طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ 'دھواں' انسانوں پر ظلم وستم کے لیے مستعار ہے۔ نفرت کی زہر آلود ہواؤں کے زیر اثر انسانوں میں جو آہ وفغاں، بے بسی اور مظلومیت ہے ان کو دھواں کہہ دیا ہے۔ 'پرندے' شہر میں بسنے والے افراد ہیں۔ شہر کی حالت اتنی خستہ اور ظلم سے پر ہے کہ وہ اب شہروں سے الگ دور کہیں بسنا چاہتے ہیں جہاں ان کو سکون میسر ہو جس طرح بیابانوں میں اطمینان اور سکوت ہوتا ہے جہاں پر بسنے والے پرندے خوش رہتے ہیں اسی طرح انسان بھی اب ایسی جگہ تلاش کر رہا ہے جہاں اطمینان وسکون اور خاموشی ہو۔

بکھرتے ہی چلے جاتے ہیں سب اوراق میرے
سراسر منتشر دل کی کہانی ہو گئی ہے

یہاں 'اوراق' استعارہ ہے اور یہ زندگی کے الگ الگ شعبے ہیں جس کو شہناز نبی نے بطور استعارہ اوراق کہا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میری زندگی کتاب کے صفحوں کی طرح بکھرتی چلی گئی کبھی اس میں اطمینان وسکون میسر نہیں آیا جس کے عوض دل میں جو آرزو اور تمنائیں تھیں وہ سب کی سب منتشر ہوگئیں، بکھر گئیں اور تکمیل کے درجے تک نہ پہنچ سکیں۔

ہمارے در پہ کیوں اگتا ہے صحرا
ہماری آنکھ میں وحشت کہاں ہے

'صحرا' شعر میں ایسی زندگی کا استعارہ ہے جس کے اندر اجاڑ پن ہے یعنی خوشی ومسرت سے خالی ہے۔ تنہائی اور بے چہرگی ہے۔ اس شعر میں شاعرہ نے حال کی زندگی کو شعری جامہ پہنایا ہے وہ کہتی ہیں کہ نہ جانے کیوں اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ ہمارے پاس زندگی گذارنے کے لوازمات ہوتے ہوئے بھی صحرا کی طرح اجاڑ پن ہے۔ اس کے اندر زندگی کی رنگا رنگی نہیں ہے لیکن اب ہم کو ایسی زندگی گذارنے کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ ہماری آنکھوں سے ڈر بھی غائب ہوگیا ہے۔ انھوں نے معاشرتی زندگی کے کش مکش اور تصادم کو پیش کیا ہے۔

دور تک دھوپ کی تمازت ہے
ذکر اس کا ہی سائبان ہوا

اس شعر میں 'دھوپ' اور 'سائبان' دونوں ہی استعارے ہیں۔ اس میں عشقیہ بیان ہے، محبوب کی چاہت ہے اور اس چاہت سے خوشی ہے۔ دھوپ محبوب سے بچھڑنے کے غم سے مستعار ہے۔ محبوب سے دوری اور ہجر کی جو کیفیت ہوتی ہے اس میں دھوپ جیسی تمازت ہوتی ہے جس سے محبوب اپنے عاشق کی یاد میں بے چین رہتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی جب کہیں اس کے عاشق کا ذکر ہوتا ہے تو اسے ایک طرح کا سکون ملتا ہے جس طرح کڑی دھوپ میں سائبان کے مل جانے سے سکون حاصل ہوتا ہے۔

میں شیشہ ہوں مجھ سے بچو اجنبی
خطوطِ زیاں مت چنو اجنبی

شعر میں 'شیشہ' متکلم کی ہستی کا ستعارہ ہے ایک ایسی ہستی کا جس کے اندر کوئی چیز چھپنے والی نہیں ہے یعنی منافقت اور ریا کاری نہیں ہے اس کے ساتھ ہی اس ہستی نے اتنے تلخ تجربات حاصل کیے ہیں کہ وہ شیشے کے نوکیلے

ٹکڑے کی شکل اختیار کر لی ہے جس کو چھونے سے دوسروں کو تکلیف ہو سکتی ہے۔اس لیے شاعری متنبہ کر رہی ہیں کہ جس کے اندر اتنی سکت ہو کہ وہ میرے زخم، دکھ اور تکلیف کو خوشی میں بدل سکے وہی قریب آئے اور جو یہ نہیں کر سکتے وہ مجھ سے دور ہی رہیں کیونکہ شیشے کے ٹکڑے کی طرح وہ مجھ سے زخم ہی پائیں گے۔شہناز نبی نے اس منفی استعارے میں بھی مثبت انداز میں زندگی کی اس تلخ حقیقت کو پیش کیا ہے کہ وہی انسان کامیاب ہوتا ہے جو نا گارے پر چلنا جانتا ہو یعنی مصیبت کا سامنا کرنا اس کے خمیر میں ہو۔

ہوا سرکش اندھیرا سخت جاں ہے
چراغوں کو مگر کیا کیا گماں ہے

یہاں 'سرکش ہوا'، 'اندھیرا'، 'چراغ' یہ سب استعارے ہیں۔سرکش ہوا، اندھیرا ایک ایسی تہذیب کا استعارہ ہے جس کے اندر گھور ظلم وستم ہے جو انسان کو تہہ و بالا کیے جا رہا ہے لیکن پھر بھی انسان اس نئی تہذیب سے خوش ہے جس تہذیب میں اولاد و والدین کے درمیان محبت نہیں ہے، جس میں انسان بھیڑ میں بھی تنہا ہوتا ہے۔چراغوں مستعار ہے اس نئی تہذیب کے پروردہ لوگوں سے جو اس تہذیب کے تئیں اپنے ذہن میں تصورات کو پالے ہوئے ہیں جس میں زیاں ہی زیاں ہے۔ماضی کی تہذیب اور اپنے اثاثے کا خاتمہ ہے اور انسان ایسے دہانے پر جا رہا ہے جو بہت ہی الم ناک اندھیروں سے بھرا ہوا ہے جس کے اندر انسانیت بھی مفقود ہوتی جا رہی ہے۔

ان نگاہوں کے جواں ساحل پر ایک ننھا سا خواب
تھا گھروندا ریت کا جس کو سمندر ڈھا گیا

اس شعر میں 'سمندر' بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔شعر کے اندر شاعرہ نے یہ باور کرایا ہے کہ انسان اپنے اندر کچھ نرم وخوشگوار خواب سنجوتا ہے اور اس خواب کی تکمیل کے لیے وہ الگ الگ طریقے اختیار کرتا ہے۔اس کی منشاء یہ ہوتی ہے کہ اس کا خواب پورا ہو لیکن ابھی خواب اور ارادے اس کی آنکھوں میں ہوتے ہی ہیں کہ اچانک زندگی میں ایسے واقعات وحادثات مصیبت بن کر آجاتے ہیں کہ اس کا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔

جنگلوں کی سبز ٹھنڈک ہے تمہاری آنکھوں میں
ایک تنہا فاختہ اس چھاؤں میں ستائیگی

مذکورہ شعر میں 'فاختہ' استعارہ ہے اور یہ معشوق ہے۔معشوق اپنے عاشق کی ذات میں جنگلوں جیسا سکون

اور ٹھنڈک پاتی ہے اور اپنے آپ کو فاختہ کہہ کر اس ٹھنڈک میں آرام کرنا چاہتی ہے جس سے اس کو سکون ملے گا اور اسے طمانیت اور خوشی کی کیفیت میسر ہوگی۔ یہ ایک عشقیہ شعر ہے جس میں استعارے کے ذریعے عاشق و معشوق کی حسرت وصال کو پیش کیا گیا ہے۔

علامت:

تشبیہات و استعارات اور علامتوں کے ذریعے شاعری کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ شہناز نبی نے اپنی غزلیہ شاعری میں علامتوں کے ذریعے سے انسانی زندگی کے خدوخال کو پیش کیا ہے اور اپنی غزلوں میں تازگی و شگفتگی پیدا کی ہیں۔ انھوں نے جن علامتوں کا استعمال کثرت سے کیا ہے ان میں سمندر، ندی، پہاڑ، پرندے، جنگل، سورج، برگد وغیرہ ہیں۔ ان علامتوں کے استعمال کا مقصد اپنے اشعار کو مؤثر بنانا ہے تاکہ شعری تفہیم میں یہ کارآمد ثابت ہوں۔

علامت کے لغوی معنی 'نشان'، 'پتہ'، 'چھاپ'، 'مہر' اور 'آثار' کے ہیں۔ علامت سے مراد شاعری میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا ہے جس کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد ہوں لیکن شعر میں اکثر مجازی معنی مراد ہوتے ہیں۔ علامتوں کا استعمال اردو شعراء میں ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں لیکن کلاسیکی شعراء کے یہاں اس کا استعمال زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جدید شاعری میں بھی علامتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

شہناز نبی دور حاضر کی خواتین شاعرات میں نمائندہ ہیں۔ ان کے یہاں علامتوں کا استعمال کثرت سے موجود ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں دونوں ہی میں علامتوں کے سہارے اپنے نقطۂ نظر اور خیالات کو پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں علامتوں کی لمبی فہرست موجود ہے۔ ان کی چند علامتیں کچھ اس طرح ہیں:۔ ساحل، سندر، ٹیلہ، آسمان، سورج، صحرا، چراغ، دھواں، دن، رات، لہو، کنول، پتھر، ندی، گوریاں، فاختہ، مینا، سائبان، شجر، چھت، پہاڑ، بارش، آندھی، طوفان، جنگل، اندھیرا، اجالا، اوراق، سفر، جھاڑ، سیپ، آنگن، پیپل، ریت، دھو، چھاؤں وغیرہ۔ ان کے کچھ علامتی اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جارہے ہیں۔

زمیں سے پیار تھا لیکن اڑان سے پہلے
پھر آسماں نہ رہا آسمان سے پہلے

اس میں 'آسمان' علامت ہے غرور و گھمنڈ کی۔ شعر میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو زمین سے پیار تھا یعنی وہ

اپنے بڑوں سے اور اپنے گردونواح کے لوگوں سے پیار کرتا تھا ان سے ملتا تھا لیکن یہ اس کی کامیابی سے پہلے تھا آج کے دور میں انسان کو من چاہی کامیابی مل جاتی ہے تو وہ آسمان میں اڑنے لگتا ہے اور آسمان کی طرح لوگوں سے دور ہو جاتا ہے۔

چمکتی ریت پہ جلتے رہے میرے تلوے
سمندروں پہ کھلا اب کہ بادبان کہاں

اس شعر میں 'سمندر' زندگی کی علامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ آج کی چمکتی دمکتی دنیا دیکھنے میں تو بڑی خوبصورت لگتی ہے لیکن اس چمکتی دنیا میں انسان ویسے ہی جھلس جاتا ہے جیسے چمکتی ریت پر ننگے پاؤں چلنے سے پیر جھلس جایا کرتے ہیں۔ اسی طرح سے اب انسانی زندگی میں وہ پیار محبت اور رشتوں کی پاسداری نہیں رہی ہے اس کی زندگی میں گھٹن نے گھر بنالیا ہے۔ گلابلائیزیشن کے اس دور میں بھی انسان ترقی اور حرص ولالچ کی وجہ سے اپنے آپ میں مقید ہو چکا ہے اس کو اپنے گردونواح کچھ نہیں دکھائی دیتا ہے۔

ہر اِک شاخ بلاتی رہی پسارے ہاتھ
شجر کی گود سے لیکن اتر گئے پتے

اس میں 'شاخ' اور 'شجر' کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شاخ علامت ہے رشتے کی جسمیں بیٹا بیٹی اور دیگر رشتے شامل ہیں اور شجر علامت ہے ماں اور اثاثہ تہذیب کی۔ مادیت پرستی کے اس دور میں انسان حرص وہوس کا شکار ہے۔ نئی نسل اپنا تہذیبی اقدار کھو چکی ہے۔ والدین اولاد کی محبت سے محروم ہیں۔ کسب مال کی غرض سے اولاد اپنے گھر سے دور چلے جاتے ہیں اور والدین تنہا زندگی گذارتے ہیں۔ دولت کی چمک دمک کے دور میں تو نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ آج بچے اپنی زندگی کو سنوارنے اور تابناک بنانے کے لیے والدین کو اولڈ ہاؤس مین بھیج دیتے ہیں جس سے انسانیت شرمسار ہوتی ہے۔

یہ مانا دھوپ رستے کی کڑی ہے
مگر سائے کی خاطر گھر نہ رہنا

'دھوپ' علامت ہے زندگی کی سختی اور مصیبت کی اور 'سایہ' علامت ہے آرام طلبی کی۔ شعر میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو کامیاب ہونے کے لیے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جو انسان اس کا سامنا کرے گا محنت کرے گا وہی

کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے اور جو انسان دکھ اور مصیبت سے ڈر کر گھر میں بیٹھا رہے گا تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔شعر میں شاعرہ نے ناصحانہ پہلو اپنایا ہے جس میں علامت کے طور یہ کہا ہے کہ انسان کو محنت و مشقت کرنی چاہیے آرام طلبی کی خاطر گھر میں پڑے نہیں رہنا چاہیے گھر سے باہر نکل مصیبتوں کا سامنا کر کے کامیاب انسان بننا چاہیے۔

باغباں نے کبھی یہ سوچا ہے
کلیاں کیوں کھل کے مسکرا نہ سکیں

یہاں 'باغبان' اور 'کلیاں' دونوں علامت کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ باغبان سے مراد والدین اور سماج کے رہ نما اور کلیاں سے مراد لڑکیا ہیں۔شعر کے اندر شاعرہ نے سماج کے اس دوہرے پن کو اجاگر کیا ہے کہ سماج میں مرد اپنے آپ کو حاکم قرار دیتا ہے اور اپنے لیے قانون وضابطے نہیں رکھتا ہے لیکن جنس مخالف کے لیے طرح طرح کے قوانین وضع کیے ہیں۔لڑکیوں کو کیا کرنا ہے؟ کیا پہننا ہے؟ کیا کھانا ہے؟ ان سارے افعال پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔لڑکیاں معاشرے میں اپنی مرضی کی مالک نہیں ہیں ان پر مردوں کا پہرہ ہے۔ان ہی ساری چیزوں پر وہ سوال اٹھاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ سماج کے رہنما یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اتنی ساری پابندیاں آخر کس بنا پر لڑکیوں پر عائد کی گئی ہے۔زمانے کی اتنی ترقی کے باوجود بھی سماج کے رہنما عورتوں کی آزادی کے بارے اور ان کے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے ہیں۔

جنگل کبھی تکیہ ہوا
صحرا کبھی بستر ملا

اس شعر میں 'جنگل'، 'صحرا' علامت کے طور پر مستعمل ہیں۔جنگل علامت ہے ایسی زندگی کا جہاں بہت بھیڑ ہے اس کے باوجود خاموشی ہے جس طرح جنگل میں بہت سارے نبادات و جمادات ہوتے ہیں لیکن چہل پہل نہیں ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی بھیڑ میں ہوتے ہوئے بھی بے چہرگی کا شکار ہے اور آج صفت والی زندگی انسان کا تکیہ بن گیا ہے۔صحرا بھی علامت ہے ایسی زندگی کا جہاں نہ کوئی خوشی ہے نہ رشتے کی پاسداری ہے زندگی جوش سے خالی خالی ہے اور خوشی سے معدوم یہی صحرا آج کے انسان کا نصیبہ ہے۔بستر اور تکیہ لگانا دوامیت کی علامت ہے یعنی آج انسان ہر لمحہ ہر گھڑی ترقی کر کے بھی بھیڑ کے جم غفیر میں تنہائی و بے چینی کا شکار ہے۔

ساحل سے گذر جانے کو راضی تھے مسافر
منزل کا اشارہ توبھنور میں کبھی رکھتا

اس شعر کے اندر 'ساحل'، 'مسافر'، 'بھنور' علامت ہیں۔ ساحل سے مراد زندگی کا ایسا موڑ ہے جس موڑ سے انسان اپنی کامیابی کو حاصل کرتا ہے۔ مسافر سے مراد انسان ہیں اور بھنور سے مراد مقابلہ جاتی، افراتفری اور پریشانی بھری زندگی ہے۔ شعر کے اندر شاعرہ نے انسانی زندگی کے ان ممیّزات کو پیش کیا ہے جسمیں انسان کامیاب ہونے کے لیے ان تمام مراحل سے گذر جانا چاہتا ہے جس مرحلے سے اسے کامیابی نصیب ہو اور انسان کو کامیابی تبھی مل سکتی ہے جب وہ آج کے اس گہما گہمی اور مصیبت سے بھری زندگی میں بھی وہ اپنے منزل کو بھولے نا تب وہ کامیاب ہو جائے گا۔

شہر پرچھائیوں کا مسکن ہے
بات کرنے کو بھی ترستے ہیں

یہاں 'پرچھائی' کو علامت بنا کر شاعرہ نے پیش کیا ہے۔ آج افراد شہر ایسے ہو چکے ہیں کہ ان کی ساخت ایک سائے کی طرح بن کر رہ گئی ہے۔ شہروں میں لوگوں کا ہجوم ہے لیکن سب کہ سب جان رکھتے ہوئے بھی سائے کی طرح بے جان ہیں۔ جس طرح سایہ دوسرے سایے سے نہ بول سکتا ہے نہ بات کر سکتا ہے نہ محبت کا اظہار کر سکتا ہے اور نہ رشتے کی پاسداری رکھ سکتا ہے من وعن اسی سائے کی طرح ہی شہر کے لوگ ہو چکے ہیں۔ ان چیزوں کو بیان کرنے کے لیے شہناز نبی نے علامت کا سہارا لیا ہے اور وہ اپنی بات کو آسانی سے قاری تک پہنچانے میں بھی کامیاب نظر آتی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو شعر کہنے کے فن پر دسترس ہے۔

علم بدیع:

شہناز نبی کی شاعری میں وہ اسالیب اور قوانین موجود ہیں جو شاعری کے لیے سانچے کا کام کرتے ہیں چاہے وہ بحریں ہوں یا شاعری کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے علم بیان اور علم بدیع ہوں جس طرح ان کی غزلوں میں علم بیان کے ممیّزات موجود ہیں اسی طرح علم بدیع بھی ان کی شاعری کے وصف کو دوبالا کرتی ہے۔

علم بدیع بلاغت کی ایک اہم شق ہے اس کو علم معانی بھی کہتے ہیں۔ اس شعبے میں کلام میں استعمال ہونے والی صنعتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ چونکہ شاعری خوبصورت اظہار کا فن ہے اس لیے حسن بیان کی جو قدریں شاعری

میں موجود ہوتی ہیں وہ شعری جمالیات کا حصہ ہوتی ہیں۔شاعری میں ایسے پیرائے اظہاراور اسلوب بیان کا اہتمام کرنا شاعری کے حسن ولطافت اور وسعت معانی میں اضافہ پیدا کرتا ہے اور یہ صنعت کہلاتے ہیں۔اس علم میں جو صنعتیں شاعری میں بیان کی جاتی ہیں ان میں مناسبت لفظی، صنعت تجنیس، تلمیح ، تضاد، حسن تعلیل، سوال وجواب، ایہام، مبالغہ، تکرار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شہناز نبی کی غزلوں میں علم بدیع کی جو صنعتیں استعمال ہوئی ہیں اس سے ان کی غزلوں کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔انھوں نے اس علم کے تحت جن صنعتوں کا خاص طور پر استعمال کیا ہے وہ بہت ہی معنی خیز ہیں۔ان صنعتوں کے ذریعے ماضی کی اقدار سے منسلک ہیں اوران کی تاثیر لوگوں پر دیر پا قائم رہتی ہے۔یہ تاثیر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے صنعت تلمیح، صنعت تجنیس، صنعت تکرار، صنعت تضاد، صنعت مناسبت لفظی وغیرہ کو اپنی غزلوں میں بروئے کار لایا ہے۔ان کی غزلوں میں پائی جانے والی صنعتوں کی چند مثالیں نمونے کے طور پر پیش کی جارہی ہیں۔

صنعت تجنیس:

ایسے دو لفظ جو صورت یا تلفظ کے اعتبار سے مشابہ ہوں مگر معنی کے اعتبار سے مختلف ہوں۔اس صنعت کی کئی اقسام ہیں جس میں لفظ کے حروف سکنات میں تبدیلی ہوتی ہے۔اس کی ایک قسم تجنیس ناقص وزائد ہے جس کو مطرف بھی کہتے ہیں۔جب تجنیس کے دو لفظوں میں صرف ایک حرف کی کمی بیشی ہو جائے ایسا لفظ شروع، درمیان اور آخر میں بھی ہوسکتا ہے۔شہناز نبی کے یہاں صنعت تجنیس کے اعتبار سے تجنیس کی یہی قسم کہیں کہیں دیکھنے کو ملتی ہے مثال کے طور پر یہ شعر ملاحضہ ہوں:۔

سنہری دھوپ نگل کر نکھر گئے پتے
چلی جو زرد ہوا تو بکھر گئے پتے

اس شعر میں 'نکھرنا' اور 'بکھرنا' دونوں تجنیس مطرف ہے۔ایک حرف کی تبدیلی نے دونوں کی ساخت کو بدل دیا ہے ورنہ دونوں لفظ ایک ہی شکل کے تھے لیکن دونوں کے معنی الگ الگ ہیں نکھرنا کے معنی چمکنا اور بکھرنا کا معنی انتشار کا ہے۔

یقین تھا، گمان گذرا

کوئی تمہارے سمان گذرا

اس شعر میں صنعت مطرف کا استعمال ہوا ہے جس میں لفظ 'گمان' اور 'سمان' ہیں۔ان کے معنی الگ الگ ہیں اوران میں صرف ایک حرف کی تبدیلی واقع ہے اور یہ تبدیلی 'ک' اور 'س' کی ہے۔گمان کے معنی ہوتا ہے خیال کے اور سمان کا معنی طرح کا ہے۔

اس طرح شہناز نبی کے یہاں شبہِ تجنیس تو پائی جاتی ہے لیکن تجنیس تام اور تجنیس مرکب کی مثالیں ان کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

تلمیح:

شہناز نبی نے اس صنعت کے ذریعے سے اسلامی اور دیو مالائی ،تاریخی واقعات اور قصے کے ذریعے لوگوں کی توجہ کو اپنی شاعری کی طرد مبذول کرایا ہے۔اس کے ذریعے ان کی شاعری کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔تلمیح علم بدیع کی ایسی صنعت ہے جس میں شاعر کسی مشہور تاریخی، سیاسی، واقعہ یا قصے کی طرف اشارا کرتا ہے۔شہناز نبی کے یہاں ایسی تلمیحات موجود ہیں جس میں مشہور تاریخی واقعے اور قصے اور مسئلے کی طرف اشارا ملتا ہے۔کچھ نمونے دیکھیں:۔

تیرے بازار میں یوسف کی قیمت ہم ادا کرتے
مگر صورت ہے لاثانی نہ سیرت مثالی ہے

اس شعر میں صنعت تلمیح کا استعمال ہوا ہے اور پیغمبر حضرت یوسفؑ جو کہ عظیم المرتبت نبیوں میں سے ایک تھے۔اللہ تعالی نے انھیں معجزے کے طور پر خوبصورتی عطا کی تھی جس کی مثال پورے عالم میں دی جاتی ہے۔اس شعر کے اندر حضرت یوسفؑ کے اس واقعے کی طرف اشارا ملتا ہے جب ان کو بازار میں فروخت کیا گیا تھا تو ان کے خریدار بہت تھے کیونکہ ان کے پاس خوبصورتی کے ساتھ خوبصورتی کے بھی اعلی نمونے تھے۔حضرتؑ کو جب بیچا جا رہا تھا تو ان کو خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

اس شعر میں شہناز نبی یہ کہتی ہیں کہ آج کے انسان کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی قیمت ادا کر کے ہم اس کو حاصل کرلیں۔اس سے مراد محبوب بھی ہوسکتا ہے جس کے لیے شاعرہ یہ کہہ رہی ہیں کہ اگر محبوب میں کچھ ایسی صورت اور سیرت ہوتی تو ہم اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے جس طرح حضرت یوسفؑ کو خریدنے کے

لیے لوگوں میں سب کچھ دینے کی ہوڑ لگی تھی لیکن محبوب میں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔

دے سکے تو دجلہ فرات دے
کیوں بناتا ہے کربلا مجھکو

شعر کے اندر 'دجلہ'، 'فرات' اور 'کربلا' تلمیح کے طور پر مستعمل ہیں۔ دجلہ اور فرات حضرت موسیٰؑ کے دور کی مصر کی دو ندیاں ہیں۔ ان ندیوں کے پانی بہت میٹھے ہوتے تھے جس کو اہل مصر پیتے تھے۔ شعر کے اندر ان ندیوں کا استعمال کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ دجلہ اور فرات سے مصر والے سیراب ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ مستعمل لفظ کربلا اس واقعے کی طرف اشارا کرتا ہے جس میں حضرت حسینؓ کی شہادت ہوئی۔ واقعہ کربلا پوری اسلامی تاریخ میں ایک الم ناک اور غم ناک واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعے میں حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں نے عبیداللہ ابن زیاد کے خلاف حق کی آواز بلند کی تھی لیکن ابن زیاد اور اس کے فوجیوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں، گھر والوں کو شہید کر دیا تھا جس میں کم سن بچے بھی تھے۔ کربلا کے میدان میں یہ الم ناک واقعہ ہوا تھا اس لڑائی کے دوران ایسے واقعات وحادثات رونما ہوئے تھے جو دل دہلانے والے ہیں۔ واقعہ یوں تھا کہ اس لڑائی میں عبیداللہ ابن زیاد نے پیاس کی شدت کو بھی خاطر میں نہیں لایا اور حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھی پیاس کی شدت کی وجہ سے تڑپ رہے تھے ان کو پانی کی طلب تھی لیکن ان کو پانی میسر نہیں ہوا۔ چونکہ یہ واقعہ کربلا میں ہوا تھا اور کربلا کے میدان میں ان کو پانی نہیں ملا اور ہمارے شعرا کے یہاں یہی میدان علامت کے طور پر مستعمل ہونے لگا جس سے مراد جہاں پانی نہ ہو لوگ پیاسے مر رہے ہوں۔

شہناز نبی کے اس شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارا کیا گیا ہے جس میں وہ کہتی ہیں کہ اگر دے سکتے ہو تو مجھے فرات ودجلہ دو یعنی خوشی وسرسبزی دو جس سے میں سیراب ہو سکوں مجھے کربلا نہ بناؤ جہاں میں پیاسی مر جاؤں یعنی دکھ، غم اور مصیبت کا پہاڑ مجھ پر مت توڑو۔

لو ہم نے سبھی چاکِ جگر سی لیے
لوٹا دے جو بھی مسیحائی کو آئے

مندرجہ بالا شعر میں لفظ 'مسیحائی' بطور تلمیح برتا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالی نے یہ معجزہ دیا تھا کہ وہ لوگوں کے بیماری کو دور کر دیتے تھے اور مردوں کو بھی کچھ وقت کے لیے زندہ کر سکتے تھے۔ ان کے اسی وصف کی طرف

اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے اس وصف کو مسیحائی کہا گیا ہے۔ اس لفظ کو استعمال کر کے شہناز نبی یہ باور کراتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ مجھے میرے دکھ اور تکلیف کو دور کرنے والا کوئی مسیحا نہیں چاہیے کیوں کہ مجھے اپنے زخموں کی پیوند کاری کرنا بخوبی آتا ہے۔ اس شعر میں مسیحائی تلمیح کے ساتھ علامت بھی ہے یعنی شفا دینے والا۔

ہم تو ہوائے شوق میں آگے نکل گئے
خضرِ خجستہ گام تھے منزل کے آس پاس

اس شعر کے ذریعہ حضرت خضرؑ کو تلمیح کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ حضرت خضرؑ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے تھے اور اللہ تعالی نے ان کو یہ خصوصیت دی تھی کہ وہ بھٹکے لوگوں کو راستہ بتاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالی نے ان کو بہت سارے علم سے نوازا تھا۔ ان کو اللہ نے اس وقت کے پیغمبر حضرت موسیٰؑ سے بھی زیادہ علم سے نوازا تھا۔ ایک بار موسیٰؑ نے اللہ تعالی سے پوچھا کہ اے اللہ اس وقت ہم سے بھی زیادہ کوئی آپ کے قریب ہے؟ حضرت موسیٰؑ کے دل میں یہ تھا کہ میں ہی پیغمبروں میں اللہ کا سب سے برگزیدہ بندہ اور رسول ہوں تو اللہ نے ان کو بتایا کہ ہاں موسیٰؑ ایک بندہ ہے جس کا نام خضر ہے اس کے پاس تم سے بھی زیادہ علم ہے وہ ہمیشہ میری عبادت میں لگا رہتا ہے۔

شعر کے اندر خضر جو تلمیح کے طور پر مستعمل ہے اللہ کے اسی برگزیدہ بندے کی طرف اشارا ہے۔ شعر کے اندر شاعرہ یہ کہتی ہیں کہ ہم تو جنون میں اپنے مقصد اور منزل سے آگے نکل گئے تھے حالانکہ ہماری جو منزل تھی اس تک ہم پہنچ چکے تھے اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے ہم نے صحیح راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ راستہ ایسا تھا جس پہ حضرت خضر کے پیروں کے مقدس نشان تھے یعنی منزل تک پہنچنے کے لیے مرے اندر کوئی چھل کپٹ نہیں تھا جس طرح حضرت خضر خلوص و ایثار کے جذبے کے ساتھ بھٹکے ہوئے لوگوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے تھے جس میں ان کی نیک نیتی شامل رہتی تھی اسی طرح ہم نے بھی پوری نیک نیتی سے اپنی منزل کو حاصل کیا ہے لیکن ہم میں منزل کو پانے کا شوق اتنا تھا کہ ہم اسی شوق میں منزل سے بھی آگے نکل گئے ورنہ جس منزل پہ سکون تھا۔ اطمینان والی زندگی تھی وہ تو حضرت خضر کی بتائی ہوئی منزل تھی لیکن ہم اس سے بھی آگے آ گئے ہیں اور سکون والی زندگی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔

کچھ سلیماں خوش ادا ہیں ناشناسائے زباں
اور کچھ رہتا ہے یہ شہرِ سبا میرے خلاف

درج بالا شعر میں لفظ 'سلیماں' اور 'شہرسبا' اسلامی تلمیح ہے۔ پیغبروں میں ایک پیغمبر گذرے ہیں جن کا نام حضرت سلیمانؑ تھا۔ دنیا کی تمام مخلوقات ان کی طابع تھیں اور یہ جن سے لیکر چرند پرند سب کے حاکم تھے۔ یہ ان کی باتوں اور بولیوں کو سمجھتے تھے۔ شعر میں ان ہی کی طرف اشارہ ہے اور طنزیہ پہلو ہے کہ عصر حاضر میں کچھ لوگ ایسے ہیں اپنے آپ کو سلیمان سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ علم سے نابلد ہیں۔ شہرسبا اس شہر کا نام ہے جس پر ملکہ بلقیس کی حکومت تھی۔ اس شہر کے چاروں طرف بلند دیواریں تھیں جس سے یہ شہر محفوظ تھا۔ یہ اپنے زمانے کا بہت ہی ترقی یافتہ اور متمدن شہر تھا۔ بلقیس کو حضرت سلیمانؑ نے توحید کا پیغام بھیجا تھا اور کچھ روایتوں میں ملتا ہے کہ انھوں نے اس کو قبول بھی کر لیا تھا۔ اس مصرعے میں بھی طنز ہے کہ آج کا شہر جس میں نہ ترقی ہے اور نہ ہی چین وسکون ہے ایسے شہر کے لوگ شہرسبا گردانتے ہیں اور وہی شہر میرے خلاف ہے۔

صنعت تکرار:

دو لفظ جو ایک ہی معنی رکھتے ہوں شعر میں یا مصرعے میں استعمال کرنا، تکرار کہلاتا ہے۔ ہمارے اردو شعراء اقدیم سے لیکر جدید تک نے تکرار کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے۔ جس طرح شاعری میں علم بیان، علم بدیع کے دیگر ارکان کے استعمال ے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح بدیع کے اس صنعت تکرار کو ہمارے شاعروں نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے جس سے شعر میں جو بات کہی جاتی ہے اس میں تاکید کا معنی پیدا ہوتا ہے۔ س صنعت کے استعمال سے شعر میں تاکیدی کے ساتھ ساتھ لفظوں کی تکرار کی وجہ سے ایک طرح کی موسیقیت بھی پیدا ہوتی شہناز نبی نے بھی اپنی غزلوں میں صنعت تکرار کا استعمال جا بہ جا کیا ہے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے جو بات قاری تک پہنچانا چاہتی ہیں اس میں صنعت تکرار کا اکثر مقامات پر سہارا لیا ہے جس سے ان کی باتوں میں تاکید پیدا ہوئی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جس کے اندر انھوں نے صنعت تکرار کا استعمال کیا ہے۔

سنبھل سنبھل کے کوئی روز بڑھتا جاتا ہے
میں حاشیے سے مگر روز گھٹتی جاتی ہوں

شعر کے اندر سنبھل سنبھل کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو ساخت اور معنی کے اعتبار سے ایک ہیں۔ شاعرہ نے لفظ سنبھل کر کا استعمال دوبار اس لیے کیا ہے کہ شعر میں تاکید کا معنی پیدا ہو۔

نظر نظر میں کوئی شئے تھی ایک جھجھک جیسی

کہ کھل کے ملنے میں شکووں کی اک کھٹک جیسی

یہاں لفظ 'نظر نظر' تکرار کے ساتھ مستعمل ہے۔ جو تاکید کا معنی پیدا کرتا ہے۔ شعر میں نظر نظر کو تاکید کے معنی کے لیے اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ عاشق معشوق کی نظر میں اور ان کے دل میں ملاقات میں حائل ہونے والی ایک دوسرے سے دور رکھنے والی ان کی محبت یا شرم ہے اور یہ دونوں ہی ہوتی ہے یہی تاکید ہے۔

جدا ہوئے وہ کسی گام بے نوائی پر
قدم قدم پہ ہم کس لیے ٹھہرتے ہیں

اس شعر میں 'قدم قدم' تکرار ہے۔ عاشق و معشوق کسی انجان جگہ پر جدا ہو گئے ہیں پھر بھی وہ ٹھہر ٹھہر کے رک رک کے دیکھتے ہیں اسی کو شاعرہ نے کہا ہے کہ جب دونوں جدا ہو گئے تو پھر راستے میں ٹھہر کے کیوں دیکھتے ہیں۔ اس میں ان کی محبت کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔

زمیں نے تو گن گن کے بدلے نکالے
اور اب فتنۂ آسمانی الگ ہے

اس شعر میں 'گن گن' الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ تکرار اور تاکید کے معنی ہے۔

ہنستے ہنستے رو دینا جن آنکھوں کا ہے شیوہ
ان آنکھوں کا بھید کسی دن اس نے پوچھا ہوتا

یہاں 'ہنستے ہنستے' جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ تکرار ہے جس میں تاکید کا معنی نکلتا ہے۔ شاعرہ نے ہنستے ہنستے رو دینے کو غم کی زیادتی کی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے۔

صنعت تضاد:

شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جس میں بہ اعتبار معنی تضاد پایا جائے تو اسے صنعت تضاد کہتے ہیں۔ شہناز نبی کی غزلوں میں یہ صنعت اکثر جگہوں پر دیکھی جا سکتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

موت ایک شرط ہے جینے کی
کس کو ملتی ہے زندگی تنہا

یہ چاہتی ہو ں کہ اسے بھلا ہی دوں لیکن
اسے ہی یاد کروں پھر کئی بہانوں سے

کیوں یہ شب خون ہے اجالوں پر
اے اندھیرے کی شہ سوار ہوا

آگے پیچھے پیچھے جگ مگ تارے
پھر بھی کتنا تنہا چاند
ہنستے ہنستے رو دینا
آدھی رات کا ڈھلتا چاند

زمیں خفا تھی بہت آسماں پرایا تھا
یہ اپنا ظرف کہ ہر حال میں نبھایا تھا

شاید نہ بھلا پائے سوالوں کی چبھن کو
چاہے تو سمجھائے وہ جوابات ہنسی میں

اس طرح شہناز نبی نے اپنی غزلوں میں تضاد الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ان میں صبح وشام، موت وزندگی، زمین آسمان، اندھیرا اجالا، دن رات، خزاں بہار، پھول کانٹے، ہنسنا رونا، آگ پانی، چاندسورج، آگے پیچھے، خوشی غمی، سوال جواب، بھولنا یاد کرنا، آزادی و پابندی، سونا جاگنا، اقرار وانکار، بنانا مٹانا، جلانا بجھانا، نرم سخت، اثبات نفی، آگ پانی، ٹھنڈا گرم، گاؤں شہر وغیرہ جیسے تضاد الفاظ کو شہناز نبی نے اپنی غزلوں میں رقم کیا ہے۔ان کے ذریعے ان کی شاعری میں وسعت اور گہرائی کے ساتھ موضوعی اعتبار سے فطرت کے وہ تمام عناصر محیط ہیں جو ایک دوسری کی ضد ہیں۔ یہ قول محقق ہے کہ دنیا ہی متضاد ہے۔شہناز نبی نے جس طرح کے تضاد الفاظ کا استعمال اپنی غزلوں میں کیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کائنات کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

مناسبت لفظی:

اس کومراعاۃ النظیر بھی کہتے ہیں۔شاعری میں اس تناسب،توفیق اور تلفیق کو کہتے ہیں جس کے اندر ایسے الفاظ جمع کیے جائے جن کے معنی میں ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت واقع ہومگر یہ نسبت تضاد اور تقابل کے نہ ہوں۔اس سے شاعری کا حسن بڑھ جاتا ہے۔شہناز نبی نے اس صنعت کا بھی استعمال اپنی غزلوں میں کیا ہے جس سے ان کی شاعری میں نکھار آیا ہے۔کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ان تیز گاموں میں وہ بھٹکے گا در بدر
ہم نے جو منزلوں کا حوالہ مٹا دیا

جب سے متاع و مال کی ان کو سمجھ ہوئی
تب سے میرا قبیلہ بٹا خوش ہوئے ہونا
جن کے آنچلوں میں یادوں کی گرہیں لگائی تھی
شعلوں میں ان کا وعدہ جلا خوش ہوئے ہو نا

کتنی دعائیں مانگیں ،کتنے وظیفے پھیریں
مایوس ہو رہے ہیں پھر بھی تیرے آسماں سے

اداسی کو بھلا فرصت کہاں ہے
تمہارے غم کو اب وسعت کہاں ہے

ان کے ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مناسبت لفظی کا استعمال خوبصورتی سے کیا ہے جس سے ان کی شاعری میں نغمگی پیدا ہوئی ہے اور مناسبت لفظی کی صفت بھی۔

ان صنعتوں کے علاوہ اور دوسری صنعتیں بھی ان کی غزلوں میں موجود ہیں جیسے :۔غلو، لف ونشر،تنسیق الصفات، مقابلہ،سوال جواب،قلب ،اشتاق،تصحیف وغیرہ۔غرضیکہ شہناز نبی کی غزلوں میں زبان وبیان کی خوبیاں بڑی عمدگی کے ساتھ ملتی ہیں۔انھوں نے اپنی غزلوں میں اصناف شاعری کے اچھے تشبیہات،عمدہ تلمیحات، نادر تکرار،

خوش آہنگ مناسبت لفظی اور فطری تضاد وغیرہ کا استعمال بخوبی کیا ہے جس سے ان کی تحریر میں معنویت پیدا ہوئی ہے اوران کی غزلوں کی حسن میں بھی اضافہ ہوا ہے جس سے ان کے اشعار میں وسعت اور معنی میں اثر انگیزی آئی ہے۔

*****

حواشی:

1۔ڈاکٹر منصور خوشتر، اکیسویں صدی میں اردو غزل، ص 11

2۔محمود ملک، کاروان ادب بھوپال شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2017، ص 121

3۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 121

4۔کہکشاں تبسم، نسائی شعری آفاق، ص 335

5۔محمود ملک، کاروان ادب بھوپال شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2017، ص 169

(ب) بحیثیت نظم گو:

اردو ادب میں صنف شاعری عرب ممالک کے صحراؤں سے نکل کر مختلف ساگروں اور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہے۔ابتدا میں عربی فارسی کا سہارا لیا اور رمز وایما کا لبادہ اوڑھا۔کسی نے اشاروں اور کنایوں میں ڈھالا تو کسی نے اسے اس قید سے نکالا۔کبھی یہ قصوں درقصوں کا مرکز بنی تو کبھی کسی کی مدح سرائی کے کام آئی۔کبھی یہ دلی کیفیات کا اظہار بنی تو کبھی کسی کی موت پر آہ وزاری کا وسیلہ،الغرض مختلف حصوں میں بنٹ کر بھی یہ ہم سے ہمیشہ سے قریب رہی ہے۔

ابتدا میں یہ لڑکھڑائی،سنبھلی، پھر پاؤں پاؤں چلنا سیکھا۔اس نے مختلف ادوار دیکھے،کبھی ابہام گوئی کا نشانہ بنی تو کبھی رومانیت کا گہوارہ،کبھی مقصدیت میں کھوگئی تو کبھی وجودیت میں ڈوبی،تو کبھی ابھری اور کبھی عصری تقاضوں کی ترجمان بنی۔اس طرح اردو شاعری اپنے مختلف اصناف کے ساتھ شباب پر پہنچ گئی ہے۔

آج شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے بے پناہ شعرا اور شاعرات ہیں۔سب کا الگ مقام اور شناخت ہے۔عہد حاضر کی شاعرات میں شہناز نبی اپنی منفرد آواز اور لب ولہجہ کے بنا پر پہچانی جاتی ہیں۔اردو شاعری کی دنیا میں انہوں نے اپنی غزلوں کے ساتھ قدم رکھا اور ان کا پہلا مجموعہ ''بھیگی رتوں کی کتھا'' 1990 میں منظر عام پر آیا۔اس طرح شعر وشاعری کی دنیا میں انہوں نے اپنی پہچان بنائی اور پھر ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' اور ''پس دیوار گریہ'' کے حوالے سے وہ ایک نظم گو شاعرہ کے طور پر ابھریں۔اب تک ان کی نظموں کے چار مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور خاص وعام میں مقبولیت کا سبب بنے ہیں۔ان کی شاعری نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان اور خلیجی ممالک میں بھی شہرت حاصل کی ہے۔انھوں نے نظمیں وغزلیں دونوں کہیں۔ان کی شاعری کی کیا خصوصیات ہیں اور ادب میں ان کا کیا مقام ہے؟اس کا تعین ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لے کر ہی کیا جاسکتا ہے۔اس باب میں بحیثیت نظم گو اور بحیثیت غزل گو دو ذیلی باب کے تحت ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا اور ادب میں ان کے مقام کی نشاندہی کی جائے گی۔

موضوعات:

ہر عہد اپنا ایک موضوع رکھتا ہے، اس کی اپنی شعری زبان بھی ہوتی ہے جو کہ زمانے کے افکار ونظریات، خیالات واحساسات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہے جیسا کہ عبارت بریلوی لکھتے ہیں:

''شاعری کے موضوع کا تعلق صرف مشاہدے سے نہیں ہے۔ اس کا آغاز مشاہدے سے ضرور ہوتا ہے لیکن پھر جذبات واحساسات کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر نئی نئی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔''1ؔ

اگر ہم عہد کے اعتبار سے دیکھیں تو عہد ولیؔ اور میرؔ تک کی شاعری کا موضوع حسن وعشق اور تصوف رہا ہے۔ وہیں غالب اور اقبال کے یہاں عصری حقائق وژن کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ترقی پسند عہد میں فیضؔ، مخدومؔ، علی سردار جعفریؔ وغیرہ کی تخلیقی کاوشیں اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اس عہد کا موضوع مزدور اور مظلوم طبقہ ہے۔ ملک کی آزادی اور سائنسی بایجادات کے ظہور میں آنے اور حالات کے تبدیل ہونے پر شعرا نے موضوعات بھی بدلے۔ علامتوں، استعاروں اور دیو مالائی عناصر شاعری کے لیے موزوں قرار پایا۔ وجودیت سے متاثر شعرا نے حیات وکائنات سے متعلق مسائل کو اپنی ذات سے جوڑ کر سمجھنے کی کوشش کی۔ جدید شاعرات نے عصری موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور عصری مسائل بالخصوص معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا۔ جن خاتون شعرا نے عصری حقائق کو شعری زبان کے قالب میں ڈھالا ان میں اداؔ جعفری، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، زہرہ نگار، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ان شاعرات نے شاعری میں موضوع کے اعتبار سے عصری حقائق اور معاشرتی تقاضوں، ذات کا کرب اور عدم مساوات کو اپنی غزلوں اور نظموں کا موضوع بنایا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاعری کی پہچان اس کے عہد اور اس کے مابین پل رہے مسائل سے ہوتی ہے گو کہ یہ مسائل بالکل نئے نہیں ہوتے بلکہ ان میں کچھ نئے مسائل جڑ جاتے ہیں، حساس فنکار ان کو محسوس کرتا ہے۔ شہناز نبی کے یہاں مسائل وہی ہیں جو ان کے معاصرین کے پاس ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے یہاں ذرا مختلف پیرائے میں ادا ہوئے ہیں۔

شہناز نبی کے یہاں عورت کی حیثیت کا اظہار، اس کی شخصیت کی سائیکی اور اس کے وجود کے جملہ

پہلوؤں کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج عورت اپنی ذات اور اپنے وجود کو منوانے کے لیے کمر کس چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصری حقائق کے برملا اظہار نے ان کی شاعری میں جان ڈال دی ہے۔ شہناز نبی کی شاعری میں ایسی عورت سانس لیتی ہے جس کے ذہن میں سوچ کی لہریں زندہ ہیں، وہ فریاد و کناں نہیں کرتی بلکہ اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر بنانے اپنے مسائل کا حل خود سے حل نکالنے کی ہمت رکھتی ہے۔ وہ وقت سے پہلے ہارنا نہیں چاہتی۔ اس طرح ہمیں ان کی شاعری میں عورت کے فکری وجود کا احساس ملتا ہے۔ یہ مسائل صرف سوالیہ نشان ہی قائم نہیں کرتے بلکہ اس کی سمت و رفتار کا تعین بھی کرتے ہیں۔ شہناز نبی اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ سوالوں کی قدر و قیمت یا معنویت کس طرح قائم کریں۔ عورت کی ذہنی اور طبعی میلان کا تقدر کس حیثیت سے کی جائے؟ عورتیں اپنی نگاہ یا نقطۂ نظر سے اپنی زندگی اور ان سے ملحقہ مسائل کو دیکھنا اور پرکھنا کس نوعیت سے پسند کرتی ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر بھی ان کی نظریں گئی ہیں۔

اس کے علاوہ شہناز نبی نے اپنی شاعری میں سیاسی، سماجی موضوعات کو بھی برتا ہے۔ مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ فسادات، نیتاؤں کی لوٹ کھسوٹ، غریبوں کا حق مارا جانا، امیری، غریبی، ذات پات، رسم و رواج کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر حلیمہ فردوس شہناز نبی کے موضوعات کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''شہناز نبی کی نظریں نسائی مسائل کے علاوہ معاشرے کی کوتاہیوں پر مرکوز رہتی ہیں، وہ ان کمزوریوں سے بنے خاکوں کو اپنے شعری البم میں قید کر لیتی ہیں۔''[2]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی نے اپنی شاعری میں نہ صرف انسانی نفسیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ان کے یہاں سیاسی، سماجی اور تانیثی مسائل بھی شدت کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''مجھے پکارتی ہے'' میں ان کے شعری موضوعات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

آدھی رات کو
کمرے کی دم گھوٹتی فضا
جب نیند سے جگاتی ہے
نظم مجھے پکارتی ہے
صبحدم

چائے کی پیالی سے
اخبار کی سرخی سے
بسوں کے شور سے
فٹ پاتھ کے جھگڑوں سے
نظم مجھے پکارتی ہے
نعروں، جھنڈوں
سیاسی ہتھکنڈوں
راشن کی قطار
بے ہنگم بازار
گرتی ہوئی چھتوں
شکستہ آنگنوں سے
نظم مجھے پکارتی ہے

(پس دیوار گریہ) 3

اگر ہم شہناز نبی کی نظموں کے مجموعے کا موضوعاتی اعتبار سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' جو 2001 میں منظر عام پر آیا، اس میں شامل تقریباً سبھی نظمیں ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہیں۔ شروعات میں ان کا لہجہ رومانی ہے لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتی ہیں شاعرہ کا لہجہ سنجیدہ ہوتا جاتا ہے۔ رومانیت سے حقیقت اور حقیقت سے آفاقیت تک ان کا شعری سفر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ سماج کے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ عورت کی محکومیت کا احساس بھی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ ''پس دیوار گریہ'' کی نظموں کو موضوعاتی اعتبار سے دو زمروں میں رکھا جا سکتا ہے۔ پہلا زمرہ وہ جس میں شاعرہ بحیثیت فرد، سماج، سیاست کی نیرنگیاں دیکھتی ہیں۔ دوسرے زمرے میں خود ان کے ذاتی تجربات شامل ہیں۔

''شرارِ جستہ'' اور ''نظمیں ہماریاں'' کی نظمیں اور ہی زیادہ وسعت اور گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ اس میں شامل نظموں کے موضوعات میں جدت ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تانیثی مسائل کے ساتھ ساتھ شہناز نبی نے

ایک اہم موضوع کو نظر میں رکھا اور ماحولیاتی آلودگی جیسے ایک بڑے مسئلے کی طرف ہماری توجہ مرکوز کرانے کی کوشش کی ہے۔ شہناز نبی کی نظموں کو، میں نے مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جو درج ذیل ہیں:

عشقیہ موضوعات:

شاعر یا ادیب کی زندگی میں اس کی ذاتی یا نجی زندگی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ شہناز نبی کی نظموں میں بھی ایک ایسی لڑکی کی تصویر ابھرتی ہے جو حسن اتفاق سے زندگی کے کسی موڑ پر ایک خوبصورت حادثے کا شکار ہو جاتی ہے لیکن یہ حادثہ اور چاہتیں اسے راس نہیں آتی اور قربتیں دوریوں میں بدل جاتی ہیں۔ وقت زخم تو مندمل کر دیتا ہے لیکن وہ زخم ابدی داغ چھوڑ جاتا ہے اور باوجود اپنی کوششوں کے وہ زندگی سے ماضی کی یادوں کو فراموش نہیں کر پائی ہے۔ بدلتے موسم اسے کبھی محبوب کی یاد دلاتے ہے، کبھی وہ ہجرت کے کرب سے بے چین ہو جاتی ہے تو کبھی تصور میں ہی وصل کی دنیا سجاتی ہے۔ کبھی وہ خود سے لڑتی ہے، جھگڑتی ہے، اپنے محبوب کی واپسی کی راہ دیکھتی ہے، امید اور نا امید کی ڈوروں کو سلجھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

وہی کہرے سے ڈھکی راتیں ہیں
وہی دیوانی ہوا کا آنچل
کچی کلیوں کی ادھ کھلی آنکھیں
نرم بھیگی ہوئی ملائم گھاس
پھر ہے اطراف خوشبوؤں کا ہجوم
آج پھر کوئی یاد آنے لگا ہے
دل تو کہتا رہا کہ ماضی کو
دفن کر کے نجات پانا ہے
پر یہ رشتہ ہے درد کا رشتہ
کیا پتہ کب تلک نبھانا ہے
وہ جو چاہے تو آ بھی سکتا ہے
میری تنہائیوں کے جنگل کو

تنکا تنکا جلا بھی سکتا ہے
روشنی کا سفر وہ طے تو کرے!
(درد کا رشتہ، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 4

ایک اور نظم میں وہ اپنے محبوب کو واپس آنے کے لیے اصرار کرتی نظر آتی ہیں:

ابھی لکڑی کے کوئلہ بننے میں کچھ وقت باقی ہے
ابھی ان کتلوں کے روپا ہونے میں کچھ عرصہ
ابھی تک ہجر کے تپ میں پھنکتے ہیں رگ وریشے
ابھی تک جسم میں روح اور آنکھوں میں ہے جاں باقی
ابھی کا گا چن چن کھانے کی نوبت نہیں آئی
اگر تم آسکو تو آ بھی جاؤ اب
کہ اس مصروف دنیا میں
کوئی بھی انتظار اتنا
کسی کا کر نہیں سکتا
(اگر تم آسکو تو۔۔۔اگلے پڑاؤ سے پہلے) 5

شہناز نبی کی نظموں میں وصل کی کیفیت کم اور تنہائی کی کیفیت زیادہ نظر آتی ہے۔اپنی تنہائی کو محبوب کی یاد سے آباد کرنے کے بعد بھی وہ ایک طرح کا خالی پن محسوس کرتی ہیں۔کبھی وہ محبوب کی یاد میں بے بس دکھائی دیتی ہیں تو کبھی ان یادوں سے نظریں چرا کر دل کو بہلانے کی کوشش کرتی ہیں۔جیسے نظم ''کوئی اتنا یاد نہ آئے'' میں ان کی بے بسی دیکھی جا سکتی ہے:

کوئی اتنا یاد نہ آئے
کہ تارے مرجھا جائیں
کہ چاند بھی سنولا جائے
آکاش لگے مٹھی بھر
اک شاخ نہ سر سے کھیلے

اک پھول نہ منھ سے بولے
گم صم سا لگے ہر منظر
کوئی اتنا یاد نہ آئے
کہ سورج گہنا جائے
کہ دھرتی پتھرا جائے
کہ شام بھی رستہ بھولے
کہ ہاتھ سے برتن چھوٹے
کہ آنکھ نہ جھپکے اک پل
کہ آگ پکڑ لے آنچل
کوئی اتنا یاد نہ آئے

(کوئی اتنا یاد نہ آئے۔۔۔اگلے پڑاؤ سے پہلے) 6

اس نظم میں محبوب کی یاد میں ان کی بے بسی اور لاچارگی انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو وہیں دوسری نظم میں وہ ان یادوں سے پیچھا چھڑانے کی بھی کوشش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں:

تیری یاد کے چھوٹے موٹے
ننھے منے پرزے کر کے
لمحوں کی ردی میں ڈالا
انجانی سی اک خواہش
ان دیکھا سا اک سپنا
ان بوجھی اک اک پہیلی
گٹھری باندھ کے ہم نے رکھ دی
ایک دیا جلتا تھا کب سے
تیز ہوا میں اس کو رکھا
بارش نے بھی ہنس کر دیکھا
کیسے کیسے اسے ستایا

آخر آخر اسے بجھایا
جب تک کل کا سورج نکلے
کھیل کھیل میں دل تو بہلے

(کھیل، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 7

اسی طرح کبھی وہ بے بس ہوتی ہیں تو کبھی خود کو سنبھالتی ہیں، کبھی خود سے ہی لڑنے لگتی ہیں لیکن پھر بھی محبوب کی یادیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ کبھی تھک کر وہ ہجر میں وصل کے تصوراتی لمحوں کو یاد کر کے خوش ہوتی ہیں۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ان کو اپنے محبوب پر بھروسہ ہے کہ وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے اور کبھی نہ کبھی ضرور واپس لوٹ کر آئے گا۔ نظم ''یقیں ہے مجھ کو'' میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایسی بے شمار نظمیں ہیں جن میں ان کی دلی کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ اگر چہ ان کا محبوب ان کو دغا دے کر چلا جاتا ہے پھر بھی وہ اس کو یاد کر کے خوش ہوتی ہیں اور اس یاد کو ہی اپنی نجات مانتی ہیں۔ محبوب کے ساتھ گزرے حسین لمحات کو اپنے دل و دماغ میں قید کر لینا چاہتی ہیں اور اسے زندگی بھر اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہیں۔ نظم ''تم، میں اور وہ'' ملاحظہ ہوں:

میں وہ ساری جگہیں دیکھنا چاہتی ہوں
جنہیں تمہاری موجودگی نے مرتعش کر دیا
میں ان تمام راستوں سے گزرنا چاہتی ہوں
جن پر تمہارے قدموں نے منزلیں تراشیں
میں ان ہواؤں کو پینا چاہتی ہوں
جنہیں تمہاری خوشبو نے سیراب کیا
میں وہ ساری کتابیں پڑھنا چاہتی ہوں
جن کے حروف تمہارے مطالعے سے روشن ہیں
میں ان ساری چیزوں کو چھونا چاہتی ہوں
جنہیں تمہارے لمس نے جاوداں کر دیا

(تم، میں اور وہ۔۔۔پس دیوار گریہ) 8

ایک اور نظم ''ریفارمیٹری'' میں وہ کہتی ہیں:

تمہاری محبت کی اس ریفارمیٹری میں
تمہارے بغیر
تمہارے ساتھ جینے میں کتنا سکھ ہے
میں نہیں جانتی موکش کیا ہے
لیکن یہ جانے بغیر
کہ تم مجھے سوچتے بھی ہو یا نہیں
تمہیں سوچتے جانے میں میری نجات ہے

(ریفارمیٹری، پس دیوار گریہ) 9

ایک طرف وہ محبوب کی یاد کو ہی اپنی زندگی کا کل سرمایہ سمجھتی ہیں تو وہیں دوسری طرف اس کے اتنا یاد آنے پر وہ خود سے ناراض بھی ہو جاتی ہیں:

بہت ناراض ہوں خود سے
نہ جانے کتنے برسوں میں
ریاضت کر کے اس دل نے
بڑی مشکل سے سیکھا تھا
ہوا کی دستکوں پہ اپنے دروازے کو بند رکھنا
یہ شاید اک دریچے کی شرارت کا یہ خمیازہ
لویں سب جھلملا اٹھیں
کہ پھر فانوس پگھلا
کہیں پر اب اندھیرے کا نہیں ایک بھی ریزہ
بہت ناراض ہوں خود سے

(بہت ناراض ہوں خود سے، پس دیوار گریہ) 10

ہجر کے درد کو برداشت کر کے وہ ٹوٹ بھی جاتی ہیں اور اسی غم وغصہ کی حالت میں محبوب کی بے وفائی کا ذکر بھی ان کے زبان پر آجاتا ہے لیکن یہ دیر پا نہیں رہتا اور وہ پھر دوبارہ سے اس کی یادوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ خود کو دلاسہ بھی دیتی ہیں کہ وہ نہیں ملا تو کیا ہوا، مجھے تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں میں اس کی یادوں کے سہارے جی لوں گی۔

عشقیہ موضوعات کے تعلق سے جو بات ان کو دوسری شاعرات سے منفرد کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کمزور لمحوں میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں اور نہ ہی اوروں کی طرح آہ وفریاد کرتی ہیں۔محبوب سے واپسی کا اظہار بھی وہ نہایت ہی سلیقے سے کرتی ہیں کہیں بھی خود کو کمتر ثابت نہیں کرتیں۔

شہناز نبی کے یہاں ماں سے محبت کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔انہوں نے کئی نظموں میں ماں کو موضوع بنایا ہے اور اس سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔ان نظموں میں وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ دنیا میں کتنی ہی نعمتیں کیوں نہ حاصل ہو جائیں لیکن ماں کی ممتا کی ضرورت انسان کو ہر عمر میں محسوس ہوتی ہے اس لیے عمر کے اس حصے میں وہ ماں کی محبت کی تمنائی ہیں۔نظم ''قرض'' ملاحظہ ہوں:

ان دنوں کو ترستا ہے دل
جب کہ نیندوں سے تھا سلسلہ رات کا
جب سرِ شام ہنستے تھے سپنے تھے
دن کی ساری تھکن
گھر کی دہلیز پر ہی اتر جاتی تھی
جب گھنی بارشوں میں کہیں
جھریوں سے بھرے ہاتھ چھتری لیے
رہتے تھے منتظر موڑ پر
صبح دم وہ تلاوت
وہ یٰسین کا ورد
چائے کی خوشبو
کھنک چوڑیوں کی
وہ بوڑھی نگاہیں
میرے واسطے تھیں ستاروں سی روشن
وہ آنچل میں کچھ مصالحوں کی خوشبو
وہ اک ناتواں جسم کی گود کا لمس

ابھری ہوئی ہڈیوں کی چبھن

(قرض، پس دیوار گریہ) 11

اس پوری نظم میں شہناز نبی ایک معصوم اور گم شدہ بچی کی طرح نظر آتی ہیں جو ماں کے آنچل کی خوشبو اور اس کی باتوں کی مٹھاس کی متلاشی نظر آتی ہے۔

عشقیہ موضوعات کے تعلق سے ہمیں شہناز نبی کے یہاں تضاد ملتا ہے۔ ایک طرف وہ ہجر کے کرب سے بے چین دکھائی دیتی ہیں، تو دوسری طرف محبوب سے دوبارہ وصل کی تمنائی بھی۔ ایک طرف محبوب کی بے وفائی کا ذکر کرتی ہیں تو کہیں کہیں اس کے واپس آنے کی آس لگا کر بیٹھی ہیں۔ کبھی محبوب کی یادوں کو ہی اپنی زندگی کی نجات مانتی ہیں تو کبھی اس سے نجات پانا چاہتی ہیں۔ ایسا اس لیے کہ وہ محبت میں انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ انھیں کسی ایک راستے کو چننا بڑا ہی دشوار لگ رہا ہے۔ اگر چہ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ تنہائی میں گزارا پھر بھی جدائی کے کرب کے باوجود ان کے یہاں حوصلوں میں کمی نظر نہیں آتی ہے۔

وجودیت کا مسئلہ:

تخلیق کار اگر اپنی تخلیق کے اندر سانس لیتا رہے تو اس کی تخلیق جگ بیتی ہوتے ہوئے بھی آپ بیتی کا احساس دلاتی ہے۔ شہناز نبی کی شاعری میں یہی رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جا بجا اپنے وجود کے مسئلے کو موضوع بنایا ہے، چاہے وہ مسئلہ محبت کا ہو یا سماج کا یا محبوب کی بے وفائی کا ہی کیوں نہ ہو، انہیں اپنی زندگی اور اس سے جڑے مسائل میں کسی کا عمل دخل برداشت نہیں ہے۔ ان نظموں کے آئینے میں وہ اپنے وجود کو اثبات اور انا کو اعتبار بخشتی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ملاحظہ ہوں:

میرا کل اگر میرے پیچھے آنا چاہتا ہے تو آئے
اس کی مرضی
مگر مجھ سے مڑ کے دیکھنے کو نہ کہے
میرا آج اگر میرے ساتھ چلنا چاہتا ہے
تو چلے
اس کی مرضی

مگر مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کرے
میرا کل اگر مجھ سے آگے نکلنا چاہتا ہے
تو اس کی مرضی
مگر مجھے اپنے قدموں کے نقوش اپنانے کو نہ کہے
میرے آگے پیچھے دائیں بائیں
کل، آج اور کل بکھرے پڑے ہیں
میں ان سے بولوں یا چپ رہوں
ساتھ چلوں یا کترا کے گزر جاؤں
میری مرضی۔!

(اپنے لیے ایک دن۔اگلے پڑاؤ سے پہلے) 12ہ

کہیں کہیں جب وہ اپنی ذات کی ٹوٹ پھوٹ پر گفتگو کرتی ہیں تو اس میں بھی حوصلہ اور عزم کی آہنی دیوار نظر آتی ہے۔جب کہ بالعموم دوسری عورتیں ایسے حالات میں خود کو بے سمت اور سماج کے سامنے مجبور اور مظلوم ظاہر کرتی ہیں لیکن اس کے برعکس شہناز نبی کے یہاں نہ خوف نظر آتا ہے اور نہ ہی دہشت، وہ اکیلے ہی سارے حالات کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتی ہوئی نظر آتی ہیں اور ان کو ایسی ہی طرز زندگی پسند ہے۔رونے، گانے، ہنسنے اپنی کسی بھی قول وفعل میں کسی کے دخل اندازی نہیں چاہتی ہیں۔ان کی نظم ''در مدح خانۂ خود'' اس کی مثال ہے۔وہ اکیلے ہی خوش ہیں اپنی زندگی سے نظم پیش کی ہے۔ملاحظہ ہوں:

چلو مانا خود ساختہ ہے زنداں
مگر کیا بتاؤں کہ کتنا سکوں ہے
تمہیں کچھ خبر ہے کہ یہ حبس بے جا
مجھے کیسی سانسیں عطا کر رہا ہے
میرے پاؤں میں میری ہی بیڑیاں ہیں
یہاں آہ وشیون پہ قدغن نہیں ہے
یہ روشن سویروں کا مدفن نہیں ہے
رہوں سر بہ زانو کہ چیخوں پکاروں

میں جب چاہوں آکاش اس میں اتاروں
پروں کو پساروں
کہیں کوئی در، کوئی روزن بناؤں
میں آشفتہ سر ہوں یہ مجھ کو پتہ ہے
مرے واسطے میرا زنداں کھلا ہے
مگر میرے جانے سے مجھ پہ کھلا ہے

(در مدح خانۂ خود، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 13؎

شہناز نبی اپنے گھر اور آنگن کو خود سے سجاتی ہیں، بگاڑتی ہیں۔انھیں اس کے لیے کسی اور کی مرضی یا اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود کے لیے سجاتی ہیں، کسی کے آنے یا نہ آنے سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔جیسے:

کوئی آئے نہ آئے
میں یونہی ہر دن
سجا دیتی ہوں گل دانوں میں
تازہ پھولوں کا دستہ
کتابیں شیلف میں چن کر
پلٹتی ہوں کلنڈر کا صفحہ
پانی بدلتی ہوں صراحی کا
کوئی سلوٹ نہیں بستر پہ
نہ آئینہ میلا ہے
ہر اک شئے جگمگاتی ہے
عجب گھر میں سلیقہ ہے
کوئی آئے
نہ آئے۔۔۔!

(کوئی آئے نہ آئے، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 14؎

شہناز نبی جب اپنی ذات کوموضوع بناتی ہیں تو اس میں خود کلامی کی کیفیت در آتی ہے۔ یہ کیفیت وجود کی شناخت ہے۔ان کی شاعری میں ذات کا مسئلہ،انا،خود پرستی اس کا بین ثبوت ہے۔ وہ تمام رشتوں کے بندھن سے بھی آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔نظم ''تضاد'' اس کی مثال ہے:

کتنا عجیب اور انوکھا ہے رشتوں کا یہ تجربہ
جن کے سامنے میرے سارے زخم کھلے رکھے ہیں
میں انہیں اس کی اجازت نہیں دیتی
کہ وہ ان پر پھاہیں رکھیں
جو میرے آئینوں پر پڑی خراشوں کو
حیرت اور افسوس کے ساتھ تکتے ہیں
میں ان کے ہاتھ گرد میں اٹنے نہیں دیتی
میں نہیں چاہتی کہ جن کے سامنے میں اپنے مسئلے رکھتی ہوں
وہ ان کا حل بھی ڈھونڈیں
گھنے پیڑوں جیسے مہربان اور سایہ دار لوگ اس لئے نہیں ہوتے
کہ ان کی چھاؤں چرا کر
اپنی بے رِدائی کی شرمندگی مٹائی جائے
میں ان سے اپنے مسئلوں کا حل مانگتی ہوں
جنہوں نے اپنے سوا کبھی کسی کے بارے میں سوچا نہیں
ان کے شانے پر سر رکھ کر خوش آئند دنوں کے خواب بنتی ہوں
جن کے روز و شب خود ان کی گرفت سے باہر ہیں
میں ٹوٹ جانے والے رشتوں میں بندھنے کی بے پناہ تمنائی ہوں
اور باندھنے والے سارے رشتوں سے آزاد رہنے کی شدید خواہش مند

(تضاد، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 15؎

کہیں کہیں تو ان کی یہ رشتوں کی بندھن سے آزادی کی آرزو شدت اختیار کر لیتی ہے نظم ''پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم'' ان کے ان ہی جذبات کی عکاسی کرتی ہے:۔

یہ جی چاہتا ہے
کسی دن کسی کو بتائے بنا
میں نکل جاؤں چپ چاپ تنہا سفر پر
اکیلے اکیلے بھٹکتی پھروں شہر شہر
مجھکو نہ پہچانے کوئی
مرے کیس الجھے ہوئے ہوں
کہ پلو مرا لوٹتا ہوں زمیں پر
کہ ٹوٹی ہو چپل
کہ میلے ہوں ناخون
کہ آنکھوں میں وحشت
کہ سانسوں میں الجھن
جہاں کوئی میرا نام لے کر نہ ہرگز پکارے
یا پاس آ کر کبھی یہ نہ پوچھے
تمہیں کیا ہوا ہے؟

(پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 16؂

شہناز نبی کی اس نظم کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے قاضی جمال حسین لکھتے ہیں:۔

''شہناز نبی کی مختصر سی نظم ''پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم'' اپنی بیرونی ساخت اور داخلی فضا کے اعتبار سے ایک نمائندہ اور معاصر نظم ہے۔ معنیاتی سطح پر نظم نگار خیال کی اکائیوں کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ نظم کے اختتام پر احساس اور خیال کے تمام واحد (unit) ایک کل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔'' 17؂

عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ محبوب کی بے وفائی اور ہرجائی پن سے عورت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے وہ آہ و فغاں کرتی ہے لیکن شہناز نبی کے یہاں یہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ عام طور سے روایتی عورتوں کی روش پہ نہ چل کر زندگی کو اپنے طور سے جینے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں عشق میں بھی اپنی ذات کا تشخص قائم رہتا ہے۔ وہ محبوب کی یاد میں ٹوٹتی نہیں ہیں اور نہ ہی یاس و نا امیدی کا شکار ہوتی ہیں بلکہ اپنے وجود کی شناخت اور تشخص کو برقرار

رکھنے کے لیے وہ محبوب کے توقعات کے الٹ ہمت وحوصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی کو اپنے طور سے جی کر اس کو حیرت میں ڈالنے کا عزم بھی رکھتی ہیں۔مثال دیکھیے:۔

تم نے یہی سوچا شاید
ہر شام مرا دل روئے گا
تاریک دریچے پہ ٹک کر
میں رستہ تک تک ہاروں گی
ہر آہٹ پہ دل مچلے گا
راتیں ہوں گی بے خواب بہت
چھت کی کڑیوں سے الجھوں گی
بے بات میں بہت رووَں گی
لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا
اس دل نے کہا کہ جانے دو
بے مہر تھا وہ، آوارہ سا
ایک جھونکا شامِ زمستاں کا
جو دھونی کہیں رماتا ہے
سچا جوگی کہلاتا ہے
ایسوں کے لیے دل کھونا کیا
چلو چائے پیو
ٹی وی دیکھو
کچھ الٹ پلٹ کے میرؔ پڑھو
کچھ فون پہ گپ شپ بھی کرلو
ذرا واٹس ایپ ہو یا ٹوئٹر ہو
یا فیس بک پہ چیٹ کرو
یا شعر کہو

پھر سو جاؤ
کل صبح سویرے اٹھنا ہے
اور کام پہ بھی تو جانا ہے

(علاوہ ازیں، نظمیں ہماریاں) 18؎

شہناز نبی اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا بنانے کی تمنائی نظر آتی ہیں جہاں اپنی مرضی اور اپنے قوت بازو کے زور سے وقت کے بہاؤ سے مقابلہ کر سکیں۔ وہ کسی بھی طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہیں انھیں اس کے لیے نہ کسی کی ضرورت ہے اور نہ ہی ایسی کوئی خواہش۔ نظم ''مجھے ایک مٹھی ریت چاہیے'' میں وہ بذات خود ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں۔ نظم ملاحظہ ہوں:

مجھے ایک مٹھی ریت چاہیے
تاکہ میں اس سے ایک پورا صحرا تیار کر سکوں
اور اپنے جنون کی انتہا کو ناپ سکوں
مجھے ایک مٹھی ریت چاہیے
تاکہ میں وقت کے پھسلنے کے احساس کو پا سکوں
صبح سے شام
رات سے دن
اپنے وجود کو پانے کا سفر طے کر سکوں
اپنی تلاش میں خود کو کھو سکوں
مجھے ایک مٹھی ریت چاہیے
تاکہ میں اس سے ایسا سراب گڑھ سکوں
جو میری پیاس کو بھڑکاتا رہے
مجھے منزلیں سر کرواتا رہے
میں اس سراب کے کنارے
ایک چھوٹا سا گھر آنکنا چاہتی ہوں
سراب کے سینے میں

کاغذ کی ایک ناؤں اتارنا چاہتی ہوں
مجھے ایک مٹھی ریت چاہیے
تاکہ میں ایسا طوفان اٹھاؤں
جو صحراؤں کی شکل بدل دیتا ہے

(شرارِ جستہ) 19

''میں بہت جلدی میں ہوں''، ''مجھے تھوڑی سی مہلت تو دو''، ''کبھی یہ سوچتی ہوں'' اسی قبیل کی نظمیں ہیں جس میں وہ اکیلے ہی سب کچھ کر لینے کا حوصلہ رکھتی ہے اور اپنے وجود کو اعتبار بخشتی ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شہناز نبی نے اپنی شاعری کے فریم میں وجود کو اعتبار بخشنے اور اسے توانا کرنے کے لیے عزائم کا سہارا لیا ہے اور خود کو قائم ودائم رکھا ہے۔

تانیثی مسائل:

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں جن جن موضوعات و مسائل کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے اس میں تانیثی مسائل سب سے اہم ہے۔ موجودہ صورتحال میں دفتر، گھر اور خاندان میں تقسیم عورت کس اذیت ناک کرب سے گزرتی ہے انھوں نے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک جو مسئلہ اہم ہے وہ ہے عورت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا اور اس کی شخصی آزادی پر قدغن لگانا ہے۔ عورت کو سماج میں تحقیر آمیز رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ان سے نالاں نظر آتی ہیں اور اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہیں اور مرد وعورت کی تفریق پر سوال کرتی ہیں:

تم بھی مٹی
میں بھی مٹی
خاک ملی اور خاک ہوئی
مٹی مٹی پاک ہوئی
کبھی ہو دشمن
کبھی رفیق

تم ہی لاہو
تم ہی شریک
مٹی مٹی۔۔۔جنگل سی
یا پھر، بس ایک دلدل سی
کھیت بنے گلزار ہوئے
کبھی تو ہم بازار ہوئے
مٹی اور مٹی کا گھر
مٹی کو مٹی کا ڈر
تم بھی مٹی
میں بھی مٹی
تم کورے میں جھوٹی کیوں
تم سونا میں کھوٹی کیوں
مٹی، مٹی میں ہے پاک
مٹی کی بس ایک ہے ذات

(مٹی + مٹی = مٹی، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 20؎

عورت کو کم تر اور حقیر سمجھنے والوں سے وہ طنزیہ انداز میں کہتی ہیں کہ اب وہ ہمیں بے وقوف بنانا چھوڑ دیں۔ ''معصوم بھیڑیں'' میں علامتی انداز میں مردوں کے اس جارحانہ اقدام کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن سے عورت کی ذات مجروح ہوتی ہے۔

اک چراگاہ سو چراگاہیں
کون ان ریوڑوں سے گھبرائے
پڑ گئیں کم زمینیں اپنی تو
کچھ سفر کچھ حضر کا شغل رہے
کچھ نئی بستیوں سے ربط بڑھے
ان کو آزاد کون کرتا ہے

یہ بہت مطمئن ہیں تھوڑے میں
اک ذرا سا گھما پھرا لاؤ
کچھ ادھر کچھ ادھر چرا لاؤ
بھیڑیں معصوم سی
بے ضرر سی ہیں
جس طرح ہانک دو
چلی جائیں

(معصوم بھیڑیں، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 21ے

وہ عورتوں کے مساویانہ حقوق کے لیے آواز اٹھاتی ہیں، ساتھ ہی عورت کے لیے ہر طرح کی آزادی چاہتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی عورت اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتی ہے تو اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شہناز نبی نے عورت کے اس مسئلے کو موضوع بنایا ہے اور مردوں کے جابرانہ ظلم پر بھی طنز کرتی ہیں۔ نظم ''کالے بھنوروں کی دنیا'' ملاحظہ ہوں:

اڑتی جاتی ہے اک تتلی
رنگ برنگی
نٹ کھٹ چنچل
اس کو پکڑو
ذرا دبوچو
الگ الگ پر کر دو اس کے
زخمی کر دو تن من ایسے
گھاؤ کبھی نہ بھرنے پائیں
اڑے اگر تو ڈری ڈری سی
پھول پہ ڈولے سہم سہم کر
کالے بھنوروں کی دنیا میں
تتلی کی بے باک اڑانیں

سہن نہ ہوں گی

سہن نہ ہو گی

(کالے بھنوروں کی دنیا، شرارِ جستہ) 22؎

صدیوں سے عورت پر ظلم ہوتے آئے ہیں اور وہ خاموشی کے ساتھ اس جبر کو سہتی رہی ہے لیکن اب عورت محض مردوں کی غلام بن کر نہیں رہ سکتی، وہ اپنے حقوق کے لیے جاگ گئی ہے گوکہ آج بھی اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ان کی یہ کوششیں ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ شہناز نبی اس موضوع پر نظم ''بھول'' کچھ ایسے تخلیق کرتی ہیں:

جس نے مجھے لوہے کے جوتے پہنائے\
وہ سر کی گرفت کرنا بھول گیا تھا\
مجھے اس کا غم نہیں کہ آلات حرب کے بغیر\
لڑنا تھا ہر پل\
وار بچانا پڑا ڈھال نہ ہوتے ہوئے بھی\
بیک وقت پیادہ اور سوار\
زمین سخت تھی\
گھوڑا منھ زور\
مگر میدان مارنے کا جنون\
قلعے پر کارزار کی فوقیت کا قائل تھا\
زمین لہو سے گندھ کر نرم ہو گئی\
مرکب وقت بے بس\
جب تک فتح کا پرچم لہرائے گا\
تب تلک نئی جوتیاں تلاش کر لی جائیں گی\
لیکن سر کو قید نہ کرنے کی بھول سرزد ہوتی رہے گی

(بھول، پس دیوار گریہ) 23؎

جب دنیا قائم ہوئی تو اللہ نے آدمؑ اور حوا کو گناہ کے پاداش میں زمین پر بھیجا۔ تب سے عورتوں سے یہ

بات منسلک ہوگئی کہ آدمؑ، حوا کے بہکاوے میں آکر یہ گناہ سرزد کیے تھے۔شہناز نبی نے اس بات کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ گناہوں کی سزا صرف آدمؑ کے بیٹے ہی نہیں بلکہ حوا کی بیٹیاں بھی جھیل رہی ہیں۔

سرکشی کی سزا تمہیں ہی نہیں
مجھ کو بھی مل رہی ہے ہر لمحہ
میں بھی ہر صبح تھکن کی پرتوں کو
بازوؤں سے جھٹک کے اٹھتی ہوں
بال و پر میں اُڑان بھرتی ہوں
دن ڈھلے تک تلاش گندم میں
اگلے دن کی تھکن جٹاتی ہوں
جانے پازیب کس دراز میں ہے
جانے کنگن کہاں پہ رکھا ہے
میرے بے فکر قہقہوں کا سرا
کون جانے کہاں پہ چھوٹا ہے
اب تو فردوس گم شدہ کی کسک
بھول کر بھی کہاں ستاتی ہے
ہاں، وہ اک آتش ازل مجھ کو
لمحہ لمحہ جلائے جاتی ہے۔۔۔

(جرمانہ، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 24

ایک اور نظم ''کالی کھیتر''، میں بھی وہ عورتوں کے مساوی حقوق کے لیے آواز اٹھاتی ہیں:

اگر وہ چکر وشنو کا
نہ چلتا تو غضب ایسا بھی کیا ہوتا
یہی ہوتا کہ یہ دنیا
زمیں تا آسماں زیروزبر ہوتی

مگر اک وحشیانہ رقص پہ قدغن ضروری تھا
سو وشنو نے چلایا چکر
اک ٹکڑا ستی کا اس طرح
نورانی پاکیزہ
اگر اس شہر کی بنیاد نہ پڑتی تو کیا ہوتا
یہاں یوں بھی
بسیرا اژدہوں اور کژدموں کا ہی ہوا ہوتا
مثلث پہلے جیسا ہے
برہما
وشنو
اور مہادیو
اپنے اپنے نقطوں پہ
ستی لیکن
بھٹکتی پھرتی ہے
مرکز سے اپنے دور
چاروں سمت بڑھتی جاتی ہے گنتی اسوروں کی
(کالی کھیتر۔۔۔پس دیوار گریہ) 25؎

شہناز نبی نہ صرف سماج میں ہی عورتوں کے مساوی حقوق کی بات کرتی ہیں بلکہ وہ جذباتی طور پر بھی مساویانہ حقوق کی قائل نظر آتی ہیں۔ مرد اور عورت کے رشتے میں بھی وہ عورت کے مساوی حقوق کی بات کرتی ہیں اس کی مثال نظم ''تمہاری جگہ'' ہے، ملاحظہ ہوں:

میرے دل میں تمہارے لیے
جہاں جتنی جگہ تھی
وہاں اتنی اب بھی ہے
یقیں ڈگمگاتا نہیں

چاہے تیرہ و تار سمندر مجھے نگل لے
چاہے بے آب و گیاہ صحرا نچوڑ لے
میں مفارقت کے راستے تلاش لیتی ہوں
تم میرے قدموں کے نیچے نئے راستے بچھا دیتے ہو
مجھ کو قریب لانے کے لیے
اس کھینچا تانی میں کبھی تم آدھے رہ جاتے ہو کبھی میں
اور ہم دونوں آدھے آدھے
کہیں ایک دوسرے کو مکمل بھی کرتے ہیں
نہ خدا ہونا جرم ہے
نہ بندہ ہونا گناہ
پھر ہمارے بیچ یہ بے انتہا فاصلے
یہ لامحدود تنہائیاں کیوں
کیا ہی اچھا ہو
اگر ایک پل کے لیے بھول جاؤ
کہ تم خدا ہو

(تمھاری جگہ۔۔۔شرار جستہ) 26؎

انھوں نے عورتوں کے متعلق سماج میں پھیلے برے رسم و رواج کے خلاف احتجاج کیا ہے کہ کس طرح ان روایتوں کے نام پر سماج میں عورتوں پر ظلم ہوتا ہے۔ وہ پدرانہ نظام کے خلاف بھی آواز اٹھاتی ہیں۔ان کے یہاں سماج میں رائج اصول سے انحراف اور مساوی حقوق کا جذبہ اس نظم میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جو ہیں زیب بستر
انہیں زینتِ تاج کا مرتبہ کیا
مویشی کے باڑے میں ایک نرہی کافی
سورگ پانے کا راستہ مختصر ہے
یہ املاک ان کے تصرف میں کب تک

کہ زرزور کے بن سنبھلتا نہیں ہے
کبھی کچھ لکیریں
کبھی ایک دھوبی
کبھی کوئی پانسہ
کبھی ایک انگوٹھی
یہ بھٹکن نہ جانے کہاں لے کے جائے
سفر پاؤں سے اب تو لپٹا ہے ایسے
کہ جھانجھر کھلے تو کھلے
راستے پاؤں ہرگز نہ چھوڑیں
کچھ افواہیں اب بھی تو کرتی ہیں پیچھا
کہ زنجیریں اب بھی لپکتی ہیں اکثر
کہیں اگنی کنڈ اب بھی روشن پڑے ہیں
کہیں کچھ چِتائیں بھی تکتی ہیں رستہ
سنوار دھنا ریشور
بس بہت ہو چکا
میں اب اپنا آدھا سراپا لیے
بھٹکتی رہوں گی ابد تا ابد

(دل کی ضمانت، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 27

شہناز نبی نے سماج میں پنپ رہے مردوں کے منافقانہ رویوں کو بہت ہی سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اس میں ان کے باطن میں پنپ رہے دکھ کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، جو عورتوں کے لیے ہے۔ وہ مردوں سے شکایت کرتی ہیں کہ وہ عورتوں کو ان کا حق دینے کا ڈھونگ کرتے ہیں، محض دکھاوے کے لیے، نظم پیش ہے:

نہیں کوئی جادوگری یہ نہیں
معجزہ بھی نہیں
تم جو چاہو کرامات کہہ لو اسے

پر مرے واسطے روز کا کھیل ہے
ایک بے حسن بدن کو ہر اک صبح بنا تم کہے
زندگی سے لبالب اٹھانا
اندھیروں سے آنکھیں ملانے کی شکتی
زمیں کی تہوں سے الجھنے کے تیور
نکیروں سے تکرار کرنے کی ہمت
اک اک کر کے زنبیل میں اس کے رکھنا
اسے اس کے ہی مقبرے کی سیاحت پہ کرانا روزانہ
سر شام جب لوٹ کر آئے تو اس سے اس کے لیے
تا دم نیم شب نوحے در نوحے لکھوانا
سننا۔۔۔رلانا۔۔۔سنانا
کہ پھر جاگنے پر وہی کھیل جاری رہے

(کھیل جاری ہے، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 28؎

پدرانہ نظام میں عورتوں کو جائداد میں حق نہ ملنا بھی ایک سماجی مسئلہ بن گیا ہے۔ اگر عورتیں اس کے لیے آواز بھی اٹھاتی ہیں تو ان کو گھر سے باہر کر دیا جاتا ہے، سارے رشتے ناطے ختم کر لیے جاتے ہیں۔ شہناز نبی نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور اس مسئلے کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''ساتویں شہزادی کا قصہ'' ملاحظہ ہوں:

میرا قصور صرف اتنا ہے
کہ میں نے اپنے باپ سے کہا تھا
میں اپنی قسمت کا کھاتی ہوں
اور تب سے اب تک
خونخوار درندوں سے بھرے جنگل میں
تنہا بھٹک رہی ہوں

(ساتویں شہزادی کا قصہ، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 29؎

شہناز نبی نے عورتوں کے مسائل میں جنسی تشدد کو بھی موضوع بنایا ہے۔ عہد حاضر میں بھی درندہ صفت مرد عورت کو ہوس کا شکار بناتے ہیں اور ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ عورتوں کی یہ حالت ان سے برداشت نہیں ہوتی اور وہ نظم ''کتنا پانی'' کی تخلیق کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں:

ہرا سمندر
دھوبی چندر
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
باہوں کے گھیرے میں ساتھی
پوچھ رہے ہیں باری باری
بول مری مچھلی کتنا پانی؟
پہلے ٹخنوں تک دکھلایا
اتنا پانی
اتنا پانی
پھر پانی گھٹنوں تک آیا
اتنا پانی
اتنا پانی
کمر کمر تک ڈوب گئی میں
پانی کندھوں تک چڑھ آیا
جان رہے ہیں سارے ساتھی
سر سے اوپر ہوگا پانی
سر سے دکھلائے ہی یکدم
کھو گئی مچھلی، شور اٹھے گا
بندھے ہوئے سب ہاتھ کھلیں گے
ہر ساتھی پانی میں ہوگا
ہرے سمندر میں ڈھونڈیں گے

تنہا تنہا لہروں پر میں
ڈھونڈ رہی ہوں سنگی ساتھی
کوئی نہ پوچھے
کوئی نہ جانے
کتنا پانی؟
کتنا پانی؟

(کتنا پانی۔۔۔اگلے پڑاؤ سے پہلے) 30

نظم ''المیہ''، ''بے شرمی'' وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔جس میں انہوں نے جنسی تشدد کو موضوع بنایا ہے۔

شہناز نبی عورتوں کے حقوق کے لیے بے حد فکر مند نظر آتی ہیں۔ان کو عورتوں حق تلفی برداشت نہیں عورتوں کو مساویانہ حقوق، سماجی ہو یا سیاسی حاصل کروانے کے حق میں نظر آتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی جو عورتوں کو ان کے حقوق دینے کے بیچ مسئلہ پیدا کرتے ہیں، وہ ان سے سوال کرتی ہیں اور اس وقت ان کا لہجہ نہایت گرم اور غصے سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔وہ نظم ''ہیلوسینشن'' میں ایسے ہی سوالات کرتی ہیں۔نظم ملاحظہ ہوں:

یہ دنیا بہت تیز رفتار ہے
یاں کسی کو کوئی کب بھلا سوچتا ہے
مگر جانے کیوں مجھ کو لگتا ہے ایسا
ہزاروں نگاہیں مجھے گھورتے جاتی ہیں
مجھے ان گنت انگلیوں نے نشانہ بنایا ہے اپنا
فقط میں ہی موضوع ہوں سرگوشیوں کا
کہیں میرے خاطر ہے پھیلا ہوا جال سازشوں کا
میں سارے جہاں کی توجہ کا مرکز بنی ہوں
عجب خوف ہے جس میں گھرنے لگی ہوں
سوالات خود سے میں کرنے لگی ہوں
سبب کیا ہے آخر مجھے گھورنے کا
زمیں میرے پیروں کے نیچے سمٹنے لگی ہے۔؟

سمندر مرے بازوؤں میں سکڑنے لگا ہے۔؟
یا پھر آسماں میری پرواز پر مختصر ہو رہا ہے۔؟
مری ہو سے صحرا کوڈر ہو رہا ہے۔؟
میں موسم بدلنے پر قادر ہوئی ہوں۔؟
بغاوت کا پرچم اٹھائے پھری ہوں۔؟
میرے نقش پا رہگزر بن رہے ہیں؟
میری سوچ دنیا بدلنے چلی ہے؟
میں اذہان نو کی مرتب ہوئی ہوں؟
مرا دوش کیا ہے؟
ملامت بھری نگاہیں
ہر سر گوشیاں، سازشیں، انگلیاں
کیا مرا واہمہ ہیں؟
یہ سچ ہے زمانے کو فرصت نہیں ہے؟

(ہیلوسینشن، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 31؎

یہ سچ ہے کہ ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے، وقت نے بہت کچھ بدلا ہے اگر کچھ نہیں بدلا ہے تو عورتوں کی صورتحال، آج بھی آزاد ملک میں عورتیں جبر وظلم کی شکار ہوتی ہیں۔ شہناز نبی ''بھارت ماتا'' کو مخاطب کر کے اپنے خیالات اس تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں، نظم ملاحظہ ہوں:

میں جب تیرے بیٹوں کے بازار میں
تیرے آنچل کی دھجی کو گنتے ہوئے
ان کی تقصیر کا گوشوارہ لکھوں تو
مجھے معاف کرنا
تو ماں ہے
ترا دل کشادہ ہے
پھیلی ہوئی سرحدوں سے وارہے

مجھے سب پتہ ہے
تیرے دل میں ان کے لیے بھی دعاؤں کا اک سلسلہ ہے
جنہوں نے آج تجھے نیلام گھر میں رکھا ہے
میں جب ایسے بیٹوں کی تعزیر کے واسطے
تختۂ دار کو
ان کی اکڑی ہوئی گردنوں کا پتہ دوں
مجھے معاف کرنا
مجھے معاف کرنا۔۔۔!

(آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 32

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی کا یہ احتجاج پہلے تو ہلکا ہلکا دبے دبے لفظوں میں ہوتا ہے، پھر انقلابانہ ہو جاتا ہے۔ ''پس دیوار گریہ'' میں دبا دبا احتجاج، جس میں شائستگی بھی ہے، یہی ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' میں جارحانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ لہجے میں کاٹ اور زبان دھاردار ہو جاتی ہے، یہ باغیانہ لہجہ دوسری شاعرات کے یہاں کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

محبت اور وفا کے نام پر عورتوں کو دھوکہ اور فریب تو ہمیشہ سے ملتے آئے ہیں لیکن شہناز نبی عورتوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ اب رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں اپنے حق کے لیے جاگنا ہوگا اور اپنی کمزوری کو اپنا ہتھیار بنانا ہوگا۔ وہ عورتوں میں نفسیاتی اعتبار سے انقلاب لانا چاہتی ہیں، نظم ملاحظہ ہوں:

اس سے پہلے کہ پیار کا چہرہ
زرد ہو جائے زندگی کھو کر
اس سے پہلے کہ دوستی کے کنول
خشک ہو جائیں
پھر بکھر جائیں
اس سے پہلے کہ قرب کے لمحے
بوجھ بن جائیں سانس کی صورت

آؤ ہم آج ایک عہد کریں
لذت قرب کی تمنا میں
یوں نہ اپنی حدوں سے گزریں گے
کہ نیا فاصلہ جنم لے لے
بطن سے پہلی اجنبیت کے

(مشورہ، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 33ؔ

ایک اور نظم ملاحظہ ہوں:

تمہاری انا کے جھوٹے جنگلوں میں بھٹکنے کا
کوئی شوق نہیں اسے
اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے جانے کے بعد
تمہاری جوتیاں حکومت کرتی رہیں گی
تو یہ تمہاری حماقت ہے
گھر کی چھاؤں سے رخصت ہوتے وقت
تمہارا دل نہیں رویا
اسے سفاک تنہائی کے ہاتھوں سونپتے ہوئے
تم نے کچھ نہیں سوچا
آگے کوئی وعدہ نہیں تھا مگر تم گئے
پیچھے فرض پڑا تھا لیکن تم نے مڑ کر نہیں دیکھا
اسے نہتا اور کمزور سمجھ کر چھوڑ گئے
تا کہ اپنی بقا کی جنگ لڑتے لڑتے وہ ہار جائے
مرجائے
اور زندہ بچ جائے تو لوٹنے کے بعد تم
چند افواہوں کے حوالے سے
اسے بن باس لینے پر مجبور کر دو

لیکن اپنی انا کے جنگلوں سے نکل کر
تم ادھر آ بھی گئے تو
تو اس کی انا کا ساگر لہرا رہا ہوگا
جسے تم پار کرنے کی ہمت کبھی نہیں کر پاؤ گے

(نیا ادھیائے، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 34

مندرجہ بالا نظموں میں بھرپور اعتماد کے ساتھ احتجاجی و انقلابی کیفیت در آئی ہے۔ شہناز نبی عورتوں کے سماجی انقلاب کی بھی متمنی نظر آتی ہیں۔ سماج میں اپنی ذات کو اعتبار بخشنے اور سماجی حقوق کے لیے اٹھائی گئی آواز ان کے یہاں انقلاب کی منتظر ہے۔ وہ نظم ''اے زیرک کے لوگوں'' میں موجودہ سماج سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں:

پہاڑوں کی بلندی سے
اپنی بچیوں کو پھینک دینے والے زیرک لوگو
کون کہتا ہے کہ تم وحشی تھے
وحشی قبائل آج بھی زمین جان کر روندتے ہیں
فصلوں کی طرح کاٹتے ہیں
اندھا کنواں سمجھ کر پاٹتے ہیں
دسترخوان پر چنی جانے والی یہ نعمت
قدرت کی طرف سے آدم کو پہلا تحفہ
جسے وہ جوئے میں ہار گیا
اس سے پہلے کہ جنت اس کی کمزوری بنے
اور تہذیب کی پہلی علامت سے
اس کا ایندھن تیار ہو
اے زیرک لوگو
اس کے پیدا ہوتے ہی
اسے پہاڑوں کی بلندیوں سے
پھینک دو۔۔۔!

(اے زیرک کے لوگو!، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 35

آج عورتوں کے سماجی مسائل میں ابارشن، عزت لٹ جانا، حق کی آواز کو دبانا یہ سب پیچیدہ مسائل بنتے جارہے ہیں۔ شہناز نبی سماج میں پھیلی ان برائیوں کو دور کر کے سماج میں ایک انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ نظم ''انتقام'' ملاحظہ ہوں:

کتنی پتیاں اندر ہی اندر مرجھا رہی ہیں
لاتعداد کلیاں سانس لینے سے پہلے
دم توڑ رہی ہیں
غنچے خودکشی پر مجبور
تتلیاں چمن سے گریزاں
بھونروں کی گن گن مفقود
اوس کی بوندیں خلا میں سرگرداں
فطرت کی گود میں دور دور تک تیزاب کی ٹپکتی لہریں
فاختائیں پھندوں کی گرہ کو کھولنے کی کوشش میں
اپنی چونچ زخمی کر چکی ہیں
فریب کی ست رنگی دھنک توڑ کر
کسی کنویں میں ڈال دو
اپنے اندر
نیلوفری پھولوں کو اگانے بھرنی باقی ہے
اب بہار کو ہمارا انتظار کرنے دو

(انتقام، شرار جستہ) 36

سماج میں کبھی رسم ورواج کے نام پر تو کبھی مذہب کے نام پر عورتوں کے حقوق کی پامالی کی جاتی ہے۔ شہناز نبی کے یہاں عورتوں کا کوئی مذہب نہیں ہے وہ مذہب کے نام پر عورتوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ ان کا یہ احتجاج انقلابی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ نظم ''بس ایک چنگاری'' پیش ہے:

تم نے جن شعلوں کو میرے سینے میں دفن کیا تھا

وہ پھر کسمسا رہے ہیں
میں نے تمہارے دیے ہوئے آنسوؤں سے
انہیں کم رکھنا چاہا
لیکن وہ تند ہوتے جاتے ہیں
ایک شعلہ
چقماق سے نکلنے والی چنگاری کا مرہون منت ہے
ایک شعلہ
بچپن کی معصوم ضد کے مجروح ہونے پر بھڑکا تھا
جب تم نے میرے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگائی تھی
تو ایک شعلہ جنما تھا
جب میری ناک میں نکیل ڈالی گئی تو ایک
جب کھونٹے سے باندھی گئی تو ایک
ایک ایک کر کے اتنے بہت سارے شعلے
اپنی لپلپاتی ہوئی زبان سے
خاک کر دینا چاہتے ہیں منوسمرتی کے پنوں کو
جلا دینا چاہتے ہیں بہشتی زیور کے اوراق
پگھلا دینا چاہتے ہیں پاؤں میں پڑی زنجیروں کو

(بس ایک چنگاری، شرار جستہ) 37

نظم ''مالک لینڈ مارگ سے گزرتے ہوئے'' میں عورت پر جنسی تشدد اور اسے ہوس کا شکار بنانے والے مردوں پر طنز کیا ہے۔ نظم ''بے شرمی'' اور ''المیہ'' اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ جن میں وہ عورت کے جنسی تشدد کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنی شاعری میں طوائفوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ اب تم بھی جاگ جاؤ اپنے حق کی آواز کے لیے۔ یہ مرد سماج تمہارے جسم کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ نظم ''سوگندھی'' اسی طرح کی نظم ہے، پیش ہے:

ان کو رخصت کرو
جو تمہیں

شام کی ملگجی روشنی میں
بجھانے چلے آتے ہیں
پر تعفن یہ سانسیں
اگر لوبان کی خوشبوئیں مار دیتی ہیں
کھلنے نہیں دیتی ہیں چاندتارے
یہ بے نور آنکھیں
کھلی رکھو سب کھڑکیاں
پردے سرکا دو
جلنے دو سب بتیاں
نیم تاریک گلیوں میں یہ لڑکھڑاتے بدن
لوٹ جائیں گے واپس
اگر روشنی دور سے ہی دکھائی پڑی

(سوگندھی سے، پس دیوار گریہ) 38؎

یہ سچ ہے کہ جب سے عورتوں نے اپنے حق کی لڑائی لڑنی شروع کی ہے تو کہیں اسے حق ملا بھی ہے تو کہیں اس کی آواز کو دبانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن عورتوں کو کچھ نہ کچھ آزادی ضرور ملی ہے۔شہناز نبی کو اس حقیقت سے انکار نہیں ہے وہ یہ بات تسلیم کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس آزادی سے مطمئن نہیں ہے۔نظم ''آزادی اپنی شرطوں پر'' ملاحظہ ہوں:

میں نے جتنی آزادی حاصل کر لی ہے
اس پہ خوش تو ہوں لیکن مطمئن نہیں
میری آزادی کو دائروں سے آزاد ہونا ہے
میرے احتجاج کو فیصلوں سے بلند تر ہونا ہے
میں کنویں کا حصہ بننے کے بجائے
سمندر کی لہروں پہ جھاگ اڑانا چاہتی ہوں
مجھے اتنی آزادی چاہیے کہ

میں ایوان خاص وعام کو
الگ کرنے والی دیواروں کو گرا سکوں
مجھے پتہ ہے کہ فریاد پہنچانے والی گھنٹیاں
خاموش ہو چکی ہیں
عدل کی گلیوں میں اندھیرا ہے
لیکن مجھے اتنی آزادی چاہیے
کہ میں محل کے ہر مایوس دریچے پر
ایک چراغ روشن کر سکوں
سنسان شاہراہوں پر
پوری قوت سے چیخ مار سکوں
آزادی اس میں ہے کہ میں برے سپنے نہ دیکھوں
نیند میں خوف سے نہ لرزوں
میری چھت کے پرکھچے نہ اڑیں
کھلے آسماں کے نیچے میری بولی نہ لگے
میری ہڈیاں نہ چچھوڑی جائیں
مجھے سینے اور کولہے کی ناپ سے نہ جانچا جائے
مجھے قوت باہ بڑھانے والی گولی کے طور پر
نہ نگلا جائے

(آزادی اپنی شرطوں پر، شرار جستہ) 39

اس پوری نظم میں شہناز نبی تانیثیت کی ان تمام پرتوں کو ادھیڑتی ہوئی نظر آتی ہیں اور جیسے جیسے یہ پرتیں ہٹتی جاتی ہیں، وہ ایک توانا اور مضبوط قوت والی عورت کی ترجمان بن جاتی ہیں۔ وہ عورتوں میں اعتماد پیدا کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں یہ اشارے عورت کی نئی خواہشیں، آرزوئیں اور پابندی کو توڑنے کے لیے محض ایک قدم ہے۔

ان کے تانیثی موضوعات میں جو موضوع سب سے زیادہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے وہ ہے ان کا الگ

سے تانیثی ادب کا ہونا۔ وہ خواتین کے ادب کو ادبی حوالے سے بھی ایک منفرد مقام دلوانا چاہتی ہیں جس کی وہ بے حد آرزومند ہیں۔ وہ خواتین قلم کاروں تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہیں کہ وہ اس کے لیے میدان میں آگے بڑھیں۔ نظم ''ناجائز'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ملاحظہ ہوں:

جامد ہونٹوں کی جنبش
یخ بستہ زبان کی کسمساہٹ
کسی سے سہن نہیں ہوتی
سبھی اپنی اپنی پسند کے الفاظ سجانا چاہتے ہیں
اپنے اپنے خیالات ذہن میں بونے کے خواہش مند
خود کے لیے بولنا
کبھی گالی/ کبھی چیخ/ کبھی آنسو
ذائقہ بدلنے کے لیے عالمی مسائل
قحط/سیلاب/فرقہ وارانہ فساد/ تیسری دنیا/ تاریک وطن
اور بھی بہت کچھ
خود سے کتنی باہر
کتنی اندر
کتنی پاس/ کتنی دور
کس سے کتنا شکوہ
کتنی محبت
کتنی بالواسطہ /بلاواسطہ
کتنی ننگی/ڈھکی چھپی
کہاں کون سی تشبیہ /استعارہ
یہ وہ طے کریں گے
جنہوں نے آج تک لفظوں سے کھیلا
اور زبان کا زنا بالجبر کیا ہے۔۔۔

(ناجائز، پس دیوارگریہ) 40

ایک اور نظم ''خموشی'' میں وہ مردوں کے ذریعہ بنائے گئے ادبی ڈھانچے میں تبدیلی لانا چاہتی ہیں:

زبان میری خیال میرے
مگر ابھی تک وہی اندھیرے
علامتوں کو زوال نہ ہو
نہ بدلے جائیں گے استعارے
کہ بحر و بر ہیں نگین اس کے
کہ صرف ونحو پہ اجارہ اس کا
وہی سناتا ہے فیصلے سب
اسی نے سانچے بنائے سارے
وہ حرف اول
وہ حرف آخر
چلو کچھ ایسا کریں
قفس کی ایک ایک تیلی بکھیر ڈالیں
بے چارہ آدم
اسیر نطق و زباں ہے کب سے
اسے خموشی کے گر سکھائیں

(خموشی، پس دیوارگریہ) 41

مندرجہ بالا نظموں کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی اپنی نظموں میں تانیثی موضوعات کو برتنے میں کامیاب رہی ہیں، چاہے کوئی بھی میدان ہو، سماجی، سیاسی، معاشرتی، جنسی۔ انھوں نے عورتوں کے سبھی مسائل کو شعری پیکر میں ڈھال کر پوری دنیا کے لیے پیغام چھوڑا ہے۔

سماجی موضوعات:

کسی بھی تخلیق کار کا گہرا رشتہ سماج سے ہوتا ہے۔ بقول ارسطو ''انسان ایک سماجی حیوان ہے'' سے اس

بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ادیب یا شاعر سماج کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔وہ ان تمام چیزوں کا اثر قبول کرتا ہے جس کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔اس کی شخصیت پر ماحول اور سماج کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔شاعر ہو کہ ادیب بہت حساس ہوتے ہیں اس لیے اپنے اطراف رونما ہونے والے واقعات وحادثات سے متاثر ہوتے ہیں۔سماج میں پھیلنے والی برائیوں اور اس کے نتائج سے وہ ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں۔شہناز نبی نہ صرف ایک شاعرہ ہیں بلکہ سیاست سے بھی ان کو لگاؤ ہے۔سماج میں ہونے والے زیادہ تر مسائل عورت سے ہی جڑے ہوتے ہیں اور ان مسائل کا صحیح طور سے بیان ایک عورت ہی کر سکتی ہے اس لیے ہمیں ان کی نظموں میں جا بہ جا سماجی موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ایک لڑکی بچپن سے لے کر جوانی تک کن کن سماجی مسائل سے دو چار ہوتی ہے اس کا ذکر وہ اپنی نظم ''گوریاں'' میں کچھ اس طرح کرتی ہیں:

پھدکتی ہوئی ننھی گوریوں کی چچ چچ سے
راہداری گونجتی رہتی ہے
آوارہ کتے گلیوں میں بھونکتے رہتے ہیں
موسم شاخوں پر آتا جاتا رہتا ہے
ہر سال گوریوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے
ہر سال وہ اڑائی جاتی ہیں
ان دیکھے آنگنوں کی طرف
گوریا لوٹ آتی ہیں
اپنے پرانے ٹھکانے کی طرف
زخمی
شکستہ
مانوس کھپریلوں میں اپنی جگہ تلاش کرتی ہوئی
گوریاں کفنادی جاتی ہیں
ایک ایک کر کے دفنادی جاتی ہیں
گلے میں پھنسی ہوئی چیخ سمیت

سل پر ہلدی کی گانٹھیں سوکھ رہی ہیں

(گوریاں، شرار جستہ) 42

مذکورہ بالا نظم سماج میں لڑکیوں پر ہونے والے ظلم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔لڑکیوں کی زبردستی شادی کرنا، حمل میں لڑکی کی پیدائش کے قبل اس کے وجود کو برباد کرنا، سسرال میں ان پر ہونے والے ظلم، ان سب کی ایک بے لاگ تصویر کشی اس نظم میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

سماج میں اچھائی بھی جنم لیتی ہے اور برائی بھی، ایک سچے اور اچھے انسان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ سب کو ان سے باور کرائے اور اچھے و برے کی تمیز بتائے اور شعراء یہی کام کرتے ہیں۔شہناز نبی بھی سماجی برائیوں کے خاتمے کے لیے اپنی آواز ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔نظم ''خلا میں کہرام'' اس کا بین ثبوت ہے۔

چوری چھپے چاند کے ٹکڑوں کا سودا ہو رہا ہے
اندھیرے کے سوداگر
اک اک ٹکڑا چاند
اونچی قیمت پر بیچ رہے ہیں
گڈے گڑیوں کا منڈپ
رنگین پنیوں سے سجایا جاچکا ہے
اور ننھی سمدھنیں سازشی انگلیوں کے سہارے
ریل کے ڈبے میں بٹھا دی جاتی ہیں
گڈے گڑیا روتے رہتے ہیں
مرشد آباد، دلی، ممبئی، یوپی، آسام، بنگلہ دیش سعودی عرب
چاند کے ٹکڑے کبھی حجلۂ عروسی میں روندے جاتے ہیں
کبھی اندھیرے کمروں میں چٹخائے جاتے ہیں
نہ آسماں پگھلتا ہے
نہ زمین کانپتی ہے
ہاں، خلا سسکیوں سے بھر جاتا ہے

(خلا میں کہرام، شرار جستہ) 43

بچیوں کا اغوا ہونا اور ان کی آبرو کو تار تار کرنا آج ہمارے سماج کا ایک حصہ بن گیا ہے جس کو شہناز نبی نے بڑی جسارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

موجودہ سماج کا ایک بڑا مسئلہ لوگوں کا مصروف ہو جانا اور بھاگ دوڑ بھری زندگی ہے۔ لوگ بالکل مشینی انداز میں زندگی گزار رہے ہیں۔ رشتوں کی اہمیت گھٹتی جا رہی ہے۔ یہاں تک لوگ ماں جیسی عظیم ہستی سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ماں کی عظمت کا کم ہونا ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ آئے دن ماں کے ساتھ برے سلوک کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ شہناز نبی جیسی حساس فن کار سے سماج کا یہ بڑا مسئلہ کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ اس لیے وہ ''فاصلے'' نظم لکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، نظم ملاحظہ ہوں:

ایک مرجھایا چہرہ
آنکھیں موندے
بازوؤں کے درمیان گم
کانوں میں انگنت آوازیں
تتلی کی طرح اڑنے کی خواہش
سسکی میں بدل جاتی ہے
اندر اندر لاوا کھولتا ہے
انجان لوگوں میں ایک اجنبی رشتہ
صرف دودھ کا واسطہ دے کر قائم نہیں رکھا جا سکتا
دل تک جانے والی شریانیں سوکھنے لگی ہیں
دماغ کی نسیں ٹوٹنے لگی ہیں
چھت سے جھولتے ہوئے اس جسم کو تھامنے کے لیے
ایک دوپٹہ کافی ہے
لوریاں بجھ گئی ہیں

(فاصلے، شرار جستہ) 44ص

مذکورہ نظم میں ماں کو بے گھر کر دینا، اس کا در بدر پھرنا اور آخر میں تنگ آ کر پھانسی پر جھول جانا آج کے

سماج کے منہ پر تمانچے سے کم نہیں، انسان کتنا بے حس ہوگیا ہے اس کی طرف وہ اشارہ کرتی ہیں۔

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بھی سماج میں بڑا گمبھیر ہوگیا ہے۔ باطنی خوبصورتی ظاہر کی خوبصورتی کے سامنے بے معنی ہوگئی ہے۔لڑکیاں ذراسی معمولی صورت کی ہوں تو ان کی شادی ہونا مشکل ہوتا جا رہا ہے، تھک ہار کر زندگی سے مایوس ہو کر ان میں سے کئی پھانسی لگانے تک مجبور ہو جاتی ہیں۔شہناز نبی اس نازک مسئلے پر بھی اپنی نظم پیش کی ہیں:

خود کو دیر تک آئینے میں دیکھتے رہنے کی بے شرمی سے
کوئی میرا نہیں
آئینہ ساز کی تعریف کرتے رہنے سے کیا حاصل
اس نے کہہ رکھا ہے
اپنے عیوب کو گننا خالق کو تکلیف پہنچانا ہے
یہ تخلیق کی مجبوری ہے یا خالق کی
رنگ وروغن سے لپا پتا چہرہ
قبولیت کی شرف پانے سے محروم
روح کی روشنی سے انجان
بوند بوند کی حقدار گھٹتی جا رہی ہے
اس کے 'نہ' کے 'ہاں' بننے تک
لیلاؤں سے اٹ جائے گا صحرا

(بے شرمی، شرار جستہ) 45

آج بھی ہمارے ملک میں بعض جگہوں پہ شادی جیسے اہم فیصلے ہمارے بڑوں کے ذریعے ہی طے پاتے ہیں۔لڑکیوں سے ان کی رائے تک نہیں لی جاتی ہے اور ان کو بیاہ دیا جاتا ہے ایک ایسے بندے کے ساتھ جس کو اس نے نہ دیکھا ہوتا ہے نہ جانا ہوتا ہے اور اس کو والدین کی فرماں برداری کا نام دیا جاتا ہے۔ بالآخر لڑکی کو صبر کا گھونٹ پینا پڑتا ہے اور ہر حال میں اس کو ہی سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔کبھی کبھی تو لڑکیوں کی رضامندی کے بغیر ہی ان کی شادیاں کر دی جاتی ہیں جس کو وہ دل سے قبول نہیں کر پاتی ہیں۔شہناز نبی اس نازک مسئلے پر ہماری توجہ کراتے ہوئے نظم

''کسے پتہ تھا''، تخلیق کرتی ہیں:

کسے پتہ تھا کہ درد کے کاسنی گھڑے میں
سمانہ پائیں گے اتنے آنسو کشادگی سے
کہ نیلگوں لب اٹھانہ پائیں گے بوجھ
لفظوں کی خامشی کا
کہ رات بھر دل میں سلگتا رہے گا
گم گشتہ یادوں کو لوبان
'نا' کہہ دینے سے
کچے ریشم میں پڑنے والی گرہیں
کھل نہیں جاتیں
جاگ اٹھنے والی بینا کے تار
سو نہیں جاتے
دبے پاؤں چلنے والے خواب
آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں
نیند کی راہداریوں میں
غیر منقش لمس کی کرچیاں چنتے چنتے اعصاب زخمی
غیر منقوشہ بوسوں کی پرتیں اکھیڑتے ہوئے
چھل جاتی ہے جلد
سینے کی کھرن پہ گمکتی ہے سانسوں کی تھاپ
محسوس اور نامحسوس آلنگن کے درمیان
بٹ جاتا ہے جسم
تھک جاتی ہے روح

(کسے پتہ تھا، نظمیں ہماریاں) 46

سماج میں پھیلی ناانصافی، سچ کے سامنے جھوٹ کی جیت، پیسہ جس کے پاس ہے اس کی عزت، یہ سب

ایسے سماجی مسائل ہیں جن سے شہناز نبی آنکھیں نہیں چرا سکیں اور وہ ''کنوا اور ڈول''، نظم لکھتی ہیں:

کنویں بڑھتے جاتے ہیں
بڑھتی جاتی ہے پیاس
من ڈولتا ہے
ڈول ڈالنے والوں کو
پہلے رسی چرالیں
پھر ڈول
پھر کنواں
سب ایک دوسرے سے پوچھا کریں گے
کنواں دیکھا
پھر جھول جائیں گے
کنواں اس کا جس کی رسی اور ڈول
قاضی اس کا
جس کے پاس درہم ودینار
گواہوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہیں
ہونٹ سی لیے ہیں
محض شک کی بنیاد پر
فرد جرم عائد نہیں کیا جاسکتا
انہیں باعزت بری کردو

(کنواں اور ڈول، پس دیوار گریہ) 47

امیروں اور غریبوں کے بیچ تضادات اور ذات پات کا مسئلہ سماج کے لیے ناسور بنتا جارہا ہے۔ غریبوں کے استحصال کی خبریں اخبار کی سرخیاں بنتی ہیں، امیروں کا جبر اور غریبوں پر ظلم وستم ایک ایسا مسئلہ ہے جو ایک تخلیق کار کی فکر کا باعث بنتا جارہے ہے۔ شہناز نبی نے اپنی شاعری میں اس مسئلے پر بھی قلم اٹھایا ہے اور سماج میں پنپنے والی اس خطرناک برائی کی طرف ہماری توجہ دلاتی ہیں۔ نظم ''ڈراپ سین'' ملاحظہ ہوں:

میں نے دیکھا
میرے کنویں کے پانی پر اونچی ذات والوں کا قبضہ ہے
میرے آنگن میں اگنے والے درخت
فصیلوں کے باہر چھاؤں بکھیرتے ہیں
میرے آسمان پر چمکنے والا سورج
اس مکان کی چھت پر پہلے اترتا ہے
جس کی اونچائی میرے مکان سے کئی گنا زیادہ ہے
میرے گھر تک آتے آتے کشادہ سڑکیں
گلیوں میں بدل جاتی ہیں
چمنیوں سے نکلنے والا دھواں
میری کھڑکیوں پر پردے تان دیتا ہے
آگ کا سفر میرے دروازے پر ختم ہو جاتا ہے
(ڈراپ سین، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 48

موجودہ سماج میں بیٹوں کا گھر سے دور خلیجی مما لک یا دوسرے ملک میں رہنے کا چلن چل نکلا ہے۔ان کے اس اقدام سے گھر کی عورتوں کو نہ جانے کتنے مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ماں، بیوی اور بہن سب ایک خوف کے سائے میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔سب سے زیادہ ماں کو ان سب مسئلوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔شہناز نبی اس مسئلے کو موضوع بناتی ہیں:

مجھے لکھنا تھا ان کے لیے
جن کے ہاتھ اپلے تھوپنے میں مصروف ہیں
جن کی مرچیں باون دستے میں کوٹنے کو پڑی ہیں
گیہوں پھٹکنے کو باقی ہیں
دھان ڈھینکلی کی راہ تک رہے ہیں
جو گدلے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے
بلاوز کے بخیے اٹھاتی ہیں

جنہیں ہر مہینے کی دسویں تاریخ کو
بیٹے کے دروازے پر اپنا خرچہ مانگنے
بیسیوں دفعہ جانا پڑتا ہے
پسرے ہاتھوں کی معدوم ہوتی لکیریں
کسی تحریر کو روشن نہیں کرتیں
میں لکھنا چاہتی تھی
ان ٹوٹے موتیوں کا رزم نامہ
جن کے وارث ریگزاروں میں مسکن بنا چکے ہیں
(آتش لمحہ، پس دیوار گریہ) 49

شہناز نبی نے سماج کے ایک اور اہم مسئلے کو موضوع بنایا ہے وہ یہ ہے کہ آج مذہبی ٹھیکیدار ملا ہو یا پنڈت نے اپنی چالوں سے لوگوں کے بیچ مذہبی انتشار کو اتنا زیادہ پھیلا دیا ہے کہ ان میں لڑائی جھگڑے ایک معمولی بات بن گئی ہے۔ کبھی مسجد، کبھی مندر تو کبھی گرودوارے کے نام پر فسادات ہوتے ہیں جس سے سماجی نظام منتشر ہوتا رہتا ہے اور آپس میں اختلاف بڑھتا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے سماج کے لیے، فرد کے لیے اور اس ملک کے لیے بھی، ہمارے ملک کی آپسی اتحاد و اتفاق لیے بھی خطرہ ہے۔ شہناز نبی مذہبی ٹھیکیداروں پر طنز کرتے ہوئے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتی ہیں اور ''پاپ''، ''ادھورا نروان''، ''شہر آشوب''، خاموش دھماکے''، ''کیا اسی دن کے لیے'' وغیرہ نظمیں لکھتی ہیں۔

جانے کتنی دیوالیاں اور شب براتیں گزر گئیں
بچوں نے پٹاخے نہیں چھوڑے
وہ اب دھماکوں سے ڈرنے لگے ہیں
دیکھتے دیکھتے ہما ہمی سے بھرے شہر کا ویران ہوجانا
ہنستے بولتے مسافروں کا لاشوں میں بدل جانا
درسگاہوں کا سنسان ہوجانا
کتنے عجیب تجربے ہیں

(خاموش دھماکے، پس دیوارِ گریہ) 50ص

مٹتی ہوئی تہذیب اور قدیم روایتوں کے بارے میں بھی وہ فکر مند نظر آتی ہیں، گاؤں کا شہروں میں تبدیل ہو جانا، بھاگ دوڑ بھری زندگی یہ سب ایسے سماجی مسائل بنتے جا رہے ہیں جس کا خاتمہ ضروری ہے کیوں کہ تہذیب ہی ہماری پہچان ہے اور تہذیب کا خاتمہ اپنی شناخت کا خاتمہ ہے۔ شہناز نبی بڑی سنجیدگی سے اس پر غور و فکر کرتی ہیں اور ایک حساس فن کار ہونے کے ناطے ملک سے محبت کے واسطے وہ اپنی نظموں میں ان کو موضوع بنانا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ ان کی کئی نظمیں اس موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔

ماں کی عظمت اور اس کا احترام کرنا ہمارے ملک کی تہذیب رہی ہے۔ ہندو دھرم میں ماں کو دیوی مانا جاتا ہے اور اسلام نے ماں کے مقام و مرتبے کو بتاتے ہوئے اس کے قدموں تلے جنت رکھ دی ہے لیکن موجودہ سماج میں ماں کا یہ مرتبہ کم ہوتا جا رہا ہے بلکہ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہو چکا ہے کہ آج کئی مائیں سڑکوں پر آ چکی ہیں، ان کو گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہے، وہ بھیک تک مانگنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ مسائل سماج کا ایک ایسا مسئلہ بنتا جا رہا ہے جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے وہ کم ہے اس سے ہمارے ملک کی تہذیب کو خطرہ ہے اور سماج کو بھی۔ اس لیے شہناز نبی اس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں:

تم جا سکتی ہو
تمہیں کوئی نہیں روکے گا
تمہیں یاد ہے
پہلے کی پیدائش پر تم نے کتنی گدڑیاں سی تھیں
کیسے نقش ابھارے تھے
تمہاری انگلیاں چھد گئیں تھیں
لیکن تم اپنے زخموں کو پیار سے سہلاتی رہیں
شہد کی بوندیں
کاجل کے ٹیکے
چندن کے لیپ
کوئی یاد نہیں رکھ پاتا

کہ زندگی بڑی تیز رفتار ہے
گھر کے اجاڑ کونے میں
اپنے بے مصرف وجود کو یونہی پڑا رہنے دو
کہیں جانے کی کوشش نہ کرنا
کہ تمہیں کوئی نہیں روکے گا

(تم جا سکتی ہو، شرار جستہ) 51؎

شہری زندگی اور بدلتے ہوئے حالات نے پرانی تہذیب کو بھلا دیا ہے۔ چہار سو بے حیائی عام ہو چکی ہے۔ رشتوں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ نئی طرز زندگی اور رہن سہن ہمارے پہناوے لباس وغیرہ غرض کہ ساری چیزوں کا اثر ہم پر ہو رہا ہے، بچپن کھوتا جا رہا ہے۔ برائیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ گلی، آنگن، چھپر، پائل سب غائب ہو گئے ہیں۔ شہناز نبی نے بڑے سلیقے سے اس مسئلے کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے اور اسے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ نظم ''کس سے پوچھوں'' ملاحظہ ہوں:

کس سے پوچھوں کہاں گئی وہ
ان ٹیڑھی میڑی گلیوں سے
ایک گلی گھر کو جاتی ہے
آدھی پکی، آدھی کچی
ایک کھلے آنگن سے جڑتی
قدموں کے نیچے ہنستی تھی
میری چاندی کے پائل سے
کیا جانے کیا کیا کہتی تھی
نگل گئے ہیں اس کو رستے
اونچی اونچی دیواروں کے نیچے آنگن دفن ہو رہے ہیں
اڑ گئے چھپر
چڑیاں رستہ بھول چکی ہیں
اتر گئے ہیں ٹاٹ کے پردے

ختم ہوئی ہے آنکھ مچولی

بچپن رستہ بھول گیا

(کس سے پوچھوں؟، شرارجستہ) 52ص

''مکڑی کے جالے'' اور نہ جانے کتنی نظمیں ہیں جس میں انہوں نے ہماری تہذیب کو اپنی شاعری میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ افسوس ہمارا سماج ہماری تہذیب کو سنبھال نہیں پا رہا ہے لیکن شہناز نبی نے پرانے گھر، آنگن، رہن سہن کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر آنے والی نسلوں کے لیے ایک دستاویز تیار کر دی ہیں جس پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سماجی موضوعات کو بروئے کار لانے میں شہناز نبی ہر طرح سے کامیاب رہی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا سماجی مسائل بچا ہو جن پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔ ان کی شاعری میں ہمارا سماج چلتا پھرتا نظر آتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی سماجی موضوعات کے بیان میں کامیاب رہی ہیں۔

سیاسی مسائل وانقلاب:

شہناز نبی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ سیاسی وانقلابی موضوعات پر مبنی ہے۔ سیاست سے ان کا لگاؤ عملی بھی ہے۔ وہ بذات خود کلکتہ کی میونسپل چیرمین رہ چکی ہیں۔ سیاسی میٹنگیں اور سیاسی احتجاج میں وہ پیش پیش رہتی ہیں۔ ان کی تخلیقات پر اس کا اثر پڑنا ظاہری سی بات ہے۔ ان کی نظموں کے دو موضوع خاص ہیں، ایک تانیثی موضوع اور دوسرا سیاست اور دونوں ہی موضوعات پر انہوں نے خوب لکھا ہے۔

شہناز نبی کی نظمیں سیاسی ومذہبی تشدد کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ جب تک شدت پسند نام نہاد مذہبی رہنماؤں کا وجود بنا رہے گا وہ سیاست اور مذہب کے حوالے سے لوگوں پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ پھوڑتے رہیں گے۔ ہندوستان میں مختلف فرقوں کے مابین باہمی تشدد اور خوں ریزی عام سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ آئے دن ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، برہمن دلت کے درمیان فرقہ وارانہ جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ جس کا مقصد عوام کا رجحان ملک میں سیاسی چال اور سیاست سے ہٹانا ہے۔ شہناز نبی کے یہاں یہ مسئلہ ذات پات اور ملک سے اوپر اٹھ کر پورے عام دنیا تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور کبھی روہنگیہ، انہوں نے

سبھی کو اپنی سیاسی موضوعات میں جگہ دی ہے۔ ملک کے رہنماؤں کے نام گنوائے ہیں اور ان کے خواب کی تعبیریں بھی پیش کی ہے۔ کبھی وہ نیتاؤں کو اپنے قلم کی نوک پر رکھتی ہیں تو کبھی عوام کو ان کے ووٹ کی قیمت بتانے کی کوشش کرتی ہیں۔ نظم ''جنگل راج'' میں وہ نیتاؤں کو موضوع بناتی ہیں:

لومڑی کے راج میں ندیاں الٹی چلیں گی؟
بارشیں بے وقت ہوں گی؟
زلزلے بے سبب آئیں گے؟
کیا تجربہ لومڑی کو چالاک بنادیں گے
یا وہ سیاروں کی عیاری کا شکار ہوجائے گی؟
کیا جنگل پر سفید فام شیروں کی حکمرانی ہوگی؟
تعمیر سے تخریب
اور تخریب سے تعمیر تک کا راستہ طویل ہے

(جنگل راج، شرار جستہ) 53

رنگ نسل، ذات پات، مذہب کی بنیاد پر جو سیاست کرتے ہیں انھوں نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عوام کی بے وقوفی اور کم عقلی پر بھی افسوس ظاہر کرتی ہیں۔ نظم ''منتظم'' اسی طرح کی نظم ہے ملاحظہ ہوں:

بڑی نفاست سے اس نے چھانٹے ہیں ریوڑ
مویشی سارے بنٹے ہوئے ہیں
یہ رنگ وذات نسل ان کے بنے طویلے
سب اپنی خوشیوں اور غموں کو بانٹیں گے اپنی حد میں
کہ بھیڑ بکری سے مل نہ جائے
نہ گائے بھینسوں میں ہوں کلیلیں
سنا ہے اس کے نظام ملکی پہ ہیں سب نازاں
اسے ہی بخشیں گے پھر سے وہ منصب ہزاری

(منتظم، پس دیوار گریہ) 54

غریب مزدور اور کسان اتنی محنت کرتے ہیں اس کے باوجود سرکاران کے حق ہڑپ کر جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں کسان اور غریب مزدور ایک ایسا طبقہ ہے جس کی حالت دن بہ دن سنبھلنے کے بجائے اور بگڑتی جارہی ہے اور اس کا صرف اور صرف غلط استعمال کیا جاتا ہے۔ جو اونچے عہدے پر فائز ہیں سیاسی حکمران ان کا استحصال کرتے ہیں۔ان کی اس رنجیدہ حالت پر شہناز نبی نہایت ہی فکرمند ہیں اور اسے اپنی نظموں میں کچھ اس طرح سے بیان کرتی ہیں:

میرے کھیتوں کو ایک آندھی چاٹ رہی ہے
میرے پاؤں کے نیچے دلدل
میرے سر پہ کالا سایہ
میرے سورج چاند ہیں جھوٹے
میرا سیارہ گہنایا
میری بستی گونگی بہری
چوپالوں کا راج ہے چوپٹ
میرا قبیلہ نامردوں کا
میرا اک اک آنگن مرگھٹ

(میں کیوں مانوں، پس دیوار گریہ) 55

امیری، غریبی، ذات پات اور کام کے بنا پر بنٹا سماج کئی خانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ جو امیر ہے وہ خوش ہے، پیسوں کے توسط سے غریبوں کا استحصال کرتا ہے، ان کا سب کچھ ہوتا ہے، سرکار بھی ان کی، عدالت بھی ان کی، ان کے متعلق اگر کہا جائے کہ جینے کا حق صرف ان کو ہی ہے تو بجا نہ ہوگا۔ آئے دن غریبوں پر ہو رہے ظلم پر شہناز نبی آواز اٹھاتی ہیں، وہ نظم ''چانکیہ کے بعد'' تخلیق کرتی ہیں:

تصویر کی گل پوشی کا اعزاز انہیں بخشا جائے گا
جو چانکیہ کے اہالیان میں سے تھے
ایک بڑے سے تنبو کے اندر
طبقوں میں بنٹے سوگوار لوگ

دروازے پر خونخوار پہرے دار
باہر سڑکوں پر بکھری جنتا کے ہاتھوں میں
شردھانجلی کے پھول مرجھا رہے تھے
تصویر میں قید چانکیہ
اپنے ارتھ شاستر پر شرمندہ نظر آرہا تھا
(چانکیہ کے بعد، پس دیوار گریہ) 56ؔ

شہناز نبی سیاسی پہلو سے ہر اس کمی کی طرف ہماری توجہ دلاتی ہیں جو سیاسی حکمرانوں کی طرف سے آئے دن ہوتی رہتی ہے۔ نظم ''کل کی فکر'' ہو یا ''مڈڈے مل'' کوئی بھی پہلوان سے چھوٹا نہیں ہے۔ وہ پہلے عوام، مزدوروں اور کسانوں کی حق تلفی کو دکھاتی ہیں، پھر احتجاج کرتی ہیں اور پھر ان کا یہ احتجاج انقلابی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ پورے سیاسی ڈھانچے کو بکھیر دینا چاہتی ہیں جس کی بنیاد مذہب، ذات پات، امیر غریب پر رکھی گئی ہو۔ ''وہ ہم سے ڈرتے ہیں''، نظم ملاحظہ ہوں:

ان کے ہاتھوں پر لہو
سینے میں زہریلی پھنکار
وہ کمزوروں پر گھات لگاتے اور
پیچھے سے حملہ کرتے ہیں
بے ایمانی ان کا ایمان
بددیانتی ان کا شیوہ
پھر بھی ہم سر اٹھائے گزرتے ہیں
تو ان کی نگاہیں جھک جاتی ہیں
ہم لفظوں کو تولتے ہیں
تو ان کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے
وہ ہم جیسے ہیں اور ہم سے ڈرتے ہیں
وہ تخت نشیں
ہم نمدہ پوش

پھر بھی وہ ہم سے گھبراتے ہیں

(وہ ہم سے ڈرتے ہیں، پس دیوارِ گریہ) 57ؔ

مذکورہ بالا نظم میں شہناز نبی عوام کو سوال کرنے اور اپنے حق کی بات کرنے کی تلقین کرتی نظر آتی ہیں، اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کی نصیحت کرتی ہیں اور عوام کو ان کی طاقت کا پتہ دیتی ہیں۔

ملک میں پھیلی بدامنی، انتشار اور نامساعد حالات سے وہ فکرمند نظر آتی ہیں وہ ان حالات کے رخ موڑ دینا چاہتی ہیں جس سے سماج اور ملک کو خطرہ ہو۔ موجودہ سیاسی نظام انہیں انگریز حکومت کی طرح لگتے ہیں اور پھر سے وہ بیڑیاں جو ہمیں قید کرتی ہیں ان سے آزادی چاہتی ہیں اور ایک انقلاب لانا چاہتی ہیں وہ ملک کے لیے سنہرے خواب بنتی ہیں۔ نظم ''تسلسل ضروری ہے'' ملاحظہ کیجیے:

یہ مانا رگوں میں کہیں ٹوٹنے کی صدا
گونج اٹھتی ہے اکثر
یہ مانا جبیں بھیگ جاتی ہے
آواز چکرا کے رہ جاتی ہے اپنے سینے کے اندر
کہ وہ بیڑیاں جن کے کھلنے پر اترا کے ناچے تھے ہم
آج پھر بڑھ رہی ہیں ادھر
دھول سے اپنا ماتھا اٹھا کر
لہو کی ترنگوں پہ پھر کوئی نغمہ
کہ للکار کوئی
کہ چلنا ہے پھر سے ببر کی چال
جس کی دھمک سے لرز جائیں وہ
نیم تاریک کمروں میں بیٹھے ہوئے
جوڑ کر اپنے سر

(تسلسل ضروری ہے، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 58ؔ

شہناز نبی نے سیاسی موضوعات پر بے پناہ نظمیں کہی ہیں، سیاست کا کوئی جز ان سے چھوٹا نہیں

ہے۔سیاست سے ان کا لگاؤ بہت گہرا ہے اس کا اندازہ ہمیں ان کی سیاسی نظموں کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ وہ سیاسی موضوعات پر بیباک قلم اٹھاتی ہیں۔

امن واتحاد کا پیغام:

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں نہ صرف سیاسی وسماجی موضوعات کو جگہ دی ہے بلکہ ان کی نظمیں امن واتحاد کا پیغام بھی دیتی ہیں۔ملک میں پھیلی بدامنی انہیں بےسکون کرتی ہے۔وہ نہ صرف ہندوستان تک امن واتحاد کی تمنائی ہیں بلکہ ان کی خواہش ہے کہ پوری دنیا میں امن قائم رہے۔بمباری، دھماکہ، دہشت گردی ان سب پر روک لگانے کے لیے اپنی نظموں کے ذریعے پیغام دیتی ہیں۔سرحدوں اور قوم کا بٹنا انہیں پسند نہیں، وہ انہیں ایک غیر فطری عمل بتاتی ہیں۔ان کی نظم ''سرحدوں کے درمیان'' پیش ہے:

سرحد کے اس پار
وہ دریا جن پر اب میرے اجداد کا نام نہیں
وہ میرے لیے ہر ساحل میں بادل کی چادر بنتے ہیں
وہ بادل جن کے ماتھے پر
میری ندیوں کا قرض نہیں
لیکن وہ آن برستے ہیں
ندیوں کو جل تھل کرتے ہیں
گل اس جانب کھلتے ہیں
خوشبوئیں مجھے چھو جاتی ہیں
بنتی ہیں گیت وہاں چڑیاں
آنگن تو میرا چہکاتی ہیں
ہے چاند ادھر اور اس جانب
ہر شے پر نور برستا ہے
کچھ دوریاں بیچ میں رکھی ہیں
رستہ تو وہی ایک رستہ ہے

کبھی جس پر ساتھ چلے تھے ہم
کبھی جس پر ساتھ چلیں گے ہم

(سرحدوں کے درمیان، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 59

وطن کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ اپنے ملک کے بٹوارے کرنے والوں سے کافی ناراض نظر آتی ہیں اوراسے اب تک کی سب سے بڑی غلطی بتاتی ہیں۔ ملک کے دوٹکڑے کرنے والے کو وہ پھانسی کی سزا دینا چاہتی ہیں۔ نظم ''پھانسی'' اسی موضوع پر تخلیق کی گئی ہے۔

چلو کہ اب وہ گھڑی ہے آئی
تمام اچھے
عظیم لوگوں کو ڈھونڈ کر ہم
وہ جن کے دل میں
امڑتے رہتے ہیں حب قومی کے تند دریا
جنہیں دلوں کے
زبانوں کے
ذہنوں کے
وبھاجن نے سرخرو کیا ہے
انہیں پکڑ کر لگا دیں پھانسی

(پس دیوار گریہ) 60

نظم ''پاپ''، ''جب میں مر جاؤں'' وغیرہ ایسی ہی نظم ہیں۔ جس کے ذریعے وہ امن واتحاد قائم کرنا چاہتی ہیں اور ساتھ ہی بدامنی پھیلانے والوں کے لیے کڑی سزا بھی تجویز کرتی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اور موضوعات کی طرح شہناز نبی کی شاعری میں امن واتحاد کا پیغام پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری ذات سے نکل کر سماج، ملک اور پھر پوری کائنات کی آواز بن جاتی ہے اور ان کا یہی انداز انہیں ایک منفرد شاعرہ کہلانے کا مستحق قرار دیتا ہے۔ شہناز نبی نے ہر موضوع کو بڑے ہی سلیقے سے برتا ہے اور اپنا پیغام قارئین ادب تک پہنچانے میں بھی کامیاب نظر آتی ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی:

شہناز نبی نے عصر حاضر کے سبھی موضوعات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ سیاسی، سماجی، تانیثی اور دیگر موضوعات ے علاوہ ایک بہت ہی اہم موضوع ہمیں ان کی نظموں میں دیکھنے کو ملا، وہ ہے ماحولیاتی آلودگی۔ ماحولیاتی آلودگی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے بہت ہی کم وقت میں پوری دنیا کے لیے خطرہ پیدا کرنا شروع کر دیا ہے۔ تمام انسان، چرند پرند، سب اس کی زد میں آ رہے ہیں۔ دھرتی پر زندگی مشکل ترین ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری صحت سے لے کر ہماری زندگی پر خطرے منڈلا رہے ہیں۔ شہناز نبی اس مسئلے کو اپنی نظموں میں موضوع بنا کر سب کی توجہ اس جانب مرکوز کرتی ہیں:

مینائیں اب صرف اتنا بولتی ہیں جتنا انہیں سکھایا جاتا ہے
نبی جی روزی بھیجو
اب وہ نہ بلا ضرورت بولتی ہیں
نہ کھلی فضاؤں کے بارے میں سوچتی ہیں
جنگل پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے
آسمان کی نیلاہٹ سیاہی میں بدل چکی ہے
اندھیرے میں گم مینائیں کہتی ہی جاتی ہیں
نبی جی۔۔۔۔۔

(تمناؤں کا عذاب، شرار جستہ) 61

آج بڑی تیزی کے ساتھ جنگل کے کاٹے جانے کی مہم شروع ہو چکی ہے، لاکھوں ایکڑ جنگل کاٹ دیے جاتے ہیں۔ اس سے ہمارے ماحول اور فضا پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہوا، پانی، بادل اور برسات سب آلودہ ہوتے جا رہے ہیں اور یہ ہماری صحت کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مزید پریشانیوں کا سبب بن گئے ہیں۔ شہناز نبی اس سے پنپنے والے مسائل کی طرف قارئین کی توجہ دلاتی ہیں۔

زمینیں بک جاتی ہیں تو بک جاتے ہیں تناور درخت
لہراتی ہوئی شاخیں

دومٹ مٹی اور ریتیلی چکنی مٹیاں رونے لگتی ہیں
مجھے مت بیچنا
بادل پھر ادھر کا رخ نہیں کریں گے
بارشیں اس دھرتی کو بھول جائیں گی
ہنسوں کے جوڑے بنا رکے گزر جائیں گے
لیکن ان کی آہیں کوئی نہیں سنتا
روایتیں کمزور پڑنے لگتی ہیں
تو آنکھیں دھندلا جاتی ہیں
گدلا پڑنے لگتا ہے تالاب کا پانی
سوکھنے لگتے ہیں کنویں
زمین کے تڑختے ہوئے سینے سے بد دعائیں نکلتی ہیں
لیکن ڈوب جاتی ہیں بڑی بڑی مشینوں کے بے ہنگم شور میں

(دریا کے آس پاس، شرار جستہ) 62

ماحولیاتی آلودگی ایک ایسا مسئلہ ہے جو پوری دنیا کے سامنے منھ پھاڑے کھڑا ہے۔ اگر ہم اس زمین پر زندگی کی علامتیں باقی رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی طرف دھیان دینا ہمارا فرض ہے اور شہناز نبی نے اپنی نظموں کے ذریعے اپنے اس فرض کی ادائیگی کر رہی ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے۔ ان کے موضوعات اتنے وسیع ہیں کہ ذات سے لے کر کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں موضوعات کے اعتبار سے عصری حقائق کو شعری جامہ پہنایا ہے۔ چاہے وہ عورت کے مسائل ہوں خواہ وہ جنسی ہو یا سماجی نابرابری کے، دیگر سماج میں پھیلی برائیاں ہو یا پھر رسم ورواج ہوں یا سیاسی مسائل ملک میں پھیلی بدامنی ہو یا دنیا میں مچی ہاہا کار ماحولیاتی آلودگی غرض ہر طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور کافی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ ان کی یہ نظمیں عصری حقائق اور احساس فکر کی ترجمان بن گئی ہیں جیسا کہ وہ خود کہتی ہیں:

روتا ہے اندھیرے میں کوئی

بے بات
یونہی چپکے چپکے؟
تم کس کی گواہی چاہو گے
جب رات لہو میں تر نکلے
جب نیند میں ڈوبی ہو یہ زمیں
جب چاند بھی گونگا ہو جائے
جب اک اک تارہ کھو جائے
ہاں
نظمیں جھوٹ نہیں کہتیں۔۔۔!

(نظمیں جھوٹ نہیں کہتیں، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 63

ہیئت:

اردو میں ہیئت کی اصطلاح دو طرح سے استعمال ہوتی ہے۔ اول تو ادب میں صنف کے اعتبار سے اس کی ظاہری شکل وصورت اور اصناف کی ساخت کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے۔ مثلاً غزل کے شعری ہیئت کے لیے دو مصرعوں پر مشتمل ہونا اور ان میں ردیف قافیہ کی پابندی ہونا قرار پاتا ہے۔ جب کہ دوسرے کی ساخت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں ہیئت کو لفظ اور مفہوم کے ساتھ ساتھ اظہار خیال کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ اپنے اندر کتنی وسعت لیے ہوئے ہے۔ اس میں فن پارے کی داخلی ساخت، ترتیب اور خارجی ساخت کی فکری تشکیل اور اس کے مختلف اجزا کے مابین توازن اور تناسب، ربط و آہنگ کے ساتھ پیکریت کو بھی ہیئت کے ضمن میں رکھا جاتا ہے۔ آسکر وائلڈ نے ہیئت کی تعریف یوں کی ہے:

‘‘Form is a myth, it is a secret of life.’’

وہ مزید آگے لکھتا ہے:

"Start with the worship of form, and there is no secret in art that will not be revealuale to you."

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہیئت کا مفہوم صرف اصناف کی ظاہری شکل تک ہی محدود نہیں

رہتا بلکہ وہ اپنی معنویت کے اعتبار سے وزن، بحر، الفاظ اور ربط کے علاوہ اصناف کی ساخت کے داخلی رشتے یعنی خیال اور تصور اور افکار سے قائم ہوتے ہیں۔ان میں لسانی سطح پر معنویت اور تصورات کی ترجمانی الفاظ کی ترتیب استعمال وغیرہ سے ہے جو کہ بنیادی طور پر تکنیک اور فن کارانہ صلاحیتوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

گزشتہ صدیوں کے دوران تخلیق ہونے والی شاعری اپنے مزاج، اسلوب،لفظیات، استعارات، علامت، موڈ، ہیئت، تناظر، فضا، جغرافیائی سطح پر لسانی اور تہذیبی عدم تعاون کے لحاظ سے ایک منفرد شناخت قائم کرتی ہے۔شاعری میں ہیئت کے اعتبار سے ترقی پسندوں کا ایک نظریہ تھا کہ فن میں رمزیت، اشاریت یا ابہام اور علائم کا استعمال قطعی نہ ہو جس سے مقصدیت مجروح ہو اس لیے ان کے یہاں ہیئت کے مقابلے مواد اور موضوع پر زیادہ زور دیا گیا لیکن انہوں نے شاعری میں بھی تجربے کیے۔ یہ تجربے ہیئت کے اعتبار سے بھی اور تجربے کے اعتبار سے بھی ہیں۔

اس سے قبل سرسید، مولانا حالؔی اور محمد حسین آزاد کی کوششوں سے ادب میں نئے افکار اور نظریے پر مباحثے ہو چکے تھے اس میں روایتی شاعری کی مخالفت ہوئی تھی۔اسلوب اور ہیئت کی سطح پر نظم کا ظہور ہوا۔انہوں نے موضوعاتی اعتبار سے نظمیں کہیں، جن میں ہیئتی تجربے بھی کیے جو اکبؔر الہ آبادی اور اقباؔل تک آتے آتے مستحکم ہو چکے تھے لیکن مولانا حالؔی اور آزاؔد نے نظم کے حوالے سے ہیئت کی سطح پر زور دیا تھا۔ترقی پسندوں نے اسے پورے طور پر تو نظر انداز نہیں کیا لیکن خاطر خواہ انجام بھی نہ دے سکیں۔

حلقۂ ارباب ذوق اور جدیدیت کے حوالے سے، جدیدیت کے رجحان تک تجربوں کی شاعری ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق نے انجمن پنجاب کی ان کوششوں کو اپنایا اور شاعری میں ہیئت کے طور پر خوب تجربے کیے۔اس کے شعرا نے ہیئت کے طور پر جو بھی تجربے کیے، وجودیت کے طور پر انفرادی طرز احساس، داخلی کرب، ابہام، پر اسراریت اور نئے استعاروں، نئی نئی تراکیب اور کے ذریعے اردو میں اظہاریہ کو نئے ساخت کے طور پر برتا۔ان کوششوں میں تازگی بھی تھی اور جدت بھی تھی۔حلقہ ٔارباب ذوق میں سب سے نمایاں شخصیت میراؔجی کی ہے۔میراجی نے ہیئت کی سطح پر نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری اور پابند نظمیں وغیرہ کہیں جس میں شعری تجربے بھی کیے۔

ہیئت کے اعتبار سے جدیدیت سے متاثر شعرا نے بھی طرح طرح کے تجربے کیے ہیں۔ان میں سے بہت سے تجربے کامیاب بھی ہوئے اور بہت سے تجربوں کو مسترد بھی کر دیا گیا۔جن شعرا اور شاعرات کے یہاں یہ

تجربے کامیابی سے انجام پاتے ہیں ان میں میراجی ،ن ۔م۔راشد، اختر حسین جعفری، ظفر اقبال، شمس الرحمٰن فاروقی، حکیم منظور، جاوید شاہین، افتخار عارف، ادا جعفری، زہرہ نگار، ساجدہ زیدی، کشور ناہید، شفیق فاطمہ شعریٰ، عذرا پروین اور پروین شاکر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان میں شامل شاعرات کے نسائی حوالے کے ساتھ ہیئت کی سطح پر اپنے فکر کو شعری اظہار یہ عطا کرتی ہیں جن میں تہذیب، عدم مساوات اور حقوق نسواں جیسے مواد کو ہیئت کے طور پر قلم بند کرتی ہیں۔

بیسویں صدی کی خواتین کی شاعری میں بڑی تبدیلی یہ رہی کہ اظہار خیال کے لیے غزل کے بجائے نظم کو زیادہ مناسب خیال کیا گیا اور یوں نظم کی صنف کو خاطر خواہ فروغ نصیب ہوا۔اس دور کی کم وبیش تمام شاعرات کے یہاں غالب حصہ نظموں کا رہا ہے جس میں مقصدی رنگ نمایاں ہیں۔

آزادی سے قبل شاعرات کے یہاں یہ واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے کہ شاعرات نے ہر تغیر وتبدل کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس کے اثرات بھی قبول کیے۔ ہیئت کے اعتبار سے خواہ وہ روایتی شاعری رہی ہو یا مقصدی اور افادی شاعری، انہوں نے اس کو بخوبی نبھایا۔آزادی کے بعد منظر عام پر آنے والی شاعرات کے یہاں ہیئتی تجربے ایک بے باکانہ اظہار کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ان میں قابل ذکر نام زاہدہ زیدی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، ساجدہ زیدی، شفیق فاطمہ شعریٰ، سعدیہ، عذرا پروین اور شہناز نبی وغیرہ ہیں۔

شہناز نبی نے ہیئت کی سطح پر جو اظہار بیان اختیار کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔انہوں نے ہیئتی طور پر جو اکتساب کیا ہے اس سے ان کے ذہنی رویے اور شعری ساخت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔انہوں نے ہیئت کے طور پر نسائی پیکر کو جس طرح سے ابھارا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔عورت کے احساسات اور جذبات کو تخلیقی طور پر محسوس کیا اور کروانے کی کوشش بھی کی۔اور ایسے میں وہ ایک پر اعتماد عورت نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں زندگی کے تلخ تجربے ہیں لیکن انہوں نے اسے کبھی اپنی کمزوری بننے نہیں دیا بلکہ اسے اپنی طاقت سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ان کے یہاں زیادہ تر آزاد اور نثری نظمیں ملتی ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے تلخ تجربات کو کہانی کے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔نظموں کے عنوانات بھی اپنے آپ میں جدت لیے ہوئے ہیں۔انھوں نے مختصر اور طویل دونوں طرح کی نظمیں لکھی ہیں۔ان کی نظموں میں اکثر پہلے مصرعے کے مقابلے میں دوسرا اور تیسرا مصرع مختصر پھر طویل اس کے بعد پھر مختصر ہوتا ہے۔

شہناز نبی کا انداز بیان اپنے معاصر پیش روفن کاروں کے مقابلے قدرے مختلف ہے اور حقیقت سے قریب بھی ہے۔ ان کے پہلے مجموعے ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' میں اظہار کا رنگ حقیقی اور تلخ ہے اس کے بعد ''پس دیوارگریہ'' میں جذبوں کی آنچ سے ذرا نرمی ہے لیکن لہجے کا کھردراپن اور ترش یہاں بھی ملتا ہے۔ ان کے موضوعات ومضامین بھی زیادہ تر ایسے ہیں جن پر ان کے معاصرین شاعرات نے قلم اٹھایا ہے لیکن بعض موضوعات فن کے اعتبار سے اور اظہار ذات کے اعتبار سے بے ترتیب زندگی، ناقدری، تلخ وشیریں اور نسائی کرب کے بیان میں فن کی صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے وہ اس لیے کہ ان کے موضوعات کے برتنے کا انداز، باریک بینی، گہرا مشاہدہ، زبان کی کڑواہٹ اور احتجاجی وانقلابی رویہ ہی ان کی انفرادیت ہے۔ شہناز نبی نے ہیئت کی سطح پر جارحانہ رویہ اپنایا۔ اپنی نظموں میں سیاسی جبر، نسائی کرب، عدم مساوات اور طبقہ نسواں کے استحصال کے موقعے پر جب انھوں نے اپنے خیالات ونظریات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے وہ دراصل اردو شاعری میں ایک نئی آواز کا اضافہ دکھائی دیتی ہیں۔ ا

شہناز نبی کی نظموں میں نسائی کرب، سماج کا دکھ درد اور ناآسودگی کے احساسات ایک بامعنی پیکر بن کر ابھرتے ہیں۔ ہیئت کے تجربے کے طور پر موضوعات کے حوالے سے وہ شعری پیکر کی تجسیم وہ بڑی خوبی اور فنی مہارت کے ساتھ کرتی ہیں۔ یہ مہارت وہ تجریدیت کے گراف میں اس طرح پیش کرتی ہیں کہ نظم اپنے آخری دور میں پہنچ کر ڈرامائی انداز اختیار کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''مکڑی کے جالے'' ملاحظہ ہوں:

مٹی کے چولہے سے نکلتے ہوئے شعلے
ابلتا ہوا دھواں
سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں
تاؤ دینے کے لیے
تاڑ کے پتوں سے بنا پنکھا
اوس میں بھیگا پیلا پیلا آنگن
چھپر پہ بیٹھی گوریا
بجلی کے تاروں سے الجھی پتنگ
ٹاٹ کے پردے کے پیچھے

کاجل بھری دو آنکھیں
چوڑیوں سے کھنکتی کلائیاں
رہ رہ کے جھلکتی ہیں

(مکڑی کے جالے، شرارجستہ) ص64

مذکورہ بالا نظم میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے ''کاجل بھری دو آنکھیں'' غرض کی پوری نظم ڈرامائی انداز لیے ہوئے ہے۔ 'گوریاں'، 'کبھی یہ سوچتی ہوں'، 'سنڈریلا'، 'کولاژ'، 'میں جلدی میں ہوں' جیسی نظمیں اسی طرز پر ہیں۔ ان کی بعض نظموں میں تجربات کو کہانی کے طور پر بیان کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ نظم میں ہئیت کے طور پر وہ علامت ،استعارے، موضوع اور مواد میں گہرائی پیدا کرتی ہیں۔

شہناز نبی کے یہاں جو نئے تجربے ملتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ کسی شاعر کے شعر کے ایک یا دو ٹکڑے کو عنوان دے کر اپنی پوری نظم تخلیق کرتی ہیں۔ ان کی یہ انفرادیت ہے جو ہمیں ان کے معاصرین کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی ہیں۔ انہوں نے میر تقی میرؔ، فیضؔ، غالبؔ وغیرہ کے شعر پر اپنی نظم تخلیق کی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نظم ملاحظہ ہوں:

قشقہ کھینچو
دیر میں بیٹھو
یا اب ترک اسلام کرو
نام تو ہے پہچان تمہاری
کس کس کو سمجھاؤ گے
اب تسبیح کے بکھرے دانے
کس زنار سے باندھو گے
قدم قدم سوسو دیواریں
دیواروں میں پھر کہاں
اب تو دیر کے سارے رستے
دیر سے جا کر ملتے ہیں
اب تو حرم کے دروازے بھی

حرم پر ہی بس کھلتے ہیں
میؔر جی گھر سے جب بھی نکلو
شہر کا نقشہ جیب میں ہو
بھول بھٹک کر مندر مسجد گرودوارہ مت ایک کرو
اپنا مذہب، اپنا نام اور اپنی بولی یاد رہے
بھاڑ میں جائے ساری دنیا
اپنا گھر آباد رہے

(میؔر جی جب گھر سے نکلو، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 65

اس طرح ان کے یہاں کئی نظمیں نمونے کے طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔شہناز نبی نے زبان کے اعتبار سے ہیئتی طور پر تجربے کیے ہیں۔انہوں نے کئی زبانوں کو منضبط کر کے پوری نظم تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے اور اس تجربے میں وہ کامیاب رہی ہیں۔نظم پیش ہے:

دکھائی دیے یوں کہ
ہم جیسے بے خود بھی
ہشیار آنکھوں سے تکنے لگے
ایسے اجلے نین
ایسا بانکا سجن
پہلے دیکھا نہ تھا
ایسے تیکھے برن
تجھ سا چنچل ہرن
پہلے دیکھا نہ تھا
تیرے لہجے میں ابلیس کی عملیت
مسکراہٹ میں بچوں کی معصومیت
میرے صوفی نمن
تجھ سا شاہِ زمن

پہلے دیکھا نہ تھا

(اے میرے اہرمن، اگلے پڑاؤ سے پہلے) ص66

شہناز نبی نے ہیئت کے طور پر اپنی نظموں میں لوک کتھا اور اساطیری پہلو کے بھی تجربے کیے ہیں۔ان کی بعض نظموں میں ہندومیتھالوجی کی مذہبی کہانیاں دیکھنے کوملتی ہیں۔نظم ''گھوڑے کی پیٹھ،تم اور میں'' پرتھوی راج راسو کی یاد دلاتی ہے۔''کالی کھیتز''میں برہجا، وشنو، مہادیو اور ستی کے ذریعے اظہار خیال کیا ہے۔ان کے یہاں دشینت ،ارجن، دروپدی، شکنتلاوغیرہ کی لوک کتھا دیکھنے کوملتی ہیں۔

ان کی شاعری میں اکیلی عورت کی پیکر تراشی دیکھنے کوملتی ہے جو باوجودا کیلے ہمت اور حوصلے سے بھرپور ہے۔ہیئت کی سطح پر ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے علائم اور استعارے کا استعمال تذکیر اور تانیث کے طور پر کیا ہے۔جیسے عورت کے لیے پھول، تتلی، چڑیاں، گوریا وغیرہ اور مرد کے لیے کالا بھنورا، بھیڑیا، لومڑی، سیار، چوہا وغیرہ۔انہوں نے فن کی ظاہر ڈھانچے میں ہیئتی تجربے کیے اور داخلی سطح پر تانیثی افکار کو زیادہ تر اپنایا ہے۔المختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی نے اپنی شاعری میں ظاہری اور داخلی سطح پر ہیئتی تجربے کیے ہیں اور اس میں کامیاب بھی رہی ہیں۔

اسلوب:

شہناز نبی کی شاعری میں جہاں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے وہیں ان کے یہاں اسلوب اور تکنیک میں بھی جدت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں الفاظ کا صاف ستھرا رچاؤ اور سلیقہ موجود ہے۔ان کے اسلوب لفظیات اور متن کی تہہ داری میں معنی ومفاہیم کے ذریعے ان کے خیال اور فکر کے دھارے تک بہ آسانی رسائی ہوتی ہے۔ان کی شاعری سے جو مفاہیم ابھرتے ہیں اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں تفہیم وترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔اگر ان کی نظموں میں شعری ساخت ،لفظوں کا استعمال، ان کے معنی ومفاہیم کے حقیقی اور شعوری تناظر کا جائزہ لیا جائے تو وضاحت اور صراحت کے علاوہ جذبات احساس کے اظہار سے ان کی شاعری مزین نظر آتی ہے۔ اسلوب میں رمزیت، اشاریت، علامت و استعارات، کہاوتیں، محاورے، لوک کتھا، تلمیحات وغیرہ دیکھنے کوملتی ہیں۔اظہار کے وسیلے سے ان کی تمام شاعری ماضی اور حال کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

ان کی شاعری میں ارتقائی صورتحال صاف طور سے دیکھی جاسکتی ہے شروع سے لے کر اب تک ان کے فکر وفن مختلف مدارج زینہ بہ زینہ طے کرتے نظر آئے ہیں۔ان کے شعری مجموعوں کو اگر اسلوب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ''اگلے پڑاؤ سے پہلے''میں ان کا اسلوب بے باکانہ اور جرأت مندانہ ہے۔''پس دیوار گریہ''میں ان کے یہاں تھوڑی نرمی ہے لیکن لہجے کی تلخی وترش کم نہیں ہے۔وہیں ''شرار جستہ''میں ان کے خیال شرار کی طرح بھڑک اٹھے ہیں اپنے دل کے درد کو وہ علامتوں کی صورت میں اپنی نظموں میں بھر دیتی ہیں۔زندگی کی کڑواہٹوں، تلخ تجربوں اور سفاکیوں کے بیان میں حقیقت پسندی سے کام لیتی ہیں۔سوچ اور فکر کے ساتھ لفظیات میں بھی نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔وقت کے ساتھ ان کا مشاہدہ بھی تلخ ہوتا جارہا ہے جس کا اثر ان کے اسلوب میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے اس سے ان کی لفظیات میں تبدیلی ہوئی جن سے اظہار کی شدت اور تلخ نوائی کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی کئی نظموں میں طنزیہ طریق کار اپنایا ہے نظم ''معصوم بھیڑیں''ان کا یہ طنزیہ انداز دیکھا جاسکتا ہے۔

اک چراگاہ
سو چراگاہیں
کون ان ریوڑوں سے گھبرائے
پڑ گئیں کم زمینیں اپنی تو
کچھ سفر کچھ حضر کا شغل رہے
کچھ نئی بستیوں سے ربط بڑھے
ان کو آزاد کون کرتا ہے
یہ بہت مطمئن ہیں تھوڑے میں
اک ذرا سا گھما پھرالاؤ
کچھ ادھر ادھر چرالاؤ
بھیڑیں معصوم
بے ضرر سی ہیں
جس طرف ہانک دو
چلی جائیں

(معصوم بھیڑیں، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 67

اس نظم کے متعلق ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے کہ:۔

''شہناز نبی کی نظم ''بھیڑیں'' میں طنزیہ طریقہ کار اور علامتی معنویت کے سبب تانیثیت کے اظہار قدرے مختلف اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔'' 68

ان کے یہاں 'سفید چوہے'، 'کالے بھنورے'، 'معصوم بھیڑیں' وغیرہ علامتی استعارے معنویت کی گہرائی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں جو زندگی کی سنگین حقیقتوں، ملک کے سیاسی منظرنامے اور ناگفتہ حالات کے اظہار سے مناسبت رکھتے ہیں۔ سیاسی و معاشرتی ظلم و چیرہ دستیاں تیکھے اور کاٹ دار انداز میں اظہار پا گئی ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

سفید چوہوں نے مہمان نوازی کے بہانے
تمہارے کھلیان ہڑپ لیے
سڑپ گئے تمہارے کنویں
تمہارا فرمانبردار پتلون کی دکان میں سجا
کسی گاہک کا منتظر
فوجی عیاش عورتوں کے رکھیل
پیشوا فرقہ بندی میں مصروف
محل در محل چڑیوں کا ڈیرا
کھیتوں میں بھوک کا پہرا

(عبرت، پس دیوار گریہ) 69

ایک اور نظم 'انتقام' میں انھوں نے پتی، کلی، غنچے، تتلی بھنورے ان الفاظ کا استعارے کے طور پر معاشرے کی سیاسی و سماجی ماحول کی عکاسی اس طرح سے کی ہے کہ پوری نظم معنیاتی سطح پر بڑی اثر انگیز بن گئی ہے نظم ملاحظہ ہو:۔

پچھلے برس پیلے پڑتے ہوئے پتوں نے
اگلے برس کا آنے کا وعدہ کیا تھا

اجاڑ بن میں کوئی کب تک
شاخوں پر نظریں جمائے بیٹھا رہے
خاکستری چھالے کی موٹی پرت
سرکنے کا نام ہی نہیں لیتی
کتنی پتیاں اندر ہی اندر مرجھا رہی ہیں
لاتعداد کلیاں سانس لینے سے پہلے
دم توڑ رہی ہیں
غنچے خودکشی پہ مجبور
تتلیاں چمن سے گریزاں
بھنوروں کی گن گن مفقود
اوس کی بوندیں خلا میں سرگرداں
فطرت کی گود میں دور دور تک تیزاب کی تپکتی لہریں
فاختائیں پھندوں کی گرہ کھولنے کی کوشش میں
اپنی اپنی چونچ زخمی کر چکی ہیں

(انتقام، شرار جستہ) ص 70

تنہائی، مایوسی، بے چارگی و بے بسی جیسی علامتیں موضوعی اسلوب کے اعتبار سے اردو شاعری کا مزاج رہی ہیں۔حادثوں، محرومیوں، ناکامیوں کے کرب سے گذرنے والا فنکار جب اپنی نظموں میں ایسی علامات کا استعمال کرتا ہے تو وہ اپنی ذات میں بکھرا ہوتا ہے اور وہ شاعری کے ذریعے اپنی ذات کے عرفان کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔شہناز نبی کے یہاں ہمیں ایک مثبت فکر دیکھنے کو ملتی ہے وہ تنہائی کا شکار ہو کر بھی مایوس نہیں ہوتی ہیں بلکہ امید کی ڈور تھامے وہ آگے بڑھتی رہتی ہیں ان کی علامتیں بھی زندگی سے بھرپور ہوتی ہیں۔نظم ''مجھے ایسا لگتا ہے'' مثال کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے
جیسے میرے چاروں جانب
اک گھنا جنگل اگ آیا ہے

اس جنگل میں پھیلنے والے اندھیروں کو گرفتار کرنے کے لیے
کرنوں کا جال پھیلانا ہوگا
اوراس کے لیے ضروری ہے کہ
سورج اپنا نقاب اتار پھینکے
جنگل میں مرتی ہوئی شاخوں کو زندہ کرنے کے لیے
پہاڑوں سے اترتی ہوئی ندی کی ایک لہر کو
جنگل کا پتہ بتانا ہوگا

(مجھے ایسا لگتا ہے، شرار جستہ) 71؎

مذکورہ بالا نظم میں گھنا جنگل یاس اور ناامیدی ہے، کرنیں امید کی علامت ہیں، سورج سوچ کی یا ذہن کی علامت ہے۔اس طرح ان کے یہاں علامتوں کا بے پناہ استعمال دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ان کے ان علامتوں کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ہمیں زندگی کے خوش رنگ پہلوؤں سے متعارف کراتی ہے ایک اور نظم دیکھیں:۔

ان آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں
نئے نئے سے اجلے خواب
اندر کا سنسان جزیرہ
چہکاروں سے گونج رہا ہے
چاروں جانب چھل چھل کرتا نیلا پانی
پور پور کو سینچ رہا ہے
مری سوکھی، مری ہوئی شاخوں پہ تازہ پھول لگے ہیں
مری چھاؤں بڑھتے بڑھتے کئی سمندر لانگھ چکی ہے
پھاند چکی ہے کئی جزیرے
جانے انجانے سب چہرے
پتھر کی دیوار بنے ہیں
سرد ہوائیں آتے جاتے میرا سینہ چیر رہی ہیں
دل میں حسرت اٹڈ رہی ہے

پھر جالے لگ جائیں مجھکو

(نئے جالے، شرار جستہ) 72

اس طرح شہناز نبی کے یہاں ہمیں ایسی بے شمار علامتیں واستعارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کی شاعری کا انحصار زیادہ تر ان ہی علامتوں اور استعاروں پر ہے ان کی چند اہم علامتیں یہ ہیں:۔جنگل، درندہ، بیل، چٹانیں، پنجرہ، کہاسا ، نیلا آسمان، پیڑ ، چھاؤں، بوند، خزاں، آسیب، سبزہ ،اژدہا، پتھر، کٹیلے تار، آندھی، سورج، وغیرہ۔ان کے استعاروں میں گوریاں، سیار، لومڑی بھنورا، تتلی، چڑیاں، مینا، بھیڑیں، چوہے، وغیرہ قابل ذکر ہے۔شہناز نبی کی نظموں کا جائزہ لینے کے بعد اردو کے جید ناقد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''شہناز نبی کی نظمیں ایک بہت پیچیدہ ذہن اور با شعور شخصیت کا پتہ دیتی ہیں۔ابہام اور استعارہ ان کی نظموں کا بنیادی وصف ہے۔'' 73

شہناز نبی کے یہاں کیفیت سازی کے تخلیقی امور سے مزین خیال وفکر دیکھنے کو ملتے ہیں جو خوابوں کی تعبیریں پانے کی حسرت اور پھر خوابوں کے بکھرنے کے المیے سے جانبر د ہونے کی کوشش سے عبارت ہے۔ان کے یہاں دلی کیفیات کا اظہار مختلف پیرائے میں ہوا ہے۔وہ دل کی بے چینیوں کا اظہار بڑے دردمندانہ انداز میں کرتی ہیں ایسی نظموں میں کہیں نرمی ہے تو کہیں بے بسی۔ان کی نظم ''اوندھے منھ گرنے سے پہلے'' میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا بیان ملتا ہے۔اس میں کیا شک ہے کہ آج کا انسان مشین بن گیا ہے پھر بھی وہ کبھی اپنے لیے، کبھی دوسرے کے لیے خطرات مول لیتا ہے۔نظم پیش ہے:

کب تک یوں ہی برستا رہے گا چابک
میری تھکی ہوئی پیٹھ پر
سرپٹ بھاگتے بھاگتے
میری سانسیں اکھڑ چکی ہیں
آنکھیں حلقوں سے باہر
میرے ساتھ پہلا قدم مارنے
والے جانے کہاں تھم گئے ہیں

اور تیز اور تیز کی صدا
خون کی روانی میں لاوے انڈیل رہی ہے
میں ہر ضرب کو مات دے کر
اپنی کسر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے
شاید اک دم رک جاؤں
تماشا دیکھوں
اپنے پرزے کے اڑنے کا
لیکن ان کا کیا ہوگا
جنہوں نے مجھ پر داؤ لگا رکھے ہیں

(اوندھے منھ گرنے سے پہلے۔پس دیوار گریہ) 74

اس نظم پر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اپنے تاثرات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''ایسی نظمیں پڑھ کر زندگی سے اعتبار اٹھنے لگتا ہے لیکن نظم کی متکلم خود ہمارا وجود بننے لگتی ہے۔اس قدر تلخ لیکن خود آگاہ ہم بھی ہوتے تو کیا برا تھا۔'' 75

اسی طرح دنیا کی بڑی طاقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے 'نظام شمسی' میں سورج کی طرف جبر اور قہر کا اشارہ کرنے کا انداز بھی بڑی بلیغ صورت میں ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے

بڑی آگ ہے تجھ میں
چل تجھے قطب شمالی میں دفن کرتے ہیں
چھوٹے چھوٹے سیاروں کی بھی اپنی زندگی ہوتی ہے
انہیں اپنے اپنے کرے پہ گھومنے دے
کس میں پانی ہے، کس میں ہوا
یہ دیکھنا ترا کام نہیں

(نظام شمسی، پس دیوار گریہ) 76

شہناز نبی کی تشبیہات و استعارات کا اپنا الگ ہی نظام ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری ایک نوع کی تازگی کا احساس رکھتی ہے۔مثال دیکھیں:۔

ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے زنجیر بنانا
ایک عجیب سا کھیل تھا بچپن کا
رنگ برنگی سنہری روپہلی چوڑیاں
پہلی کے چاند سی

(زنجیر، اگلے پڑاؤ سے پہلے) 77

اس نظم میں چوڑی کے ٹکڑے کی باریکی کو پہلی کے چاند کی باریکی سے تشبیہ دی ہے۔ 'نظم ایک لجلجا لفظ' میں وہ لفظ کو تازے کھلے پھول پہ پڑی شبنم کی بوند سے تشبیہ دی ہے ملاحظہ ہو:۔

تم اتنے صاف شفاف
جیسے گلِ نورس پہ شبنم کا قطرہ

(ایک لجلجا لفظ، پس دیوار گریہ) 78

شہناز نبی کی اس تشبیہ کو نادر تو نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اردو شاعری میں شبنم اکثر وں شاعروں کے یہاں تشبیہ کے طور پہ استعمال ہوا ہے لیکن پیش کش کا انداز بڑا ہی خوبصورت ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

شہناز نبی نے زندگی اور معاشرے کے اہم مسائل بالخصوص عورتوں کے مسائل کو اپنی شاعری میں جذب کر کے تخلیقی عمل کو وسعت دی ہے۔ ان مسائل کو پیش کرنے میں کہیں کہیں ہمیں ان کا لہجہ احتجاجی دکھائی دیتا ہے تو کہیں انقلابی گھن گرج سنائی پڑتی ہے۔ ان کی حقیقت نگاری بیانیہ کے انداز میں ظاہر ہوتی ہے جس میں معنویت پوشیدہ ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے جو تصویری پیکر ابھارے ہیں وہ بدلتے حالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تھالی کا بینگن ہونا محاورہ ہے لیکن شہناز نبی نے اس کو عورت کی ذات سے تشبیہ دے کر ایک انوکھی مثال قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظم دیکھیں:۔

منو تو ٹھیک کہتا ہے
کہ بچپن سے بڑھاپے تک
سلاسل اک نہ اک درکار ہے اس ابلا ناری کو
کبھی بابا کے کھونٹے سے
کبھی بھائی کی راکھی سے

کبھی بیٹے کی تھالی میں
لڑھکتے بینگنوں سی میں

(افتادگی، نظمیں ہماریاں) 79

شہناز نبی نے نہ صرف لفظوں کی ساخت اوراس کے حقیقی معنی کو ہی تشبیہ کے طور پہ استعمال نہیں کیا ہے بلکہ مجازی معنی کے اعتبار سے بھی تشبیہ دے کر اپنی نظموں میں جدت وندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں ایک مثال دیکھیں:۔

وہ یہ چاہتی تھی کہ دنیا کی آنکھیں اسے دیکھتی جائیں
یوں دیکھتی جائیں
جیسے کوئی پیڑ کی نرم ٹہنی کو دیکھے

(انمٹ سفر کی علامت، نظمیں ہماریاں) 80

خواہشیں بڑی منہ زور ہوا کرتی ہیں اس کی بات کو تو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے اس میں انسانی نفسیات کا عمل دخل ہے انسان کی خواہشات کبھی ختم نہیں ہوتیں ایک کے بعد دوسری پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جب انسان پیری میں قدم رکھتا ہے تو اس کے اندر اور بھی طرح طرح کی خواہشات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔شہناز نبی نے اپنی ایک نظم میں ایک بوڑھی ماں کی ان ہی خواہشات کو موضوع بنایا ہے جہاں ماں زندگی کے آخری پڑاؤ میں ہے اور اپنے بیٹے کے ساتھ وقت گذارنے کا سپنا بنتی رہتی ہے شہناز نبی نے اس منظر کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔

ایک مرجھایا چہرہ
آنکھیں موندے
بازوؤں کے درمیاں
کانوں میں ان گنت آوازیں
تتلی کی طرح اڑنے کی خواہش
سسکی میں بدل جاتی ہے　　(فاصلے، شرارجستہ) 81

اپنی نظموں میں ڈرامائیت پیدا کرنا شہناز نبی کا خاصا ہے۔اس انداز پیش کش سے نظموں میں جاذبیت پیدا ہوگئی ہے اور وہ بڑی دلچسپ لگتی ہیں جس کو پڑھ کر قاری کو سرور حاصل ہوتا ہے۔شہناز نبی کا یہ انداز ان کی نظموں کو

منفرد بناتا ہے' گوریاں'، 'مکڑی کے جالے'، کبھی یہ سوچتی ہوں'، 'سنڈریلا'، 'کولاژ'، 'اپسرڈ'، 'میں جلدی میں ہوں' اسی طرح کی نظمیں ہیں جن میں ڈرامائیت ہے یہ نظمیں شہناز نبی کی جدت طرازی کی پہچان ہیں۔ایک نظم دیکھیں:۔

وہ متکلم اور مخاطب کے بیچ
غائب ہوتے ہوئے بھی
ہمیشہ موجود رہتا ہے
میں اس کا ذکر کئے بغیر
گفتگو کرنا چاہتی ہوں
لیکن وہ بے ارادہ ہی
مری کہانی کا مرکزی کردار بنتا جاتا ہے
منظر سے جانے کو کہوں تو
پس منظر بن جاتا ہے
خاموش ہونے کو کہوں تو
بازگشت ہو جاتا ہے
وہ مری ہدایت کی حد سے باہر
ایک ایسا کردار ہے
جو اپنی مرضی سے
رنگ منچ پہ نمودار ہوتا ہے
پردہ گرنے کے بعد
وہ ناظرین کی پہلی صف میں بیٹھا
مرے المیے پر آنسو بہا رہا ہوگا

(اپسرڈ، پس دیوار گریہ) 82

اس نظم کی فضا میں اداسی ہے اور ایک طرح کا شکوہ بھی۔تخلیقی اظہار میں اسلوب بیانیہ سے ہم آہنگ نظر آتا ہے جس میں ڈراما کے عنصر کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ شاعرہ کے طرز کلام کا ہی کمال ہے جس میں آپ بیتی جگ بیتی میں نظر آتی ہے۔

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں نئی نئی تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کے اسلوب میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ ندرت خیال اور جدت بیان دونوں نے ان کی نظموں کو وقار بخشا ہے۔ 'سانحہ'، گھنا کہاسا'، 'حقیقت بے محابا'، 'عذاب تمنا'، میں کیوں مانوں'، 'میرے دوست مجھ سے خفا ہوگئے'، 'تمہارے لئے'، 'گمشدگی'، 'ناسٹلجیائی' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جس میں نئی ترکیب دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شہناز نبی کے اسلوب کی ایک اور خاصیت ہے کہ انھوں نے نئی ترکیب کے ساتھ اپنی کئی نظموں میں استفہامیہ انداز م اپنایا ہے اور ایسے سوالات قائم کیے ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ مثال دیکھئے:۔

لومڑی کے راج میں ندیاں الٹی چلیں گی۔؟
بارشیں بے وقت ہوں گی۔؟
زلزلے بے سبب آئیں گے۔؟
آگ بے موقعہ لگے گی۔؟
کیا تجربے لومڑی کو چالاک بنا دیں گے
یا وہ سیاروں کی عیاری کا شکار ہوجائے گی۔؟
کیا جنگل پر سفید فام شیروں کی حکمرانی ہوگی۔؟

(جنگل راج، شرار جستہ) 83

شہناز نبی کے یہاں ہمیں پیکر تراشی کے بھی عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں فنی مہارت کے ساتھ ایسے ایسے پیکر تراشے ہیں جو ہو بہو زندہ معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے غیر جاندار چیزوں میں بھی اپنے خیال کی وسعت اور فنی چابکدستی سے جان پھونک دی ہے۔ 'جان نشین'، 'ناقد سے'، 'موسم کی آہٹ'، 'گھنا کہاسا'، 'ڈرائنگ روم بوائز'، 'سوگندھی سے'، 'پھر مت کہنا'، 'کھیل'، 'خود میں جینے کی رت' جیسی بے شمار نظمیں ان کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں جو پیکر تراشی کی مثال ہیں۔

گھنے کہاسے میں معدوم ہوتے ہوئے چہروں کے خطوط
نئی تفہیم کا تقاضہ کرتے ہیں
لودیتے ہوئے جذبے ناکام
ریتیلی یادوں کو بہت نچوڑا

ہلکی سی رمق بھی نہ ملی
رنگوں کو پھر سے ٹٹولا
کسی میں کوئی جادو نہیں

(گھنا کہا سا، شرارجستہ) 84

تمہیں نہ سوچوں تو
ہوائیں لنگر ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں
دیوں کو سانس نہیں آتی
چاند پہن لیتا ہے ماتمی لباس
ایک ایک گر پڑتے ہیں ستارے
آسمان کی پھٹی ہوئی اوڑھنی سے

(تمہیں نہ سوچوں تو، پس دیوارگریہ) 85

سورج پہ کوئی کمند ڈال سکا ہے بھلا
لیکن حرارت تو نچوڑی جا ہی سکتی ہے
کھلے ہوئے گلابوں سے لگے کانٹوں پر بھی
ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لی جائے
تو کیا برا ہے
جنہوں نے آنسوں پٹائے
نامرادیوں کی فصل کاٹی
ہم نے یادیں دفنا دیں
اور نئے چہروں کی کاشت کا بیڑا اٹھایا

(میرے دوست مجھ سے خفا ہو گئے، پس دیوا گریہ) 86

مذکورہ بالا دونوں نظموں میں شہناز نبی نے یادوں، رنگوں، ہوا، دیا، چاند، ستارے، آسمان، حرارت، نامرادی کو پیکر میں ڈھالا ہے۔

شہناز نبی کے یہاں نادر تشبیہات واستعارات کے ساتھ ساتھ عمدہ تلمیحات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انھوں

نے تاریخی، سیاسی و اسلامی واقعات کو اپنی نظموں میں خوبصورت تلمیح کے ذریعہ پیش کیا ہے جس سے اس نظم کو پڑھتے وقت قاری کو نظم سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:۔

تمہاری ہتھیلیوں میں گڑی میخوں کا درد
مری ہتھیلیوں تک پہنچ رہا ہے
تمہارے بہتے ہوئے لہو کو
میں اپنی صلیب پہ محسوس کر سکتی ہوں
تمہارے لیے اتنی ساری مومی شمعیں جلائی گئی ہیں
میں ان کی روشنی میں
تمہارے چہرے کی معصومیت کو
گہرا ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں
تمہارے لمس کا جادو
مردوں کو زندہ کر دیتا تھا

(میخوں کا درد، شرار جستہ) 87

اس نظم میں عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ شہناز نبی نے اس نظم میں عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پہ لٹکائے جانے سے لیکر ان کے مردوں کو زندہ کر دینے والے کرامت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

وہ تھا ایک لمحہ تخلیق
جس نے آگ روشن کی
تڑپتی تھی صفورہ درزہ سے
اور موسیٰ کو
سر وادیٔ سینا نور کا لپکا نظر آیا
خدائے عز و جل سے
ہمکلامی کی سعادت حاصل ہو گئی
ملا عہدہ پیغمبر کا
مگر وہ کوکھ میں جس نے

مہینوں تھام کر رکھا
محبت کا منزہ لمحہ
جس نے غنچۂ نورس کو چٹکایا
سر شاخ رفاقت
جس نے لوری کے بنے ہیں بول
ولی ہے وہ
نبی ہے
اور نہ پیغمبر (دردزہ، پس دیوار گریہ) 88

موضوع کے اعتبار سے یہ نظم تانیثی پہلو رکھتی ہے اور عورت کے مساوی حقوق کے لیے اللہ سے کیا گیا ایک شکوہ ہے لیکن اس پوری نظم نے شہناز نبی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے، کوہ طور پر اللہ کا دیدار پانے والے واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر اپنی نظم تخلیق کی ہے۔

شہناز نبی کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو ہندو میتھالوجی سے بھی لگاؤ ہے۔ اپنی نظموں میں انھوں نے جگہ جگہ مندر کا بھی ذکر کیا ہے اور ہندو دھرم کے رسوم رواج کا بھی۔ اتنا ہی نہیں انھوں ہندو دھرم کی پورا نک لوک کتھاؤں پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ 'تاریخ کے مردہ خانے سے'، 'کالی کھیتر'، 'گھوڑے کی پیٹھ، تم اور میں'، 'ہم سائیکی'، 'گیان'، 'نیا ادھیائے'، 'دور اندیش' اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

ہندو دھرم کی تہذیب اور ان کے رسموں کا ذکر ان کی نظم 'نہ جائے رفتن' میں دیکھ سکتے ہیں:۔

ہم نے جس در پہ دستک دی
ہمارا والہانہ استقبال کیا گیا
پیشانی پہ چندن کا ٹیکا
گلے میں پھولوں کی مالا
جگمگاتے دیئے کی آرتی
تعظیم تکریم، انعام واعزاز

(نہ جائے رفتن، شرار جستہ) 89

مساموں سے پھوٹتے اجالوں کی یورش میں
بہہ نکلے جانے کتنے میر وسودا
کتنے کالیداس
الٹی پوتھی پکڑے پکڑے
جانے کب ڈھائی اکھشر سیدھے
ڈھائی الٹے پڑھے
اور دریا میں ڈوبکی لگانے سے پہلے
سرسوتی کو کہتے سنا
دشینت کی انگوشتری لہروں کے حوالے کردو
مچھلیاں چغل خور ہوتی ہیں
بھرت کو اپنے اندر تھامے رہو
تا ابد

(تاریخ کے مردے خانے سے، پس دیوار گریہ) 90

اس نظم میں راجہ دشینت اور شکنتلا کی اس کہانی کا ذکر ہے جب راجہ دشینت نے شکنتلا کو جنگل میں دیکھا اور اس کی محبت میں گرفتار ہو کر شادی کر لی اور نشانی کی طور پر اپنی انگوٹھی دے کر چلے گئے تھے۔شہناز نبی نے اس کتھا پر اپنی نظم تخلیق کر کے اس میں اساطیری عنصر کو نمایاں کیا ہے جس سے نظم کی کیفیت کافی پراسرار ہوگئی ہے۔

مرے دشمن کی آنکھیں مجھ سے بھی زیادہ تیز ہیں
اسے پتہ ہے کہ کب مرا تیر ترکش میں ہوتا ہے
کب میری نظر مچھلی کی آنکھ سے بھٹک جاتی ہے
کب پھولوں کا رنگ اترنے لگتا ہے
کب بیری کے بیر جھرنے لگتے ہیں
سیتا کی سوئمبر میں
سیتا کی پریکشا لی جاتی ہے
اس کی بہادری اور ذکاوت کا امتحان ہوتا ہے

کامیابی کی صورت میں اسے راون کا انتخاب کرنا ہوتا ہے
جو اسے گھنے جنگلوں کے حوالے کر کے
آسمانوں میں اڑتا پھرے گا
اس کی لنکا میں کبھی آگ نہیں لگائی جائے گی
وہ اپنے ایک ہی سر سے
دس سروں جتنا کام لے گا
وہ روپ بہروپ میں یقین نہیں رکھتا
وہ ساری لکیریں خود ہی کھینچتا اور مٹاتا ہے
ایسے میں سیتا کیا کرے
ورمالا گوندھنے والے دھاگے کو چٹکا دے
دھنش کو توڑ دے
مچھلی کی آنکھ کو نشانہ بنائے
یا راون کو

(میرے دشمن کی آنکھیں، نظمیں ہماریاں) 91

اس نظم میں سیتا کے سوئمبر کا ذکر ملتا ہے لیکن شہناز نبی نے اپنے تخیل سے کہانی میں تھوڑا بدلاؤ لا دیا ہے اس وقت رام نے سیتا کے سوئمبر کو جیتا تھا لیکن ان کے خیال کے مطابق اب رام جیسے گن والے آدمی ہے ہی نہیں سارے راون ہیں ۔سیتا نے رام کے ساتھ ون واس کیا تھا لیکن آج کی سیتا کا راون اسے خود قید کر کے آزاد گھوم رہا ہے۔راون کے پاس دس آدمی کی طاقت تھی اس کے پاس دس سر تھے لیکن آج کا راون ایک ہی سر سے دس آدمی سا کام لیتا ہے۔ پہلے کے راون نے روپ بدل کر لکشمن کے ذریعے کھینچی گئی ریکھا کو مٹا دیا لیکن آج کا راون روپ نہیں بدلتا وہ خود ریکھا بناتا مٹاتا ہے۔غرض اس پوری نظم میں شہناز نبی نے سیتا کی کہانی کو نئے عہد کے زاویئے سے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں جگہ جگہ محاوروں اور کہاوتوں کا بھی استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی نظموں میں معنی خیزی اور اثر آفرینی کی قوت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ محاورے ہمارے روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے

والے محاورے ہی ہیں جن تک قاری کی آسانی سے رسائی ہو جاتی ہے۔ شہناز نبی نے اپنی جن نظموں میں محاوروں کو استعمال کیا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔ 'مرا دل نہ روئے'، 'میں کیوں مانوں'، 'جھیل اور دائرے'، 'بس ایک لمحہ ضروری ہے'، 'نئے موسم کی آہٹ'، 'توازن'، 'بابل مورا'، 'اجل مجھ سے مل'، 'کوئی اتنا یاد نہ آئے'، 'اپنے لیے ایک مشورہ وغیرہ۔ مثال دیکھیں:۔

سفر میں یوں ہی
بادلوں سے جدا ہو کے بکھری ہے بارش
بن کھلے پھول مرجھا کے
گرتے رہے ہیں زمین پر

(مرا دل نہ روئے، پس دیوار گریہ) 92

زمانہ ہوا کہ سبھی ڈھور ڈنگر ہنکالے گئے ہیں
کہیں لے گئے ہیں اٹھا کر
وہ نازوں کی پالی
وہ آنکھوں کا تارا

(آج کی بات، نظمیں ہماریاں) 93

ان کے علاوہ شہناز نبی نے اپنی نظموں میں بہت سارے محاوروں کا استعمال کیا ہے جو درج ذیل ہیں:۔

پتھرا جانا، بن کھلے مرجھانا، خاک اڑانا، گھن لگنا، اندھیر نگری چوپٹ راجا، لکڑی جل بھئے کوئلہ، کوئلہ جل بھئے راکھ، آنکھ بے رنگ ہونا، سینہ چاک کرنا، ریزہ ریزہ ہونا، رستہ تکنا، ڈنڈی مارنا، گم ہونا، سنگسار کرنا، راکھ ہونا، شور مچانا، خاک کرنا، گلے لگانا، خواب بننا، آنکھوں کا تارا وغیرہ۔

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں کہیں علامت کے طور پر تو کہیں جہت کو بدلنے کے لیے جگہ جگہ ہندی، بنگلہ زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس طرح وہ مختلف زبان کے الفاظ کا استعمال کر کے بساط شاعری پہ قوس وقزح کے رنگ بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ اس سے ان کی نظموں کے انداز بیان میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال ایسے کرتی ہیں کہ وہ ان کے درمیان منفرد نظر آتے ہوئے بھی ایک تسلسل رکھتا ہے مثال کے طور پر بنگلہ اور ہندی دونوں زبان کے الفاظ کا رچاؤ ان کی ان نظموں میں دیکھ سکتے ہیں:۔

کھنڈر سا شہر
گھپ تاریک راتوں میں
حسین ابن علیؑ کی یاد میں ماتم کناں
رو رو کے کہتا ہے
حسین! تومی کوتھائے۔؟

(حسینؑ! تومی کوتھائے، پس دیوار گریہ) 94

تنہا رہنے کی اچھی عادت بنانے میں
ڈھیر ساری بری عادتوں کو تیاگنا پڑتا ہے
میٹھے شبدوں کی تہہ میں اتر کر
زہر کی بوندیں تلاش کرنی پڑتی ہیں
سارے چہرے کو الٹ پلٹ کر پڑھنا پڑھتا ہے
سچائی سے بھاگتے ہوئے
الٹے قدموں اسے چھوکر
آگ سے گذرنے کا آنند لینا پڑتا ہے

(قید بامشقت، پس دیوار گریہ) 95

ان کی نظموں میں کہیں بنگلہ زبان کے الفاظ جیسے :۔حسین !تومی کوتھائے؟، دوئی دھارے کاش بون پھولے پھولے سادا، آمار سونار بانگلا، آمی تومائے بھالو باشی، پوٹا پوٹی آکھوئی موڑی کھا، کیوآچھے۔۔۔شون چھو۔؟ تو کہیں شانت، السانا، سبھا، اگنی کنڈ، آکاش، منڈیا، جنم، کرن، ساگر، امرت، مریادا، ادھیکار، سپنا، ریکھا، دھنش، سوئمبر، پریکشا، منتر، جاپ، بدھم شرنم گچھامی، شیش، نمن، دھرتی، نرمل، چھل چھل، باسی، پوجا، جل، اماوس، بھونچال جیسے ہندی کے الفاظ شعوری اور لاشعوری طور پر برتے گئے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے یہ نامانوس الفاظ جو ہماری لسانی زبان کے لیے غیر کا درجہ رکھتے ہیں ان کی نظموں میں اس خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں کہ نظموں میں دلکشی، اسلوب میں نکھار اور افکار خیال میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ نئے زبان کے استعمال سے اکثر شعری لوازم کے مجروح ہونے کا خطرہ بنا رہتا ہے لیکن شہناز نبی نے بڑی ہی مہارت اور اپنی فنی چابکدستی اور خوش اسلوبی سے اسے

برت کر نہ صرف اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے بلکہ ہمارے زبان وادب میں لفظ کے ذخیرے میں بھی اضافہ کیا ہے۔

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں نہ صرف تشبیہات، استعارات، علامات، تلمیحات کا استعمال کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بعض اہم صنعتوں کا بھی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے جس سے ان کی نظموں کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کی نظموں میں صنعت تضاد اور صنعت تکرار جیسی صنعتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اپنے آپ سے کوئی
کب تک جھوٹ بول سکتا ہے
اس نے سیاہ کو سفید
رنج کو راحت
درد کو دوا لکھنا چاہا تو
لغات کھلکھلا کر ہنس پڑے

(فرہنگ، پس دیوار گریہ) 96ؐ

مذکورہ نظم میں سیاہ سفید، رنج راحت، درد دوا جیسے متضاد الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

صنعت تکرار ایک ایسی صنعت ہے جس کے استعمال سے شاعری میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے جو پڑھنے میں لطف دیتی ہے شہناز نبی کے یہاں اس صنعت کا بھی خوبصورت استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ نظم دیکھیں:۔

سوچا تھا تم آؤ گے تو
بسرائے گیتوں کی کڑیاں
سانسوں کے الجھے تاروں کی
گرہوں کو سلجھا سلجھا کر
لمحہ لمحہ جوڑوں گی
اندھکار میں کھونے والے
باتوں کے بے پایاں جگنو
اک اک کر کے ڈھونڈوں گی

پچھلے پہر کی سن سن کرتی تیز ہوا سب جانے ہے

(سوچا تھا تم آؤ گے، نظمیں ہماریاں) 97ص

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی اپنی نظموں میں اس کے موضوع اور فن دونوں ہی اعتبار سے کامیاب نظر آتی ہیں۔انھوں نے اپنی شعری صلاحیتوں سے شاعری کے لیے نئے زاویے، نئی طرز فکر کے ذریعے اپنی ذات کو نمایاں کیا ہے۔

*****

حواشی

1۔عبادت بریلوی، شاعری اور شاعری کی تنقید،ص14

2۔ڈاکٹر حلیمہ فردوس، ماہنامہ آجکل مارچ 2014 ،ص11

3۔شہناز نبی، پس دیوار گریہ،ص72

4۔شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے،ص170

5۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص31

6۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص84

7۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص77

8۔شہناز نبی، پس دیوار گریہ،ص127

9۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص117

10۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص145

11۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص171

12۔شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے،ص69

13۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص91

14۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص84

15۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص150

16۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص60

17۔گوپی چند نارنگ، اطلاقی تنقید نئے تناظر میں،ص228

18۔شہناز نبی، نظمیں ہماریاں،ص155

19۔شہناز نبی، شرار جستہ،ص32

20۔شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے،ص126

21۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص36

22۔شہناز نبی، شرار جستہ،ص105

23۔شہناز نبی، پس دیوار گریہ،ص67

24۔شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے، ص99

25۔شہناز نبی، پس دیوار گریہ، ص61

26۔شہناز نبی، شرار جستہ، ص9

27۔شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے، ص27

28۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص58

29۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص83

30۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص135

31۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص111

32۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص87

33۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص164

34۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص97

35۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص121

36۔شہناز نبی، شرار جستہ، ص14

37۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص44

38۔شہناز نبی، پیش دیوار گریہ، ص85

39۔شہناز نبی، شرار جستہ، ص95

40۔شہناز نبی، پس دیوار گریہ، ص155

41۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص31

42۔شہناز نبی، شرار جستہ، ص22

43۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص57

44۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص84

45۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص93

46۔شہناز نبی، نظمیں ہماریاں، ص161

47۔شہناز نبی، پس دیوار گریہ، ص36

48۔ شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے، ص141

49۔ شہناز نبی، پس دیوار گریہ، ص68

50۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص59

51۔ شہناز نبی، شرار جستہ، ص39

52۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص100

53۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص25

54۔ شہناز نبی، پس دیوار گریہ، ص14

55۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص12

56۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص153

57۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص58

58۔ شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے، ص52

59۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص89

60۔ شہناز نبی، پس دیوار گریہ، ص148

61۔ شہناز نبی، شرار جستہ، ص67

62۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص71

63۔ شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے، ص118

64۔ شہناز نبی، شرار جستہ، ص36

65۔ شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے، ص19

66۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ص64

67۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص36

68۔ ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص292

69۔ شہناز نبی، پس دیوار گریہ، ص50

70۔ شہناز نبی، شرار جستہ، ص14

71۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص19

72۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص101
73۔شمس الرحمٰن فاروقی، اثبات، شمارہ10، ممبئی، جولائی۔ستمبر2011، ص212
74۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص54
75۔ شمس الرحمٰن فاروقی، اثبات، شمارہ10، ممبئی، جولائی۔ستمبر2011، ص213
76۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص46
77۔شہناز نبی، اگلے پڑاؤ سے پہلے، ص145
78۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص122
79۔شہناز نبی، نظمیں ہماریاں، ص49
80۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص61
81۔شہناز نبی، شرارِ جستہ، ص84
82۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص95
83۔شہناز نبی، شرارِ جستہ، ص25
84۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص80
85۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص143
86۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص23
87۔شہناز نبی، شرارِ جستہ، ص78
88۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص88
89۔شہناز نبی، شرارِ جستہ، ص46
90۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص40
91۔شہناز نبی، نظمیں ہماریاں، ص129
92۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص29
93۔شہناز نبی، نظمیں ہماریاں، ص35
94۔شہناز نبی، پسِ دیوارِ گریہ، ص25
95۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص124

96۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص175

97۔ شہناز نبی، نظمیں ہماریاں، ص21

باب سوم: شہناز نبی بحیثیت محقق و نقاد

عہد حاضر میں اپنے زور قلم سے بحیثیت محقق ونقاد جوخواتین اردو ادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں ان میں پروفیسر شہناز نبی ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ شہناز نبی ایک ہمہ گیر شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، محقق، نقاد، ڈراما نگار، مترجم اور افسانہ نگار ہیں۔ جہاں وہ ایک طرف تنقید کے میدان میں اپنے زور قلم کو آزما رہی ہیں تو وہیں دوسری طرف بحیثیت محقق بھی ادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

اس باب میں بحیثیت محقق ونقاد شہناز نبی کے تحقیقی وتنقیدی کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور بحیثیت محقق ونقاد ان کے مقام کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے سے پہلے ان کی تحقیقی کتابوں کا جائزہ لیا جائے گا پھر تنقیدی کتابوں کا۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرتی چلوں کہ ان کی کچھ کتابیں تحقیق وتنقید دونوں پر مبنی ہیں۔ کتاب کا کچھ حصہ تحقیقی ہے تو کچھ تنقیدی اس لیے اس کا جائزہ ایک ساتھ ہی لیا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج اور حسن اختلاط (2003)

شہناز نبی کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے کی پہلی کڑی ''فورٹ ولیم کالج اور حسن اختلاط'' ہے۔ یہ کتاب 2003 میں کوالٹی ویکس آفیسٹ پرنٹرز کولکاتا۔9 سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کل 128 صفحات پر مشتمل ہے اور بڑی اہمیت کی حامل ہے وہ اس لحاظ سے کہ اس کتاب کے ذریعے شہناز نبی نے کلکتہ میں اردو زبان وادب کے فروغ میں جن لوگوں نے ابتدائی طور پہ خدمات انجام دی ہیں ان میں میر ابوالقاسم خاں کا نام جو تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو چکا تھا اسے ڈھونڈ نکالا ہے اور اس طرح دوبارہ انھیں تاریخ کا حصہ بنانے کی سعی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شہناز نبی نے ابوالقاسم خاں کی تصنیف کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ادب میں ان کے مقام کا بھی تعین کیا ہے، وہ مقام جس کے وہ حقدار تھے جو انھیں اپنے وقت میں سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے نہیں مل سکا تھا۔

''حسن اختلاط''، میر ابوالقاسم خاں کی تصنیف ہے۔ جس کو انھوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اس کتاب کا تعارف شہناز نبی اپنے پیش لفظ میں یوں پیش کرتی ہیں:

> ''ترجمے کے اس دور میں ابوالقاسم خاں کی یہ تصنیف طبع زاد قصے کے طور پر سامنے آتی ہے۔۔۔۔ قاسم نے اس تصنیف میں چند تاریخی واقعات کو افسانوی

انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے، وہ خاص ان کا اپنا انداز ہے۔ غالباً ان کا مقصد ایک ایسا نثری نمونہ پیش کرنا تھا جس میں محاورات اور ضرب المثال کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے روزمرہ کی گفتگو کا انداز بتایا جا سکے۔'' 1ؔ

یہ کتاب درج ذیل حصوں میں منقسم ہے:

☆ پیش لفظ

☆ فورٹ ولیم کالج

☆ میر ابوالقاسم خاں

☆ حسن اختلاط کا تنقیدی جائزہ

☆ حسن اختلاط (اصل نسخہ)

پہلے حصے میں شہناز نبی فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس سے متعلق اور غیر متعلق مصنفین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتی ہیں۔ ابتدا میں فورٹ ولیم کالج اور اس کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''فورٹ ولیم کالج کی بنیاد 1800 میں مارکوئس ولزلی کے ہاتھوں پڑی۔ ولزلی کا مقصد ہندستان سے آنے والے ان انگریز نوجوانوں کی تربیت کرنی تھی جو یہاں سول ملازمت اختیار کرتے تھے اور ہندوستان میں بولی جانے والی کلاسیکی اور جدید زبانوں اور ہندو شاستر و اسلامی فقہ، قوانین ملکی اور تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ولزلی کا خیال تھا کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ان افسران کا ہندستانی زبان وعلوم کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔'' 2ؔ

اس طرح برطانوی حکومت کے اس مقصد کے تحت فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آتا ہے۔ شہناز نبی اس باب میں اس کے پس وپیش پل رہے ان تمام وجوہات کا تفصیل کے ساتھ احاطہ کرتی ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے قیام کا سبب بنے۔ فورٹ ولیم کالج کے اسی مقصد کے تحت کئی پروفیسر اور ٹیچروں کی تقرری عمل میں لائی گئی جس کا وہ فرداً فرداً ذکر کرتی ہیں، اس کے علاوہ وہ اس کالج کی عمارت، کالج لائبریری، اس کی تالیفات، قواعد وفرہنگ، نصابی کتابیں، تاریخ ان سب پر تفصیل کے ساتھ بحث کرتی ہیں۔

یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج اور گلکرسٹؔ کا آپس میں بہت گہرا تعلق تھا۔اس کے متعلق شہناز نبی نے کچھ اس طرح سے اظہار خیال کیا ہے:۔:

> ''فورٹ ولیم کالج گرچہ ولزلیؔ کے منصوبے کی پیداوار تھا تاہم اس کو ہندستان کی ملکی زبانوں کا مرکز بنانے کے پیچھے گلکرسٹؔ کا ذہن کام کررہا تھا۔'' 3

گلکرسٹؔ نے ہندستان کی مقبول ترین زبان اردو کی طرف اپنی خاص توجہ دی اور کالج میں مشرقی زبان بالخصوص (اردو) زبان کی تعلیم کا انتظام ہوا تو گلکرسٹؔ کو شعبۂ اردو کا صدر بنایا گیا۔اس نے ہندستانی زبان میں نثری تصانیف کی کمی کو دیکھتے ہوئے فارسی،عربی،سنسکرت وغیرہ سے اردو میں کتابیں ترجمہ کروائیں۔اس کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط میں بھی اس کی اشاعت کی۔اس کا مقصد ایسی بول چال کی زبان کو فروغ دینا تھا جو ٹھیٹھ ہندستانی ہو۔گلکرسٹؔ نے بذات خود کئی قواعد ولغات کی ترتیب وتدوین کا اہم کام کیا ہے۔شہناز نبی اس پہلو پر خاص طور سے نظر ڈالتی ہیں اور ان کی کتابوں،قواعد ولغات کی تفصیلات پیش کرتی ہیں۔گلکرسٹؔ نے فورٹ ولیم کالج کے تعلق سے بہت سی ادبی خدمات انجام دی ہیں جس کا اعتراف سبھی اردو ادب کے قارئین کو ہے۔

گلکرسٹؔ کے علاوہ اور بھی کئی انگریز قلمکاروں نے بھی اردو،فارسی وغیرہ کی تصنیف وتالیف میں اپنی خدمات انجام دی ہیں ان تمام کا ذکر شہناز نبی اپنے اس باب میں کرتی ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ یقیناً ان کی یہ خدمات ناقابل فراموش ہیں۔اس کے بعد وہ اردو زبان کے تعلق سے ان تمام منشیوں کا ذکر کرتی ہیں جو فورٹ ولیم کالج سے کسی نہ کسی طرح سے وابستہ تھے۔اس سلسلے میں وہ میر بہادر علی حسینی،میر شیر علی افسوسؔ،تاراچرن مشر،مرزا کاظم علی جوانؔ،مظہر علی خاں ولاؔ،میر امنؔ،میر حیدر بخش حیدریؔ،خلیل علی خاں اشکؔ،امانت اللہ شیداؔ،للو جی لال کبؔ،مولوی اکرام علی،مولوی شیخ حفیظ الدین احمد،لالہ کاشی راج،منصور علی،مرزا محمد فطرت،میر بخش علی،سدل مشر پنڈت،میر معین الدین فیضی،سید علی جعفری،غلام حیدر عزتؔ کا ذکر بڑے تفصیل کے ساتھ کرتی ہیں اور ساتھ ہی ان کے تصانیف پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

یہ تو وہ لوگ تھے جو براہ راست کالج سے منسلک تھے اس کے علاوہ جو کالج سے غیر متعلق مصنفین تھے ان میں بینی نرائن جہاںؔ،مرزا علی لطفؔ،نہال چند لاہوری،مرزا جان طپش،باسط خان باسطؔ وغیرہ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔

باب کے آخر میں وہ اس بات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں کہ ان مصنفین کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس کے تئیں کام کئے تھے لیکن افسوس کہ ان کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے اور ان کے نام اب بھی پردۂ خیفا میں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ غیر متعلقین اپنے کارناموں کے سبب زندہ تو ہیں لیکن ان کے متعلق بھی ہمارے تذکروں میں کوئی خاص ذکر نہیں ملتا انہی میں سے ایک نام ابوالقاسم خاں کا ہے جن کی تصنیف 'حسن اختلاط' ہے۔ یہ طبع زاد ہونے کے بنا پر اہم ہے اور ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

اس کتاب کا اگلا باب میر ابوالقاسم خاں پر منحصر ہے۔ شہناز نبی ان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''ابوالقاسم خاں کے متعلق اردو تذکرے خاموش ہیں۔ وہ کون تھا، کیا تھا، کہاں رہتا تھا، اس کے آباؤ اجداد کا نام کیا تھا، ان سارے سوالوں کا کسی تذکرہ نگار کے پاس کوئی جواب نہیں۔'' 4

ابوالقاسم کی شخصیت کی تلاش میں شہناز نبی بنگال کے حوالے سے، فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں کی تفصیل بھی دیتی ہیں لیکن ان میں کہیں بھی انھیں ابوالقاسم کے بارے میں کچھ خاص لکھا ہوا نہیں ملتا ہے اور اگر کسی کتاب میں کچھ ملتا بھی ہے تو وہ بھی تشنہ ہے یہاں تک کہ خود ابوالقاسم خاں اپنی تصنیف کے دیباچے میں گلکرسٹ کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن اپنے متعلق ایک لفظ نہیں لکھے ہیں جس سے ان کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ اکثر محققین کے درمیان تو ان کے تخلص میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اس حقیقت کی تلاش میں شہناز نبی نے کئی تذکروں کا مطالعہ کیا اور ان کا تفصیل کے ساتھ حوالہ بھی دیتی ہیں لیکن کہیں بھی انھیں ابوالقاسم خاں کے متعلق کچھ نہیں ملتا آخر میں ان کو اردو تذکرہ نگاروں پر اس بات کا اعتراض کرنا پڑتا ہے کہ:

> ''اگر تذکرہ نگاروں نے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھتے وقت تھوڑی سی محنت کی ہوتی اور شاعر کے حالات بتانے میں کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو آج ہمیں قاسم کی تلاش میں یوں بھٹکنا نہ پڑتا۔ ابوالقاسم کے بارے میں تذکرہ نگاروں کی بے حسی اور اس کے نثری کارنامے سے انحراف ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔'' 5

اس طرح اس باب میں شہناز نبی نے مختلف تذکروں کے حوالے سے ابوالقاسم خاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کو موضوع بنایا ہے۔ باب کے آخری حصے میں وہ گلکرسٹ اور ابوالقاسم کے آپسی

تعلق کے بارے میں بتاتی ہیں کہ گلکرسٹؔ نے حکومت کو ایک لسٹ دی جس میں اردو کے مصنفوں اور ان کی کتابوں کا ذکر تھا جو کالج کے منصوبے پر پوری طرح اتری تھی۔ گلکرسٹؔ نے یہ لسٹ مصنفوں کو انعام دینے کی غرض سے تیار کی تھی ان کتابوں میں سے ایک کتاب ’حسن اختلاط‘ بھی تھی۔ اس طرح ’حسن اختلاط‘ اور اس کے مصنف کا ذکر پہلی بار اس لسٹ میں آتا ہے۔ اس باب میں آگے وہ ابوالقاسمؔ اور گلکرسٹؔ کے تعلقات پر گفتگو کرتی ہیں اور اس طرح یہ باب ابوالقاسمؔ کی شخصیت کی تلاش اور گلکرسٹؔ کے ساتھ ان کے تعلقات کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کا اگلا حصہ یا باب ’’حسن اختلاط کا تنقیدی جائزہ‘‘ ہے اور یقینن یہی باب اس کتاب کا اصل حصہ کہا جا سکتا ہے شہناز نبی اس کتاب کا تعارف کچھ اس طرح کراتی ہیں:۔

> ’’حسن اختلاط میر ابوالقاسمؔ خاں کی تصنیف ہے۔ زیر نظر نسخہ کلکتہ کی ایشیا ٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے سرورق پر لکھا ہے کہ حسن اختلاط۔ نثر بر زبان ہندی‘۔ اندر کے صفحے پر فورٹ ولیم کالج کی مہر لگی ہے۔ کتاب کے ایک کونے پر اختلاط ہند، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہے کتاب کی قیمت 4 لکھی ہے نیز قیمت انگریزی میں درج ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر انگریزی میں ’کالج آف فورٹ ولیم‘ لکھا ہے۔ اس کے بعد کے صفحہ کے وسط سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ ’ہوالعزیز اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘ کے بعد اصل قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے صفحہ پر چار سطر درج ہے بعد کے صفحات پر کہیں نو اور کہیں گیارہ ہیں۔ آخری کے صفحے پر دو سطریں ہیں۔ نسخے میں کل تیس ورق ہیں۔ نسخے کا سائز 16*23 ہے۔ کاغذ ہاتھ کا بنا ہے نسخہ خط نستعلیق میں ہے۔ کچھ حد تک کرم خردہ ہے۔ نسخہ پر بودھ 4 مئی 1803 کی تاریخ درج ہے۔‘‘ 6

اتنی تفصیلی وضاحت کے بعد وہ دیگر نسخوں کا بھی تعارف پیش کرتی ہیں۔ محققین میں ’حسن اختلاط‘ کے طبع زاد ہونے کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے کوئی اسے تاریخ مانتا ہے تو کوئی ترجمہ لیکن شہناز نبی اسے طبع زاد مانتی ہیں اور دلیل کے طور پر ابوالقاسمؔ کی یہ چند سطریں پیش کرتی ہیں:۔

> ’’حسن اختلاط کے بارے میں خود مصنف میر ابوالقاسمؔ خاں نے کہیں یہ اطلاع نہیں دی ہے کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ کتاب کے شروع ہی میں وہ اس

کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتا ہے، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کتاب اس نے
اپنے دل سے باتیں کرنے کے بعد لکھی ہے:

''کہ مسافر جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے جاتے ہیں تو راہ خوب کٹتی ہے۔ پھر
اس سے بہتر ہے کہ کوئی قصہ یا حکایت یا کہانی بات ایسی کہتے چلو کہ جس سے راہ
کٹے اور ماندگی مٹے۔'' 7

اس طرح شہناز نبی اس کے طبع زاد ہونے کے سلسلے میں مدلل بحث کرتی ہیں اور اسے نہ ترجمہ مانتی ہیں اور نہ ہی تاریخ بلکہ دل کو بہلانے کے لیے لکھی گئی کتاب مانتی ہیں جس میں تاریخی واقعات در آئے ہیں۔

اس کے بعد وہ ''حسن اختلاط'' کے قصے کو موضوع بحث کی ہیں اور اسے فرضی قصہ پر مبنی خیال کرتی ہیں اور اس کی تائید کے لئے مصنف کے اس مقصد کو سامنے رکھتی ہیں کہ یہ کتاب فقط حسن اختلاط اور حسن اظہار ہے۔ کتاب کے اصل قصے کے بارے میں وہ مختصر لکھتی ہیں:۔

''قصے کی شروعات احوال ہند کے بیان سے کرتے ہیں جو انتہائی مختصر ہے۔ دو
چار مضمون ہی میں ہستنا نگر، راجہ وکر مادتیہ اور اس کے بھائی سک آدھت، ان کی
سلطنت کے زوال، پٹھانوں اور تورانیوں کے عروج وزوال سے نپٹ لیتے ہیں
اور بنگالے تک جا پہنچتے ہیں۔ نواب جعفر خاںؔ، حاجی احمدؔ، مرزا بندےؔ کا ذکر
کرتے ہوئے سرفراز خاںؔ تک پہنچتے ہیں اور اس کے بعد مہابت جنگؔ اور ہیبت
جنگؔ سے ہوتے ہوئے سراج الدولہؔ تک۔ سراج الدولہؔ کو لعن طعن کر کے ہیسٹینگز
کے گن گاتے ہوئے قصہ اختتام تک پہنچتا ہے۔'' 8

اس طرح ان کے اس مختصر اشارے کے بعد شہناز نبی اس کے انداز بیان کو موضوع بحث بناتی ہیں۔ جیسا کہ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کا قیام اسی مقصد کے تحت ہوا تھا کہ آسان اردو زبان کو فروغ دینا ہے تا کہ نو وارد انگریز اس سے مستفید ہو سکے۔ اس لئے 'حسن اختلاط' کی زبان بھی آسان اور دیگر تصنیفوں کے قریب تر ہے چونکہ وہ دور ترجمے کا دور تھا اور میر ابوالقاسمؔ بھی نئے لکھنے والوں میں سے ایک تھے اس لئے لسانی غلطیاں ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ شہناز نبی اولاً اس کی لسانی غلطیوں کو تسلیم کرتی تو ہیں لیکن ان کے نزدیک ان کی یہ غلطی ایسی بھی نہیں ہے کہ معافی کے قابل نہ ہو۔ زبان وبیان کے ذکر میں وہ 'حسن اختلاط' میں شامل محاورات، ضرب المثال،

متضاد الفاظ کو نوٹ کرتی ہیں اور ایک تفصیل پیش کرتی ہیں اور آخر میں اس بات کا وہ اعتراف کرتی ہیں کہ:۔

''حسن اختلاط ادبی فن پارے کے اعتبار سے قابل ستائش ہو یا نہ ہو اس اعتبار سے سراہے جانے کے لائق ضرور ہے کہ ترجمے کے دور میں یہ طبع زاد تصنیف ہے۔''9

اس کتاب کے آخری حصے میں وہ 'حسن اختلاط' کا اصل نسخہ بھی شامل کرتی ہیں جس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت اور معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ان کی یہ کتاب ''فورٹ ولیم کالج اور حسن اختلاط'' کو اس کی نوعیت کے بنا پر تحقیق کی اہم کتابوں میں شامل کیا جاسکتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج اور اس کے مصنفین کی ادبی خدمات کے حوالے سے اس کی حیثیت ایک دستاویز کی سی ہے اس کے علاوہ میر ابوالقاسم خاں کا اردو ادب کے ایک مصنف کے حوالے سے تعارف کرانا بھی ایک اہم کام ہے آج ایسے کاموں کی ہمارے ادب کو ضرورت ہے تاکہ اس کی مدد سے ادب کی نئی تاریخ مرتب کرنے میں آسانی ہو۔تنقید کے حوالے سے بھی یہ کتاب قابل ذکر ہے کیونکہ اس میں شہناز نبی نے 'حسن اختلاط' کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے جس سے اس کے فنی محاسن و معائب ابھر کر سامنے آئے ہیں ۔اس کتاب کے ذریعہ شہناز نبی نے اپنے محققانہ اور ناقدانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے اس طرح یہ کتاب ان کو بحیثیت محقق ونقاد ثابت کرنے کی ایک اچھی کڑی ہے۔

منثوراتِ بنگالہ (2006)

منثورات بنگالہ شہناز نبی کی ایک اور اہم تصنیف ہے ۔یہ کتاب 2006 میں نیو ایشین پرنٹرز ،7/29 فریس لین کولکاتا۔700073 سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب 400 صفحات پر مشتمل ہے۔سرورق پر بنگال کا نقشہ بنا ہے اور اس کے اضلاع کے نام بھی درج ہیں۔شہناز نبی نے اپنی اس کتاب کا انتساب 'قصہ گویانِ اردو' کے نام کیا ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مبنی ہے۔پہلے حصے میں ''بنگال میں اردو نثر کی روایت'' کے عنوان سے انھوں نے اپنا ایک تحقیقی مقالہ شامل کیا ہے اور دوسرے حصے میں انیسویں صدی میں بنگال میں لکھی گئی تقریباً سبھی داستانوں کا

تعارف پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان تمام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔اس طرح یہ کتاب تحقیق وتنقید دونوں پر مبنی ہے۔اس کتاب کی تخلیق کے پیچھے شہناز نبی کا ایک مقصد پنہاں ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:۔

''راقم الحروف کا مقصد بنگال کی سرزمین پر پائے جانے والی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نثر کی تفصیل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا نمونہ بھی پیش کرنا ہے ۔'' 10

اردو زبان وادب کے فروغ میں سرزمین بنگال کا اہم رول رہا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو زبان وادب کے ترقی میں جو خدمات انجام دی ہے وہ نا قابل فراموش ہے۔اس حوالے سے اب تک کئی تحقیقی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جس سے سرزمین بنگال ہو یا کہ فورٹ ولیم کالج دونوں کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے میں درپیش مسائل ہو سکے ہیں وہیں شہناز نبی کی یہ کتاب بھی اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے جس کا انھوں نے اظہار بھی کیا ہے۔

بنگال میں اردو نثر کی روایت پر تفصیلی بحث میں وہ سب سے پہلے بنگال کا تعارف کرواتی ہیں اس کے بعد اس کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں کا احاطہ پیش کرتی ہیں۔مسلمانوں کی آمد نے بنگال کے ماحول و فضا کو کس طرح اثر انداز کیا کیسے اور کس طرح بنگال کو ایک نئی تہذیب، نئی زبان سے متعارف کروایا اور کس طرح بنگال کی ترقی ہوئی اس کے لئے وہ سب سے پہلے بختیار خلجی کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کرتی ہیں اور اس کے متعلق اپنے رائے کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:۔

''بختیار نے عبادت کے لیے مساجد، بچوں کی تعلیم کے واسطے مدرسے، اور علماء، مشائخ وسادات کی اقامت کے لیے خانقاہیں تعمیر کروائیں۔'' 11

بختیار خلجی کے بعد وہ عوض خلجی، ایلیاس شاہ، سکندر شاہ، احمد شاہ، ناصر الدین محمد شاہ، رکن الدین یوسف شاہ، حسین شاہ ان تمام کے عہد حکومت میں بنگال کی ترقی، عمارات کی تعمیر، مساجد اور خانقاہوں کے ذکر کے ساتھ ان کے عہد میں ابھرنے والے ان ادیبوں کا بھی ذکر کرتی ہیں جن سے بنگال کے شعر وادب میں اضافہ ہوا ہے۔ان میں چیتنیہ، جے دیوی، چنڈی داس وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

شہناز نبی حسین شاہ کے عہد کو بنگالی زبان وادب کے فروغ کا سب سے بڑا عہد مانتی ہیں۔یہ بنگال کا

آخری آزاز حکمراں گزرا کیونکہ اس کے بعد مغلوں نے ہندستان میں قدم جمالیا تھا اور جلد ہی بنگال پر قابض ہو گئے تھے۔اس طرح شہناز نبی بنگال میں مسلمانوں کی آمد کو تاریخی نکتۂ نظر سے دیکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا ہے۔

مسلمانوں کی آمد نے بڑے بڑے صوفیائے کرام کو بھی جگہ دی اور انھیں اپنے دامن میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔صوفیا کرام بھی بنگال میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیے ہیں۔شہناز نبی بنگال میں اردو زبان وادب کے فروغ میں صوفیائے کرام کا اہم رول مانتی ہیں وہ لکھتی ہیں کہ:۔

> ''اردو نے کب اور کیسے بنگال کی سرزمین پر قدم رکھا یہ کہنا مشکل ضرور ہے لیکن قیاسات کی بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بزرگان دین کے ہمراہ عربی فارسی کے بعد اردو نے بھی اپنی جنم بھومی دوآبۂ گنگ وجمن سے دور ہندستان کے مشرق علاقوں میں ان کے ساتھ ہی در آئی ہوگی۔''12؎

بنگال میں اردو کے فروغ کی بنیاد ان ہی صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی۔انھوں نے مبلغ اسلام کی حیثیت سے بنگال میں جگہ جگہ مدرسوں اور درس گاہوں کی تعمیریں کروائیں لیکن نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ ان صوفیائے کرام کے نام اور ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ کچھ ہی کتابوں میں ملتا ہے جسے مکمل نہیں کہا جاسکتا۔اس طرح بنگال میں جن جن صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیے ہیں شہناز نبی ان کی تفصیل پیش کرتی ہیں اور ان کے ناموں کی ایک فہرست تیار کرتی ہیں جن میں شیخ جلال الدین تبریزی ،شیخ شرف الدین توامہ،شیخ سراج الدین عثمان،شیخ جلال الدین لاہوری پنڈوی بنگالی (علاءالحق) مولانا تقی الدین عربی،قاضی رکن الدین سمرقندی،حضرت اشرف جہانگیر سمنانی،شیخ نورالدین نورقطب،عالم پنڈوی،مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیر وغیرہ ہیں۔انھوں نے ان تمام صوفیائے کرام اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

اس کے بعد وہ کلکتہ کے مدرسے کا ذکر کرتی ہیں۔اس کا تعارف وہ یوں پیش کرتی ہیں:۔

> ''کلکتہ مدرسہ یا محمڈن کالج آف کلکتہ، برٹش انڈیا میں مسلمانوں کی پہلی درسگاہ تھی ،جس کا قیام 1780 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی کوششوں سے عمل میں آیا۔''13؎

کلکتہ کے معزز مسلمانوں کا خیال تھا کہ مسلم نوجوان کی تعلیم وتربیت کے لیے اور اسلامی قوانین وعربی فارسی

زبانوں سے واقفیت کے لیے ایک عملی درسگاہ کا قیام از حد ضروری ہے۔اس مدرسے کا قیام اسی بنا پر عمل میں لایا گیا ۔شہناز نبی اس مدرسے کے اولین انتظامیہ، ناظم ،ڈگری، امتحانات سب کا تفصیلی جائزہ لیتی ہیں ۔کچھ سالوں بعد ضرورت کے تحت اسی مدرسے کی نئی عمارت کی تجویز پاس ہوئی اور بنگال کے ہی ایک شہر کلنگا میں اس کو منتقل کر دیا گیا۔اس میں مسلمانوں کی میڈیکل کی تعلیم کے لیے ایک طبی شعبہ بھی بنایا گیا۔شہناز نبی اس مدرسے کی تعلیمی وادبی خدمات پر ایک محققانہ بحث کرتی ہوئی اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ:۔

> ''اس دوران اردو نثر میں لکھی گئی سائنس کی کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ کلکتہ کی سرزمین پر ادبی کتابوں کی تصنیف وتالیف کے علاوہ سائنس، منطق، فلسفہ، علم نجوم ،قانون وغیرہ پر بھی کتابیں لکھی جارہی تھیں اور ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔'' 14؎

کلکتہ مدرسہ آگے چل کر کلکتہ یونی ورسٹی میں تبدیل ہوگیا۔شہناز نبی اس مدرسے میں تعلیم یافتہ چند نامور شخصیت کے نام گنواتی ہیں جن میں عبدالطیف، وحید اجنبی ،سرسید احمد خاں ،ڈاکٹر کنائی لال ،جسٹس جے ۔پی نارمن ،مولوی کرامت علی وغیرہ ہیں ۔یہ وہ شخصیات تھیں جو انگریزی کے علاوہ دیگر مضامین میں بھی مہارت رکھتی تھیں ۔تاریخ کا استعمال، اخبار کی ایجاد، کامرس، آرٹس، زراعت، جغرافیہ جیسے علوم پر یہ لوگ بحثیں کیا کرتے تھے۔اس کے ساتھ ہی شہناز نبی ان کتابوں کا بھی ذکر کرتی ہیں جو کلکتہ میں اردو کے ارتقاء اور فروغ پر لکھی گئی ہیں لیکن وہ ان کتابوں کے مصنف پر سوال بھی قائم کرتی ہیں کہ ان کتابوں میں کلکتہ مدرسہ کے مولویوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن کوئی تفصیلی بحث نہیں ملتی ہے۔

کلکتہ یونی ورسٹی کے بعد فورٹ ولیم کالج اور اس کی ادبی خدمات کا بنگال میں اردو نثر کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول رہا ہے۔شہناز نبی اس کالج کے قیام کی تاریخ، مقصد، نظامِ تعلیم کے مسودے ان تمام پر تفصیلی بحث چھیڑتی ہیں۔فورٹ ولیم کالج میں کن کن مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی اس کے ذکر میں وہ سب سے پہلے مشرقی زبانیں، قوانین، بین الاقوامی قوانین، تجارتی وکاروباری، تاریخ، سائنس کے متعلق روشنی ڈالتی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج میں شعبہ اردو کا قیام اور گلکرسٹ کا بحیثیت صدر تقرر، ان کا مفصل تعارف اور ہندستانی زبان سے ان کے خاص لگاؤ کو موضوعِ بحث بناتی ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے سلسلے سے وہ خاص طور سے ان کی

قواعد نویسی ،لغت نویسی کا تفصیل سے جائزہ لیتی ہیں۔ابتدائی کوشش کے عنوان سے وہ گلکرسٹ کے پہلے لکھی گئی قواعد ولغات کی بھی تفصیل میں جاتی ہیں اور گریرسن کی ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا''، گلڈن ،ہیڈلے وغیرہ کا بھی ذکر کرتی ہیں جنھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانوں میں ہندستان کی قواعد مرتب کیے تھے۔

اس تفصیل کے بعد شہناز نبی فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات کی طرف رخ کرتی ہیں اور ابتدا میں قابل غور بات کہتی ہیں:۔

''بنگال میں اردو نثر کی با قاعدہ ابتدا فورٹ ولیم کالج کے تحت تراجم کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔''15؎

اردو سے متعلق اس کالج میں کام کرنے والے ہیڈ منشی ،سکنڈ منشی ،اور منشی کے طور پر وہ میر بہادر علی حسینی ،تارن چرن مشرا اور سکنڈ منشی کے لیے کئی ناموں سے متعارف کرواتی ہیں۔وہ ان کی ماہانہ تنخواہ ،اور تصانیف پر ملے گئے انعامات کی بھی تفصیل دیتی ہیں ساتھ ہی ان تمام تصانیف کی ایک فہرست بھی تیار کرتی ہیں جو فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی تھی جو آج ہماری اردو نثر کے لیے ایک مثال ہے۔فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں کہ:۔

''فورٹ ولیم کالج کو بھلے ہی ہم انگریزوں کی سیاسی پالیسی کا ایک حصہ قرار دیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو میں جدید نثر کا آغاز ہوا۔''16؎

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کا اردو کے فروغ میں اہم رول رہا ہے۔اس کے زیر اثر سادہ اور رواں زبان کا آغاز ہوا اور ہماری اردو نکھر کر سامنے آئی۔کچھ محققین نے فورٹ ولیم کالج کو انگریزی سرکار کی سازش بتاتے ہیں اور وجہ کے طور پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ انگریزوں نے صرف مافوق الفطرت کے قصے ہی کیوں ترجمہ کروائے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہناز نبی بتاتی ہیں:۔

''اس میں شک نہیں کہ انگریزوں نے داستانوں سے زیادہ دلچسپی دکھائی لیکن آج اگر یہ داستانیں نہ ہوتیں تو شاید اردو زبان کا دامن قصے کہانیوں سے خالی رہتا۔''17؎

بنگال میں اردو زبان کے فروغ میں دینی رسائلوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔شہناز نبی ان تمام رسائلوں کی تفصیل پیش کرتی ہیں چوں کہ یہ رسائل دین اور اسلام کے متعلق ہوتے تھے اس لیے ان پر اخلاقی پہلو حاوی تھا۔اس کی زبانیں مقفع ہوتی تھی۔مضامین میں جا بہ جا قرآن وحدیث کے حوالے ہوتے تھے اس لیے اردو کے ساتھ عربی وفارسی کے جملوں اور فقروں کی آمیزش ہوا کرتی تھی۔شہناز نبی اس کے متعلق لکھتی ہیں:۔

> ''اس سے بنگال میں اردو کی ادبی نثر کی فضا ہموار نہیں ہوتی تاہم وہ ہندستانی جس کی پرورش وپرداخت گلکرسٹؔ نے اپنے ذمے لی تھی، ان مولیوں کے ہمراہ آگے بڑھتی ہے۔''18؎

دینی رسائلوں کے ساتھ وہ بنگال کے رسائل واخبارات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں اور اسے اردو نثر کے فروغ میں ایک اہم حصہ مانتی ہیں۔اردو کے تعلق سے پہلا اردو اخبار ''جامِ جہاں نما'' یہیں سے شائع ہوا تھا۔''جامِ جہاں نما'' کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ''اردو گائیڈ'' اور ''دارالسلطنت'' اخبارات بھی شائع ہونے لگے۔ان میں طنزیہ مضامین، سنجیدہ مضامین اور صحافتی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔وہ مختلف صحافیوں کے نام بھی گنواتی ہیں جس میں ابو الکلام آزادؔ، عبدالرزاق ملیح آبادی، قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کی نثر نے اردو صحافت کو مزید وقار بخشا۔اس طرح شہناز نبی بڑے ہی محققانہ اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ اپنی اس کتاب کے پہلے حصے بنگال میں اردو نثر کی روایت کو پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں شہناز نبی نے انیسویں صدی میں سرزمین بنگال میں لکھے گئے ان تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ داستانوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے نمونے کے طور پر ان کے نسخے سے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔بعض اقتباسات 5 سے 10 صفحات پر مشتمل ہیں۔اس کے پیچھے ان کا یہ مقصد کارفرما ہے کہ ان کی یہ کتاب تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے اولین نثر کے انتخاب کا بھی کام کرے۔نثری نمونے کی پیش کش بھی انھوں نے تاریخی اعتبار سے کی ہیں۔انھوں نے فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی داستانوں کے ساتھ کچھ اس کے بعد کے داستانوں کو بھی شامل کیا ہے جو انیسویں صدی میں تخلیق ہوئی تھیں۔اس کے لیے انھوں نے کل 24 داستانوں کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔اس کی سب سے خاص بات ان کا تاریخی اعتبار سے ترتیب دینا ہے۔

ان داستانوں میں انھوں نے 1801 میں لکھی گئی داستانوں میں کاظم علی جواںؔ کی ''شکنتلا'' اور ''سنگھاسن

بتیسی''، مظہر علی خاں ولاؔ کی ''مادھونل اور کام کنڈلا'' اور ''بیتال پچیسی''، سید حیدر بخش حیدریؔ کی ''توتا کہانی''، خلیل علی خاں اشکؔ کی داستان ''امیر حمزہ''، حیدریؔ کی ''آرائشِ محفل'' اور ولاؔ کی ''ہفت گلشن'' کو شامل کیا ہے کیونکہ ان سب کی سن ترجمہ یا تصنیف 1801 ہے۔

1802 میں میر امنؔ کی ''باغ و بہار''، میر بہادر علی حسینی کی ''نثر بے نظیر'' اور محمد بخش کی ''قصہ فیروز شاہ'' کو رکھا ہے۔ 1803 میں نہال چند لاہوری کی ''مذہبِ عشق''، حفیظ الدین احمد کی ''خرد افروز''، سید منصور علی کی ''بحرِ عشق'' (قصہ سیف الملوک)، غلام حیدر عزتؔ کی ''حسن و عشق'' (گل و ہرمز)، باسط خاں باسط کی ''گل صنوبر'' (مشمولہ گلشنِ ھند)، تو تارامؔ کی ''قصہ دلآرام و دلربا'' کو رکھا ہے۔

1804 میں سید حیدر بخش حیدریؔ کی ''گلزارِ دانش''، خلیل علی خاں اشکؔ کی ''قصہ رضوان شاہ'' (نگار خانۂ چین)، نور خاں کی ''مثنوی در احوال کلکتہ مع قصہ بلند اختر'' کو رکھا ہے۔ 1810 میں بنی نرائن جہاں کی ''چار گلشن''، اور سید نور علی کی ''بہارِ عشق'' (ترجمان نل دمن) کو رکھا ہے۔ 42-1840 میں ''زبدۃ الخیال''، مولوی عالم علی کی اور ''الف لیلہ'' عبدالکریم کو جگہ دی ہے۔ یہ آخر کی دونوں داستانیں فورٹ ولیم کالج کی نہیں ہیں۔

ان تمام داستانوں کا وہ تنقیدی جائزہ لیتی ہیں نیز اس کے مصنف کے حالاتِ زندگی اور دیگر تصنیفات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ میں ان داستانوں کی مختصراً تفصیل پیش ہے۔

''شکنتلا''

اس سلسلے کی پہلی کڑی کا آغاز وہ کاظم علی جوانؔ کی داستان ''شکنتلا'' سے کرتی ہیں۔ سب سے پہلے وہ کاظم علی جوانؔ کا مکمل تعارف کراتی ہیں اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ''شکنتلا'' کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں:۔

> ''مرزا کاظم علی جوانؔ نے ڈاکٹر گلکرسٹؔ کی فرمائش پر 1801 میں ''شکنتلا'' ناٹک کو برج بھاشا سے اردو میں منتقل کیا۔ سب سے پہلے 1801 میں ہندی مینول میں اس کے کچھ حصے دیو ناگری رسم الخط میں شائع ہوئے۔ بعد ازاں 1804 میں رومن حروف میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ 1826 میں ڈاکٹر گلکرسٹؔ نے لندن سے شائع کیا اور اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا۔''[19]

اس طرح شہناز نبی پہلے ''شکنتلا'' اور اس کے مصنف سے متعارف کرواتی ہیں اس کے بعد اس کے قصے کا مختصر جائزہ لیتی ہیں۔ اس کے اسلوب بیان کے ذکر میں وہ اپنی رائے اس طرح قائم کرتی ہیں:۔

''شکنتلا کی نثر سلیس اور رواں ہیں۔ کہیں کہیں مقفع جملے ملتے ہیں۔ دکنی انداز میں آئیاں جائیاں بھی استعمال کرتے ہیں لیکن عموماً کاظم علی جواںؔ نے بول چال کی زبان کو اپنایا ہے۔ ہندی کے الفاظ خوب استعمال کیے ہیں۔ واقعات میں منطقی تسلسل ہے اور ان کی تصنیف ڈرامہ نہ ہوتے ہوئے بھی ڈرامیت سے بھرپور ہے۔ مکالمے برجستہ اور بے ساختہ ہیں۔''20ؐ

یوں تو تقریباً ہر صنف ادب تنقید کا موضوع بنتی ہے اس لیے ''شکنتلا'' کو بھی کئی ناقدین نے نشانہ بنایا ہے جن میں ڈاکٹر پرکاش مونسؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس کے مرقعے اور زیر ترجمہ کتاب پر بحث کی ہے اور اس کے مآخذ پر اعتراض جتایا ہے لیکن وہ کاظم علی جواںؔ کے اسلوبِ بیان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے ہیں اور یہ سچ بھی ہے ''شکنتلا'' کے ترجمے سے اردو میں ہندی ادب کی متعدد تلمیحات اور تصورات کو داخلہ ملا ہے۔ اس لیے چند بنیادی غلطیوں کے باوجود بھی ''شکنتلا'' اس کی خوبصورت نثر کی وجہ سے داستانوں میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

''سنگھاسن بتیسی''

''سنگھاسن بتیسی'' بھی کاظم علی جواںؔ ہی کی ایک اور اہم تصنیف ہے۔ شہناز نبی اس کے اس خطی نسخے کو زیر نظر رکھتی ہیں جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اولاً وہ نسخے کا تعارف اور اس کی موجودہ حالت کا جائزہ لیتی ہیں۔ یہ کتاب بھی جواںؔ نے برج بھاشا سے اردو میں منتقل کی ہے۔ یہ ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے اس کا آسان اردو ترجمہ کیا ہے۔ آسان ان معنوں میں کہ اس کے وہ الفاظ نکال دیے ہیں جو ہندی کے تھے اور اردو کا جزو بن سکتے تھے۔ شہناز نبی اس پر اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا کہ ''اردو کی اسی عصبیت نے اردو کو ہر دور میں نقصان پہنچایا ہے۔''

اس کے بعد شہناز نبی اس کے قصے اور اسلوب بیان کو بھی گرفت میں لیتی ہیں اور اسکی اہمیت کو واضح کرنے کی سعی کرتی ہیں کہ کس طرح یہ اردو کی اہم کتاب ہے۔

''مادھونل اور کام کنڈلا''

فورٹ ولیم کالج میں زیر ترجمہ کتابوں میں ''مادھونل اور کام کنڈلا'' بھی اہمیت کی حامل ہے۔اس کے مصنف مظہر علی خاں وِلاؔ ہیں۔اس کے تعارف میں شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

''یہ موتی رام کیشر کی لکھی ہوئی کہانی سے ماخوذ ہے جو برج میں لکھی گئی تھی۔ولاؔ نے ڈاکٹر گلکرسٹؔ کی فرمائش پر اسے اردو میں منتقل کیا تھا۔اس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ تھا۔پہلی بار عبادت بریلویؔ نے اسے نئی ترتیب کے ساتھ مع ایک مقدمے کے'اردو دنیا' کراچی سے 1965 میں شائع کیا۔'' 21ے

مظہر علی خاں ولاؔ کے تعارف کے سلسلے میں شہناز نبی اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ ہمارے اردو تذکروں میں ولاؔ کے بارے میں کوئی خاص جانکاری نہیں ملتی ہے جس سے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی جا سکے۔ولاؔ کے مطابق اس قصے کا ماخذ موتی رام کیشر کے وہ قصے ہیں جو برج بھاشا میں ہیں لیکن ڈاکٹر پرکاش مونسؔ اسے عالمؔ کی اور بھی تالیف ''مادھونل کام کنڈلا'' سے ماخوذ تسلیم کرتے ہیں۔شہناز نبی اس کا تفصیل سے ذکر کرتی ہیں اور ساتھ ہی ''مادھونل اور کام کنڈلا'' کے قصے کا بیان اور اس کے محاسن ومعائب دونوں کو گرفت میں لیتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''ولاؔ نے یہ قصہ سلیس اردو میں لکھنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن پھر بھی ''مادھونل اور کام کنڈلا'' میں ہندی الفاظ کا استعمال بلا تکلف ہوا ہے۔ہندو معتقدات، رسوم ورواج، اساطیر کے بیان میں ایسا ہونا فطری ہے۔۔۔۔لیکن کہیں کہیں مصنف نے سوچنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی ہے۔وہ چاہتا تو زبان میں مزید سلاست پیدا کرسکتا تھا۔کہیں کہیں عربی فارسی الفاظ کا بھی بے جا استعمال کیا ہے۔'' 22ے

''بیتال پچیسی''

اگلا قصہ ''بیتال پچیسی'' بھی ولاؔ ہی کی تصنیف ہے۔اس کے تعلق سے شہناز نبی پہلے اس کے قلمی نسخے کے متعلق بتاتی ہیں۔قصے کے تعلق سے اس میں پچیس حکایتیں پیش کی گئی ہے اور یہ پچیسوں کہانیاں بیتال نامی بھوت راجہ بکرم کو سناتا ہے۔''بیتال پچیسی'' کے ترجمے کے وقت اگرچہ ولاؔ نے سلیس زبان لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں

کہیں ترجمے میں روانی کی کمی کھٹکتی ہے۔اس کی نثر کو پڑھ کر ایسا ہی احساس ہوتا ہے۔''بیتال پچیسی'' کے متعلق شہناز نبی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''بیتال پچیسی میں ولاؔ نے ہندستانی فضا قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ہندستان کی تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔جگہ جگہ پند و نصائح کا سہارا لیا ہے۔اخلاقیات کو''بیتال پچیسی''میں بہت اہمیت حاصل ہے۔اس کے تمام قصے مختصر افسانے کی ہئیت رکھتے ہیں اور اصل داستان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی آزادانہ حیثیت کے حامل ہیں۔''23؎

''توتا کہانی''

''توتا کہانی'' حیدر بخش حیدریؔ کی تصنیف ہے۔پہلے پہل وہ تصنیف اور مصنف پر تفصیلی بحث کرتی ہیں ۔حیدریؔ نے گلکرسٹؔ کی فرمائش پر محمد قادری کے''طوطی نامے'' کا فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا۔اس میں حیدریؔ کے زیرِ نظر ضیاءالدین بخشی کا''طوطی نامہ'' بھی تھا۔اس کا جرمن اور انگریزی دونوں زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔یہ کہانی 1801 میں ترجمہ ہو چکی تھی لیکن اشاعت 1803 میں ہوئی۔''توتا کہانی'' کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

''حیدریؔ کی''توتا کہانی'' میں واقعاتی کڑیاں باہم مربوط ہیں ۔فقروں کی دروبست میں حیرت انگیز ہمواری پائی جاتی ہے۔محاورے اور روزمرے کا بے تکلف استعمال نثر کو مزید جاندار بنا دیتا ہے۔ان کے یہاں عورتوں کی بولی کا بے ساختہ پن بہت نمایا ہے۔''24؎

''توتا کہانی'' کا شمار اردو کی بہترین داستانوں میں ہوتا ہے۔بہت سے محققین و ناقدین نے اس کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ڈاکٹر عبیدہ بیگم اور گیان چند جین نے بھی اس داستان کی تعریف کی ہے۔الغرض یہ داستان اہمیت کی حامل ہے۔

''داستان امیر حمزہ''

''داستان امیر حمزہ''، خلیل علی خان اشکؔ کی اہم تصنیف ہے۔اس کو انھوں نے گلکرسٹؔ کی فرمائش پر لکھا

تھا۔ ابتدا میں شہناز نبی اشکؔ کی حالاتِ زندگی اور ان کے تخلص کے بابت ذکر چھیڑتی ہیں بعد میں داستان امیر حمزہ کی طرف آتی ہے اس کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:۔

> ''اشکؔ نے اس کا ترجمہ کیا تھا لیکن انھوں نے کس نسخے سے یہ ترجمہ کیا ہے اس کی تفصیل نہیں بتاتے۔'' 25؎

اس لیے اشکؔ کی اس داستان کا ماخذ شک کے دائرے میں ہے۔ آگے شہناز نبی اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ پہلے انھیں اشکؔ کا قلمی نسخہ نہیں ملا بلکہ امیر حمزہ کے مولف عبداللہ بلگرامیؔ کا مطبوعہ نول کشور پریس کا نسخہ دستیاب ہوا بعد میں کسی دوست کی توسط سے یہ مل سکا۔

''داستان امیر حمزہ'' کا شمار اردو کی سب سے ضخیم داستان میں ہوتا ہے۔ یہ 46 جلدوں میں ہے اور ہر جلد ایک ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے اردو زبان کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اتنی عظیم داستان اس کی ورثہ ہے۔

''آرائشِ محفل عرف قصہ حاتم طائی''

یہ قصہ حیدر بخش حیدریؔ کی تصنیف ہے۔ شہناز نبی اس کے مطالعے کے لیے اس قلمی نسخے کو سامنے رکھتی ہیں جو ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ فارسی سے اردو میں لکھی گئی ہے۔ موصوفہ اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ انھیں اس کے اصل مصنف کا نام نہیں پتا چل سکا ہے اور خود حیدریؔ نے بھی نہیں بتایا ۔ دیباچے میں وہ اتنا لکھتے ہیں کہ یہ فارسی سے ترجمہ لیکن کس کا اس شخص کا نام نہیں بتائے۔ اس طرح شہناز نبی اس کے اصل مصنف کے متعلق معلومات حاصل نہ کرسکی۔ اکثر محققین نے اس کے ماخذ پر بھی بحث کی ہے جبکہ حیدریؔ نے اس تعلق سے بھی کچھ نہیں لکھا ہے وہ لکھتی ہیں کہ:۔

> ''حالانکہ حیدریؔ نے کہیں بھی'' آرائشِ محفل عرف قصہ حاتم طائی'' کے ماخذ پر بحث نہیں کی ہے تاہم عبیدہ بیگم قومی زبان (کراچی ۔جنوری 1964) کے حوالے سے اسے فارسی کے'' حاتم نامے'' سے ماخوذ اور اس کے مصنف کا نام عبداللہ بتاتی ہیں۔'' 26؎

شہناز نبی نے اس کے قلمی نسخے اور مطبوعہ دونوں کو دریافت کیا لیکن ان دونوں نسخوں میں جو اشعار درج

ہیں وہ کہیں کہیں مختلف ہیں جس سے انھیں صحیح غلط کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر اصل نسخہ تک ان کی رسائی ہوتی تو وہ اس داستان کی بہترین ترسیل کر پاتی وہ لکھتی ہیں کہ:۔

> ''قصہ حاتم طائی کو اس کی اصلی شکل میں پڑھنے ہی سے اس عبارت کی سچائی زیادہ بہتر طور پر ثابت ہو سکے گی۔'' 27ے

''ھفت گلشن''

''ھفت گلشن'' مظہر علی خاں ولاؔ کی ایک اور اہم تصنیف ہے۔ یہ فارسی میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مصنف ناصر علی خاں واسطی بلگرامی ہیں۔ ولاؔ نے اس کا ترجمہ 1801 میں کیا۔ اس کا موضوع اخلاق اور پند و نصائح ہے۔ یہ کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے کا نام ''گلشن'' ہے اور ہر ایک حصے کا موضوع الگ الگ ہے۔ شہناز نبی ان سب کا تفصیل سے جائزہ لیتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ:۔

> ''ھفت گلشن میں ابواب کے جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں وہ صاف ظاہر کرتے ہیں کی 'ہفت گلشن'' کا مقصد انسان کو دلچسپ حکایات کے ذریعے اخلاقیات کی تعلیم دینا ہے۔'' 28ے

جہاں تک ولاؔ کے اسلوب کی بات ہے تو ان کے اسلوب کی نگارش اول الذکر دو اور تصنیف ہی کی طرح ہے۔ اس کے اسلوب بھی ان سے کم نہیں ہے۔ اگر چہ کہ اس کا موضوع نصیحت ہے پھر بھی ولاؔ نے اپنے کمالِ فن سے اسے بوجھل ہونے سے بچالیا ہے۔ شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

> ''مظہر علی خاں ولاؔ نے فورٹ ولیم کالج کے دوسرے انشائیہ نگاروں کی طرح صاف، رواں اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ جملے مختصر اور دلنشین ہے۔ نصیحت آمیز باتیں بوجھ نہیں معلوم ہوتیں بلکہ اپنی سادگی کے باعث دل میں اتر جاتی ہے۔'' 29ے

''باغ وبہار''

''باغ وبہار'' میر امنؔ کی تصنیف ہے۔ یہ اردو نثر کی عمدہ نمونہ ہے۔ شہناز نبی اس کی سنِ اشاعت، مضامین اور اس کی تصنیف کی وجہ پر بحث کرتی ہیں۔ قصے کے ماخذ کے تعلق سے امیر خسرو کی ''چہار

درویش'' کا ترجمہ عطا حسین خاں تحسین نے ''نوطرزِ مرصع'' کے نام سے پہلے کیا تھا لیکن اس پر فارسیت کا اتنا غلبہ تھا کہ یہ اتنی مقبول نہ ہوسکی پھر اس کا آسان اردو میں ترجمہ میر امّن نے ''باغ و بہار'' کے نام سے کیا۔ شہناز نبی اس کی زبان اور کردار نگاری پر سیرِ حاصل گفتگو کرتی ہیں اور دیگر محققین کی طرح فورٹ ولیم کالج کی تصنیف میں اسے سب سے اہم مانتی ہیں۔

''نثرِ بے نظیر''

''نثر بے نظیر'' میر بہادر علی حسینی کی ایک اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ یہ میر حسنؔ کی مثنوی ''سحر البیان'' کا نثری خلاصہ ہے۔ میر بہادر علی حسینی کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور متعدد بار چھپی اس کی ایک وجہ میر حسنؔ کی مثنوی کی مقبولیت بھی تھی اور اس کو کئی لوگوں نے بنیاد بنا کر نثر اور نظم میں ڈرامے بنا کر پیش بھی کیے۔

''نثر بے نظیر'' کے ذکر میں شہناز نبی اس کے نسخے کا تعارف دیتی ہیں۔ اس کے ابواب کا تفصیل سے جائزہ لیتی ہیں۔ یہ کتاب 15 ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کا ایک دیوان ہے۔ اس کے متعلق شہناز نبی ایک اہم بات نوٹ کرتی ہیں کہ:۔

> ''حسینیؔ نے پہلے آسان زبان میں صاحبانِ نوآموز کے لئے اس قصے کو لکھا، بعدِ ازاں زبان و بیان کے حسن میں اضافہ کر کے اہل زبان کے لیے تحریر کیا۔ اصل نسخے اور مطبوعہ نسخے میں کافی فرق ہے۔''30

''نثر بے نظیر'' کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی تخلیق کے وقت حسینیؔ نے اس بات کا خیال رکھا کہ میر حسنؔ کی مثنوی کا قصہ اصلیت سے دور نہ ہونے پائے۔ میر حسنؔ نے شہزادی کی جو سج دھج دکھائی ہے اسے حسینیؔ نے بھی اسی طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک ان کے اسلوب کا سوال ہے اس پر ان کے معاصرین میں سے کئی ناقدوں نے قلم اٹھائے ہیں۔ شہناز نبی اس کے اسلوب کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

> ''حسینیؔ نے عموماً مقفع و مسجع نثر استعمال کی ہے تاہم کہیں کہیں سلاست کی مثال بھی پیش کرتے ہیں۔ اپنی کتاب ''آرائش محل'' میں افسوسؔ نے ''نثر بے نظیر'' کے درست کرنے کی بات کہی ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ مصنف نے ہو بہو ترجمہ کرنے کے بجائے اپنے طرز کی ایک الگ کتاب لکھی

ہے۔''31؎

''قصہ فیروز شاہ''

یہ قصہ محمد بخش کی تصنیف ہے۔اس کے تعارف میں شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

''قصہ فیروز شاہ کا قلمی نسخہ ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔قصے کے شروع میں کوئی دیباچہ نہیں ہے اس لئے نہ تو کتاب کی غرض وغایت پر روشنی پڑتی ہے اور نہ مصنف کے بارے میں کچھ پتا چلتا ہے حد تو یہ ہے کہ مصنف کا نام تک ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کتاب ترجمہ ہے یا طبع زاد۔''32؎

یہ داستان کی طرز پر لکھا گیا ہے لیکن اتنا مختصر ہے کہ افسانے کے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک ماخذ کی بات ہے تو یہ قصہ فارسی میں ملتا ہے چونکہ مصنف نے اس کے ماخذ کے تعلق سے کچھ نہیں لکھا ہے اس لیے شہناز نبی فارسی کے قصے کو ہی اس کا ماخذ مان لیتی ہیں جسے ''قصہ فیروز شاہ'' کے نام سے علی نوروز خان نے تحریر کیا تھا۔ اسلوب کے متعلق وہ تفصیل سے گریز کرتی ہیں۔موضوع وفنی محاسن کے بیان میں وہ لکھتی ہیں:۔

''اس کی زبان سادہ آسان ہے۔ قصے میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں ملتی۔ فارسی سے ترجمہ ہونے والی دوسری داستانوں کی طرح اس میں شہزادے کی بہادری اور شجاعت کو پیش کیا گیا ہے۔''33؎

''مذہبِ عشق''

قصہ ''مذہبِ عشق'' نہال چند لاہوری کی شاہکار تصنیف ہے۔اس کا ماخذ عزلت اللہ بنگالی کا فارسی قصہ ''گل بکاؤلی'' ہے۔نہال چند لاہوری نے اس قصے کو گلکرسٹ کی فرمائش پر اسے فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور اس کا نام ''مذہبِ عشق'' رکھا۔حالانکہ اس کے ماخذ کے تعلق سے ایک لمبی بحث ملتی ہے۔ ''مذہبِ عشق'' کو میر خلیل الرحمٰن داؤدی نے مرتب کیا ہے۔داؤدی کا ماننا ہے کہ عزلت اللہ بنگالی کے اس قصے سے پہلے ایک اردو مثنوی ''تحفۃ مجالس السلاطین'' ملتی ہے اور دوسرا قصہ ایک دکنی نسخہ ہے جو قصہ ''گل بکاؤلی'' سے متعلق ہے۔ یہ دونوں تصنیف عزلت اللہ بنگالی سے پہلے وجود میں آ چکی تھی لیکن شہناز نبی عزلت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ کو ہی اس کا ماخذ مانتی ہیں

جس کا ترجمہ نہال چند لاہوری نے 1803 میں کیا اور 1804 میں یہ منظرِ عام پر آیا۔ وہ ''مذہبِ عشق'' کے متعلق لکھتی ہیں:۔

> ''مذہبِ عشق کی شروعات حمد وثنا سے ہوتی ہے۔ حضرت محمد کی نعت اور حضرت مرتضیٰ کی منقبت بیان کرنے کے بعد وجہِ تصنیف بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ داؤدی نے پورے قصے کو چھبیس ابواب پر مشتمل بتایا ہے۔ ہر باب میں ایک داستان ہے نیز ہر باب کا ایک عنوان داستان کی مناسبت سے مقرر کیا گیا ہے۔''34

اسلوب بیان کے متعلق وہ اس کے فنی محاسن ومعائب پر کچھ اس طرح سے نظر ڈالتی ہیں:۔

> ''مذہبِ عشق کی زبان سلاست سے دور ہے۔ فارسی الفاظ وتراکیب کی بہتات زبان کو بوجھل اور گنجلک بنا دیتی ہے۔ جگہ جگہ قرآن اور حوادیث کے حوالے ملتے ہیں۔ انداز بیان تمثیلی اور فلسفیانہ لیکن کہیں کہیں بول چال کی زبان کا برمحل استعمال مزہ دے جاتا ہے۔''35

''خردافروز''

قصہ ''خردافروز'' کو حفیظ الدین احمد نے تصنیف کو بطور تخلیق کیا تھا۔ شہناز نبی کے زیر نظر نسخہ ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے کا محفوظ کردہ ہے۔ اس قصے کے ماخذ کے متعلق وہ لکھتی ہیں:۔

> ''حفیظ الدین ''خردافروز'' کے دیباچے میں اس قصے کی اصلیت بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہندستان کی کسی سرحدی علاقے کے حاکم رائے دابشلیم نے حکیم بید پائے سے گزارش کی کہ وہ بزرگوں کی نصیحتوں کو قصوں کے طور پر بیان کرے لیکن ان قصوں کے کردار انسان نہ ہو بلکہ جانور رہوں۔''36

اس قصے میں امور سلطنت کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ قصہ بہت مقبول ہوا اور اس کے ترجمے ہندستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی کیے گیے۔ عربی اور فارسی زبان میں مختلف ناموں سے اس قصے کے بے شمار ترجمے ملتے ہیں شہناز نبی اس کی ایک لمبی فہرست پیش کرتی ہیں۔

اکبر کے عہد میں ابول فضل نے ''عیار دانش'' کے نام سے ''کلیہ دمنہ'' کی تلخیص پیش کی اور حفیظ الدین

نے اس قصے کو اردو میں ترجمہ کیا انھوں نے اس قصے کو سولہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔شہناز نبی ان سبھی کا تفصیلی جائزہ لیتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ:۔

''ان ابواب کے عنوانات اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ کتاب زندگی کے اسرار ورموز سے واقف کرانے کے لیے لکھی گئی تھی۔'' 37

''بحرِ عشق'' (قصہ سیف الملوک)

''بحرِ عشق'' سید منصور علی کا لکھا ہوا قصہ ہے۔شہناز نبی نے اول الذکر کے طور پر مصنف کے حالات زندگی اور اس کے قلمی نسخے سے متعارف کرواتی ہیں۔اس قصے کے بابت وہ کم لکھتی ہیں لیکن اس کے ماخذ کے تعلق سے وہ کلیم الدین کے تذکرہ ''طبقات الشعراء'' کے ذریعہ یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اس کا ماخذ فارسی کا قصہ ہے۔سیف الملوک مصر کا بادشاہ تھا۔اس قصے میں سیف الملوک اور بدیع الجمال کا ذکر ملتا ہے۔اس کے ساتھ ہی وہ قصہ ''سیف الملوک اور بدیع الجمال'' کے تعلق سے گیان چند پر اعتراض کرتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ:۔

''قصہ سیف الملوک اور بدیع الجمال'' کے متعلق گیان چند کا کہنا ہے کہ یہ الف لیلہ کی کہانیوں میں سے ایک ہے۔وہ ترکی، فارسی، دکنی مثنویوں کے ایک نثری نسخے سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتے ہیں لیکن منصور علی کے ''بحرِ عشق'' کا تذکرہ نہیں کرتے۔غالباً انھیں اس کا علم نہیں ہوگا۔'' 38

اسلوب کے متعلق وہ مختصراً لکھتی ہیں لیکن اس سے منصور علی کا انداز بیان واضح ہو جاتا ہے۔ان کے متعلق وہ کچھ اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں:۔

''منصور علی کا اسلوب سیدھا سادا اور رواں ہیں۔قصے میں ہندستانی پن نمایاں ہے۔مثلاً جب دلآرام کی شادی بادشاہِ مصر سے ہو جاتی ہے اور وہ رخصت ہونے لگتی ہے تو بادشاہِ یمن ایسے کلمات ادا کرتا ہے جیسے کوئی عام ہندستانی باپ اپنی بیٹی کو وداع کر رہا ہو۔'' 39

''حسن وعشق'' (گل وہرمز)

''قصہ حسن وعشق'' کے مصنف غلام حیدر عزت ہیں۔انھوں نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل کیا تھا

۔''حسن وعشق''، کو پہلے کسی نے فارسی نظم میں تحریر کیا تھا اور اس کا نام ''آبِ گلشن''، رکھا تھا بعد میں اسے منشی المناشی محمد وارثؔ نے اسے مختصر کر کے نثر میں لکھا اسے ہی بعد میں عزتؔ نے اردو میں لکھا۔ یہ خالص ترجمہ نہیں ہے بلکہ عزتؔ نے کہیں کہیں بعض فقرے اور مبالغے جو کہ موافق نہ تھے اسے بدل کر لکھا ہے اور اس کا اعتراف وہ اپنے دیباچے میں کرتے ہیں۔ یہ قصہ عشقیہ داستان پر مبنی ہے۔ شہناز نبی نے اسے مختصراً بیان کیا ہے اور اس کے اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے متعلق وہ لکھتی ہیں:۔

> ''قصہ حسن وعشق کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ قصہ سادہ اور رواں زبان میں لکھا گیا ہے۔ جملے مختصر اور بے ساختہ ہیں۔ عزتؔ نے اس نکتے کو ملحوظ رکھا کہ زبان بہت ادق اور بوجھل نہ ہو۔ محاوروں کا استعمال چست و راست ہوں ۔''40

''گل صنوبر''(گلشنِ ہند)

یہ باسط خان باسطؔ کی تصنیف ہے۔ ابتدا میں شہناز نبی اس کے نسخے کا تعارف پیش کرتی ہیں بعد ازاں باسطؔ کی مختصر حالات زندگی کو موضوع بحث بناتی ہیں۔ ماخذ کے تعلق سے وہ یہ بات رکھتی ہیں کہ باسطؔ نے اپنے دیباچے میں اس کے ماخذ کے تصدیق نہیں کی ہے تاہم عبیدہ بیگم اور گیان چند جین اس کا ماخذ فارسی کا ایک قصہ بتاتے ہیں۔ ''گل صنوبر'' کا قصہ اردو میں کئی بار ترجمہ ہوا ہے اس کا ایک ترجمہ نیم چند رکھتری کا بھی ہے اس کے نسخے بہت نایاب ہیں۔

شہناز نبی کو ایک نہیں بلکہ اس کے دو اور مخطوطے ملے جس میں پہلے کے مصنف کا نام نہیں ہے لیکن دوسرے کا مصنف کے نام باصر علی خاں ولد قدرت بلگرامی ہے۔ اس نسخے اور ''گلشنِ ہند'' کے قصے میں مماثلت کے سبب شہناز نبی اسے ہی اس قصے کا ماخذ مانتی ہیں۔ ''گلشنِ ہند'' پر بہت کم محققین کی نظر گئی ہے یہاں تک کہ گیان چند جین بھی اس سے محروم رہ گئے تھے شہناز نبی اس کی طرف یوں اشارہ کرتی ہیں:۔

> ''گیان چند جین تو باسطؔ کے ترجمے سے بھی ناواقف تھے۔ اپنی تصنیف ''اردو کی نثری داستانیں'' 1954 والی پہلی اشاعت میں اس کا ذکر نہیں کرتے ہیں تاہم دوسری اشاعت (اتر پردیش اردو اکیڈمی 1987) میں جاوید نہالؔ کے حوالے

سے باسطؔ کے اس ترجمے کا ذکر کرتے ہیں۔"41

"گلشن ہند" کے قصے کے تعارف میں وہ اس کی اٹھارہ نقلوں کا ذکر کرتی ہیں۔ان نقلوں کے بیچ بیچ میں حکایات درج ہیں۔یہ حکایات کافی سبق آموز ہیں۔اس میں جن،ملوک کا قصہ بھی شامل ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی تقریباً سبھی داستانیں انعام کی حقدار قرار پائیں تھی لیکن باسطؔ کا یہ قصہ انعام پانے سے محروم رہا حالانکہ یہ قصہ فنی محاسن کے بنا پر عمدہ ہے۔شہناز نبی اس کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> "باسط خاں باسطؔ کا ترجمہ بہت ہی رواں ہے۔زبان دلکش و واقعات دلچسپ ہے۔پتا نہیں فورٹ ولیم کالج کی کاؤنسل نے اسے انعام سے کیوں نہیں نوازا۔وجہ کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ اتنے خوبصورت ترجمے کو نظر انداز کر کے کالج کاؤنسل نے باسطؔ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔"42

"دلآرام و دلربا"

اس کے مصنف تو تارام ہیں۔نسخے کے تعارف کے بعد شہناز نبی اس کے موضوع پر آتی ہیں۔اس قصے میں تو تارام نے گلکرسٹؔ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔اس کتاب کو بھی گلکرسٹؔ نے انعام کی فہرست میں رکھا تھا لیکن اسے انعام سے محرور رکھا گیا جب کہ اس قصہ اور اسلوب بیان دونوں ہی عمدہ ہے۔شہناز نبی اس کے متعلق لکھتی ہیں:۔

> "ان کا اسلوب رواں اور با محاورہ ہے۔یہاں ہندی اور فارسی کے الفاظ کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔قصے کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے اور واقعات میں تسلسل پایا جاتا ہے۔"43

"گلزارِ دانش"

یہ قصہ سید حیدر بخش حیدریؔ کی تصنیف ہے۔یہ "بہارِ دانش" کا اردو ترجمہ ہے۔اصل قصہ شیخ عنایت اللہ کا ہے جو کسی برہمن بچے کی فرمائش پر فارسی میں کہے تھے۔شہناز نبی کے زیر نظر نسخہ "گلزارِ دانش" کا خطی نسخہ رہا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔وہ اس کے نسخے کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد اس کے تعارف کے ساتھ اس کے محاسن و معائب پر بھی نظر ڈالتی ہیں۔زبان کے حوالے سے وہ حیدریؔ کی زباں کو گنجلک مانتی

ہیں۔اشعار کی بھر مار کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ طبیعت پر گراں گذرتے ہیں۔اس کی خاص بات میں وہ اس کی فارسی تراکیب پر بحث کرتی ہیں جس کے استعمال سے زبان میں لطف پیدا ہوگیا ہے۔وہ اس قصے کا مختصراً ذکر پیش کرتی ہیں۔

''قصہ رضوان شاہ (نگارخانۂ چین)

یہ خلیل علی خاں اشکؔ کی دوسری اہم تصنیف ہے۔شہناز نبی اس کے تعارف کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیتی ہیں کہ اس قصے کے تعلق سے ابھی تک یہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ یہ طبع زاد تصنیف ہے یا کسی قصے کا ترجمہ ہے۔یہ قصہ مافوق الفطرت عناصر سے بھرا ہوا ہے۔عشق کے رموز نے اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔جہاں تک اسلوب کی بات ہے تو یہ کہیں آسان اردو میں تو کہیں فارسی میں ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہناز نبی نے لکھا ہے:۔

> ''اشکؔ کا سلوب کہیں فارسی آمیز اور کہیں سلیس اردو کی مثال ہے۔لگتا ہے کہ اشکؔ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ وہ صاحبانِ نوآموز کی ضرورتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے آسان اردو میں قصہ لکھیں یا پھر فارسی روایات کے احترام میں فارسی آمیز لہجہ اختیار کریں۔''[44]

''مثنوی دراحوال کلکتہ مع قصہ بلند اختر''

یہ نور خان کی تصنیف ہے۔اس قصے کے ساتھ ایک مثنوی بھی شامل ہے جس میں کلکتہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔قصہ ''بلند اختر'' کے تعارف کے بعد اس کے نسخے کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔قصے پر گفتگو کے وقت وہ لکھتی ہیں:۔

> ''نورؔخان نے دیباچے میں لکھا ہے کہ پہلے قصہ بلند اختر کو انھوں نے مثنوی کے روپ میں لکھا تھا جس میں تقریباً چھ ہزار اشعار تھے لیکن فورٹ ولیم کالج میں نثری کاوشوں کی پذیرائی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اس قصے کو نثر میں منتقل کر دیا۔''[45]

نورؔخان نے اس قصے میں جگہ جگہ اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔جہاں تک اس کے اسلوب کی بات ہے تو اس قصے کے اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں مقفی اور مسجع نثر پسند تھی۔

’’چار گلشن‘‘

’’چار گلشن‘‘، بنی نرائن جہاں کی تصنیف ہے۔ابتدا میں شہناز نبی اس کے متعلق لکھتی ہیں:۔

’’محققین اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں کہ بنی نارائن جہاں کی یہ تصنیف ترجمہ ہے یا طبع زاد۔ بنی نارائن نے بھی ’’چار گلشن‘‘ کے دیباچے میں اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے کہ آیا یہ قصہ ترجمہ ہے یا ماخوذ اگر ترجمہ ہے تو کس کا یا ماخوذ ہے تو کس سے۔ وہ صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ یہ قصہ ان کو یاد تھا۔انھوں نے منشی امام بخش اسرار پر اس کو تحریری شکل عطا کی۔‘‘ 46

وہ کریم الدین اور عبیدہ بیگم کا ذکر ان معنوں میں کرتی ہیں کہ ان دونوں نے ہی اس کا ماخذ ہلاآلی کی کہانی ’’شاہ درویش‘‘ کو بتایا ہے لیکن شہناز نبی دونوں کو الگ قصے مانتی ہیں اور دونوں کی ہی باتوں کو قیاس آرائی تک محدود رکھتی ہیں۔اس کے بعد وہ نارائن کی حالت زندگی پر تفصیلی بحث کرتی ہیں۔ بعدازاں ’’چار گلشن‘‘ کے قصہ پر نظریں ڈالتی ہیں اور ایک خاص بات نوٹ کرتی ہیں وہ لکھتی ہیں:۔

’’چار گلشن کا قصہ سیدھا سادا ہے۔عام طور پر قصوں میں مہم دکھائی جاتی ہے اور ہیرو کی بہادری کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن ’’چار گلشن‘‘ میں نسوانی کردار کو اہمیت دی گئی ہے۔فرخندہ کا کردار ایک فعال اور متحرک کردار ہے۔ وہ ذہنی طور پر چست ہونے کے علاوہ نک سک سے بھی درست ہے۔‘‘ 47

’’بہارِ عشق (ترجمہ نل دمن)‘‘

یہ قصہ سید نور علی کی تصنیف ہے۔ یہ فیضی کی مثنوی ’’نل دمن‘‘ سے ماخوذ ہے۔ یہ قصہ ہندستانی ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور مہا بھارت کی طرح ہے۔ اکثر محققین کو اس کے منظوم ہونے کا مغالطہ ہو جاتا ہے جس پر شہناز نبی نے اعتراض کیا ہے اس میں نارنگ صاحب بھی ہیں۔ وہ ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

’’میر علی بنگالی یا میر نور علی نے کوئی منظوم قصہ نہیں لکھا تھا۔ غالباً یہ وہی نثری کارنامہ ہے جو قصہ ’’بہارِ عشق‘‘ کے نام سے کا جانا گیا اور جو فیضی کی مثنوی کا خلاصہ ہے۔‘‘ 48

آگے شہناز نبی ''بہارِعشق'' کے اسلوب کے بارے میں لکھتی ہیں:۔

''بہارِعشق میں نورعلی نے جا بہ جا اشعار پیش کیے ہیں جو ٹھونسے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہی بات اگر وہ نثر میں کہتے تو زیادہ صاف اور واضح ہو سکتی تھی۔ ان کا لہجہ فارسی آمیز اور پر تصنع ہے۔'' 49

''زبدۃ الخیال''

''زبدۃ الخیال'' مولوی عالم علی کی تصنیف ہے۔ شہناز نبی نے اس کے قلمی نسخے کا تعارف پیش کیا ہے اور یہ بات بھی واضح کی ہے کہ یہ کسی شجاعت علی خاں کی ملکیت تھا۔ آگے وہ انکشاف کرتی ہیں کہ عالم علی خاں نے اس کے دیباچے میں کچھ خاص نہیں لکھا جس سے اس کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ وہی اس کے ماخذ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ میر تقی محمد خیال کی فارسی تخلیق ''بوستانِ خیال'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ سو جلدوں پر مشتمل تھی۔ انھوں نے اس کی طوالت کو دیکھتے ہوئے آسان اردو میں دوستوں کے کہنے پر ترجمہ کر دیا۔ جہاں تک زبان کی بات کریں تو ان کے یہاں فارسیت کا غلبہ ہے۔ قصوں کا پھیلاؤ زیادہ ہے۔ شہناز نبی اس قصے کے متعلق بہت مختصراً جائزہ پیش کرتی ہیں۔

''الف لیلیٰ''

''الف لیلیٰ''، عبدالکریم کی تصنیف ہے۔ اس کے تعارف میں شہناز نبی لکھتی ہیں کہ:۔

''الف لیلہ یا ہزار راتیں، یا 'ایک ہزار راتیں' کہانیوں کا وہ مجموعہ ہے جو اصلاً عربی زبان میں ہے لیکن اس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان میں ہے۔ نویں صدی سے اب تک اس نے مختلف روپ بدلے محققین اس بارے میں حتمی رائے نہیں دے پائے ہیں کہ ''الف لیلہ'' کی یہ کہانیاں کتنے ادوار سے گزریں اور ان میں کیا کیا نمایاں تبدیلیاں آئیں۔'' 50

پھر بعض حقائق کی روشنی میں وہ خود اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''الف لیلہ' کی کہانیوں پر مختلف ممالک کی تہذیب اور ثقافت کا اثر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ کہانیاں اپنے ماخذ کے اعتبار سے کچھ بھی ہوں لیکن انھوں نے ارتقائی مراحل جہاں طے کیے ہیں وہیں کا رنگ و آہنگ اختیار کیا مثلاً ایران

،بغداد اور مصر میں لکھی گئی کہانیاں ان ممالک کے تہذیبی اثرات لیے ہوئے ہے۔''51

''الف لیلہ'' کا پہلا ترجمہ گالاں نے فرانسیسی زبان میں کیا تھا۔ بات اگر عبدالکریم کی ''الف لیلیٰ'' کی کی جائے تو یہ چار حصوں ہے۔ دیباچے میں عبدالکریم نے اسے انگریزی سے ترجمہ بتایا ہے لیکن انھوں نے اس کے مصنف اور کس کتاب سے کیا ہے یہ نہیں لکھا ہے جب کہ گیان چند جین اسے فاسٹر کا ترجمہ بتاتے ہیں لیکن شہناز نبی اسے شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں کیونکہ اس کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے۔

ایک اور بات جو قابل غور ہے کہ شہناز نبی اس قصے کے متعلق میں اس کا اعتراف کرتی ہیں کہ عبدالکریم نے ''الف لیلہ'' کا ترجمہ اپنے رٹائرمنٹ کے بعد لکھنو میں کیا تھا لیکن ان کی کلکتہ سے وابستگی کے بنا پر انھوں نے اسے ''منثوراتِ بنگالہ'' میں شامل کیا ہے۔

میں شہناز نبی کی اس کتاب ''منثوراتَ بنگالہ'' کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ ان کی یہ کتاب بنگال کی نثری ادب کی تاریخ کے تعلق سے ایک دستاویز کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں نہ صرف بنگال میں اردو نثر کی روایت پر محققانہ نظر ڈالی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی انیسویں صدی میں سرزمین بنگال میں لکھی گئی داستان اور قصوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی ہی محنت و لگن سے ان قصوں کے مختلف نسخوں کے قلمی و خطی اور مطبوعہ نسخوں کو دریافت کیا اور اس کے اقتباسات کو نمونے کے طور پر اس کتاب میں شامل کیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب ایک طرح سے نثری نمونوں کا مرکز بن گئی ہے۔ مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی کی یہ کتاب اردو تحقیق میں فورٹ ولیم کالج اور بنگال کی نثری خدمات کے حوالے سے ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

کلامِ نساخ (2007)

''کلامِ نساخ'' شہناز نبی کی تیسری اہم تحقیقی کتاب ہے۔ یہ کتاب 2007 میں انترکش پرنٹنگ سسٹم ،اے پی سی روڈ، کولکاتا۔9 سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب 192 صفحات پر مشتمل ہے۔

عبدالغفور خان کا تعلق سرزمین بنگال سے ہے لیکن ان کے علمی و ادبی کارنامے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کا شمار ہندستان کی اہم ادبی شخصیتوں میں ہونے کا مستحق ہے۔ نساخ کو اپنی زندگی میں مختلف مسائل کا سانا کرنا

پڑا۔ پیدا ہوتے ہی ماں اور چند دن کے بعد باپ کا سایا بھی سر سے اٹھ گیا۔ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی نے کی اور اس طرح انھوں نے ماں باپ کی کمی کے باوجود بڑے بھائی کی زیر پرورش اپنی محنت ولگن سے ڈپٹی مجسٹریٹ اور پھر ڈپٹی کلرک کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پیشے کی وجہ سے مختلف جگہوں پر ان کا تبادلہ ہوتا رہا لیکن یہ تبادلے بھی ان کے ادبی سفر کو نہ روک سکے۔وہ جہاں جہاں گئے شعر وشاعری،تصنیف وتالیف،ترتیب وتدوین،ترجمے کا شوق بھی ساتھ ساتھ رہا۔ان کے ان صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

> ''شعری نظریے کے ساتھ ساتھ تنقیدی وتحقیقی شعور بھی کچھ کم بالغ نہ تھا۔ایک طرف دواوین شائع ہورہے ہیں تو دوسری طرف اردو فارسی شعراء کے کلام کے انتخاب وتذکرے بھی چھپ رہے ہیں۔نصابی کتابیں کو ترتیب دے رہے ہیں۔شاگردی و استادی کے رشتے بھی نبھائے جارہے ہیں،مشاعروں میں بھی شرکت ہورہی ہے۔علمی وادبی معرکوں و مذہبی مناظروں اور مباحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں مقدموں کے فیصلوں پر غور فرمارہے ہیں۔غرض نساخ ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کا نام تھا جس کے اندر بیقراری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔''52

ایسی ہمہ جہت شخصیت شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔غالب نے جسے''دانائے رموزِ اردو زبان'' کہا تھا ضرور اس کے اندر کچھ بات تو ہوگی پر افسوس اس بات کا ہے کہ ایسی شخصیت پر بھرپور قلم کسی نے اب تک نہیں اٹھایا۔کچھ لوگوں نے لکھا بھی تو تشنہ یہاں تک کہ ان کی پیدائش اور ان کے زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کی گئی جو لکھا گیا وہ بھی سنا ہوا یا پھر نساخ کی تصنیفات سے مدد لے کر لکھا گیا ہے اس پر تحقیق کر کے ان باتوں کی تصدیق نہ کی گئی۔شہناز نبی نے اس تشنگی کو مٹانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کتاب کی وجہِ تصنیف بتاتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> ''زیرِ نظر کتاب 'کلامِ نساخ' میں نساخ کی حیات، ان کی تصانیف، ان کے اساتذہ وتلامذہ پر روشنی ڈالنے کے علاوہ نساخ کی ان ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا اب تک تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔''53

ان ہی مقاصد کو سامنے رکھ کر شہناز نبی نے ان کی زندگی کے مختلف مدارج کی صورتحال کو قلم بند کیا ہے۔

نسآخ کے تمام اساتذہ سے متعارف کروایا ہے جس سے انھوں نے فیض اٹھایا تھا ساتھ ہی نسآخ کے شاگردوں کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ نسآخ کے تعلق سے کوئی بھی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے اس لیے انھوں نے نسآخ کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ نسآخ کے خاکے، سفرنامچے کے علاوہ دیگر ان کی تصانیف، کلامِ نساخ غرض ان تمام پہلوؤں پر تحقیقی و عالمانہ گفتگو کی ہے اور آخر الذکر اس کتاب کی ترتیب میں معاون تمام کتابوں کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں نسآخ کے آخری شعری مجموعہ ''ارمغان'' کے انتخاب کو شامل کیا ہے جس سے اس کی اہمیت میں اضافہ واقع ہوا ہے۔

عبدالغفور خاں نسآخ کی ولادت اور ان کی زندگی کے حالات کے متعلق جاننے کے لیے مصنفہ نے نسآخ کی خودنوشت ''سوانح نساخ'' کو سامنے رکھا جس کی وجہ سے ہم لوگوں تک نسآخ کے زندگی کے حالات، ان کے آباؤ اجداد، معاشی تنگی، سلسئہ روزگار، احباب، اساتذہ، تلامذہ وغیرہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی جا سکے۔ اس تعلق سے وہ نسآخ کے سلسئہ نسب، نسآخ کی ولادت، ابتدائی زندگی، نسآخ کے مختلف علم وفنون اور کھیل سے رغبت، بحیثیت ڈپٹی مجسٹریٹ، شادی اولادیں، اخلاق وعادات، رہن سہن، شکل وصورت، عقائد وتوہمات، اساتذہ وتلامذہ ان سب پر پرمغز تحقیقی گفتگو فرمائی ہے۔

یوں تو عبدالغفور خان نسآخ بحیثیت شاعر زیادہ مشہور ہوئے ہیں لیکن ان کی شاعری ہی کی طرح ان کے سفرنامے بڑی اہمیت کے حامل ہے۔ چونکہ نسآخ کچھ تو سفر کے شوقین تھے اور کچھ نوکری کی وجہ سے، کچھ علاج کے سلسلے میں سفر کرنا پڑا۔ وہ جہاں بھی جاتے لوگوں سے ملتے اور مختلف مقامات کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے متعلق معلومات بھی اکٹھا کرتے۔ شہناز نبی نے ان کے مختلف مقامات کے اسفار کو پیش کیا ہے جس میں مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش)، کا ایک ضلع برسال، راجشاہی، بانکا (بھاگلپور)، دہلی، لکھنو، سارن (چھپرا)، مونگیر، سلہٹ، ڈھاکہ، میدنی پور کا ذکر ہے۔

چونکہ نسآخ کا آبائی وطن بنگال تھا لیکن نسآخ بنگال سے باہر بھی اپنے علمی وادبی رشتے بنائے رکھنا چاہتے تھے (نسآخ خود کو غالبؔ کا دوست کہتے تھے)۔ نسآخ جہاں جہاں بھی گئے اس رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ وہاں کی آب وہوا، بودوباس، سماجی وتہذیبی زندگی وغیرہ پر بھرپور نظر ڈالتے تھے اور ان سبھی کا ذکر اپنے سفرناموں میا کیا ہے جس کی طرف شہناز نبی نے اشارہ بھی کیا ہے۔

ناسخ کو سفر کے دوران جن حالات و حادثات سے گزرنا پڑا، ان کی کن کن لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان سے ناسخ کا کیسا تعلق رہا ان سب کا ذکر شہناز نبی ان کے مختلف سفرنامچے کے ذریعے پیش کرتی ہیں جس سے ہمیں ناسخ کے اخلاق و عادات کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت و مزاج اور شخصیت کا پتا چلتا ہے۔

ناسخ کی خودنوشت ''سوانح ناسخ'' سفرنامچے کی طرح ان کے مختلف شخصیتوں پر لکھے گئے خاکے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں کئی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جن سے ان کی زندگی کے مختلف پڑاؤ میں ملاقات رہی۔ ان میں کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جن کی اہمیت تاریخی ہے جیسے سنسکرت کے پروفیسر پی۔ کاول جن کا ناسخ نے فارسی اور ناگری میں لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ ناسخ کی خوبی یہ تھی کہ وہ سب کو اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے جن شخصیتوں کا ذکر کیا ہے ان میں ان کے استاد، شاگرد، احباب اور ان کے ہم عصروں، بادشاہوں، نوابوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کا مکھیا ہو یا چوکیدار ان سب شامل ہیں۔ شہناز نبی ناسخ کی خاکہ نگاری کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> ''ناسخ کے اطراف چلتے پھرتے بظاہر یہ کچھ غیر اہم کردار ہیں جو ناسخ کی زندگی میں آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن ان معمولی اور غیر اہم کرداروں کو بھی ناسخ نے اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھا تھا۔ ناسخ کے مشاہدے نے ان کو مختصر خاکوں میں ڈھال دیا ہے۔'' 54

ناسخ کے ان خاکوں میں ان کے کرداروں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ شہناز نبی کوشش کرتی ہیں کہ کچھ شخصیتوں کے خاکوں کو پیش کریں۔ اس سلسلے میں وہ کچھ تاریخ ساز شخصیتوں کی بات کرتی ہیں۔ ان شخصیتوں کے بعض پہلو ایسے ہیں جنھیں صرف ناسخ نے محسوس کیا تھا۔ اس ضمن میں وہ خواجہ میرن کا ذکر کرتی ہیں جو شطرنج کے شوقین تھے اور اکثر ناسخ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ خواجہ میرن بڑے ہی با اخلاق اور سخی آدمی تھے ناسخ نے ان کی سخاوت کا ایک قصہ ان کے خاکے میں بیان کیا ہے جس کی طرف شہناز نبی اشارہ کرتی ہیں۔

نواب عبداللطیف خان ناسخ کے بڑے بھائی تھے۔ ان ہی کے ہاتھوں ناسخ کی پرورش ہوئی۔ ناسخ نے ان کے خاکے میں لکھا ہے کہ شروع میں جب انھیں نوکری نہیں ملی تھی تو انھیں ایسا لگتا تھا کہ ان کے بھائی ان کے

بارے میں کچھ سوچتے نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ ان سے ناراض رہتے تھے لیکن بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ ایسا نہیں تھا وہ بھی ان کے لیے بہت پریشان رہتے تھے لیکن ظاہر نہیں کرتے تھے انھوں نے نساخ کی نوکری کے لیے کوششیں کی تھی جب بعد میں ان کا پتا چلا تو وہ ان کی محبت کے قائل ہوگئے ۔ان کے خاکے سے معلوم سے ہوتا ہے کہ عبدالطیف خان گھریلو ذمے داریوں کو بخوبی انجام دیتے تھے جس کی وجہ سے پورے کلکتے میں ان کی پر اثر شخصیت کی اچھی پہچان تھی ۔عبدالطیف نے مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے لیے زور دیا۔ وہ سماجی وفلاحی سرگردگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ۔روم میں جنگ ہوئی تھی انھوں نے چندہ جمع کر کے گھائلوں کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔غرض نساخ کے اس خاکے سے عبدالطیف کے شخصیت کے تمام پہلوں سامنے آتے ہیں جس کا ذکر شہناز نبی تفصیل سے کرتی ہیں۔

ان کے علاوہ نسآخ کے خاکوں میں جس کو شہناز نبی اہم مانتی ہیں ان میں ایک خاکہ کاولؔ صاحب کا بھی ہے جنھیں نساخ نے فارسی اور ہندی لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔نسآخ انھیں ان کے گھر جا کر پڑھاتے تے۔کاولؔ کو مختلف زبانوں سے دلچسپی تھی۔وہ نساخ کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے۔وہ انھیں دوسرے کام کے معاوضے بھی دیا کرتے تھے تا کہ نساخ کی مالی تنگی دور ہو سکے۔ چرنجیت رائے کا خاکہ بھی اہمیت رکھتا ہے شہناز نبی اس کا بھی ذکر کرتی ہیں۔

تاریخی اور اور چھوٹے کرداروں کے ساتھ ساتھ نساخ کو فقیروں ،ولیوں سے بھی لگاؤ تھا نسآخ نے ان کے بھی خاکے لکھے ہیں جن میں شہناز نبی شاہ صاحب اور شاہ نوری کے خاکے قابل ذکر سمجھتی ہیں۔نساخ نے ان خاکوں میں ان کے کپڑے، رہن سہن، ان کا اپنے معتقدوں سے ملنے کا نداز ان سب کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ ہمیں انیسویں صدی کے ہندستان کے سماجی ماحول کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسآخ کے یہ خاکے تاریخ دستاویز کی بھی اہمیت رکھتے ہیں۔گوکہ شہناز نبی نے ان کے خاکوں کو بڑے ہی مختصراً انداز میں پیش کیا ہے لیکن پھر بھی اس سے نسآخ کی خاکہ نگاری کا پتا چل جاتا ہے۔

تصانیف نساخ:۔

شہناز نبی نے تصانیف نساخ کے عنوان سے ان کی 22 تصنیفات کے نام بتایے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

1۔چشمۂ فیض　　　　2۔دیوان نساخ مسمی بہ دفترِ بے مثال

3۔نصابِ زبانِ اردو
4۔منتخباتِ دواوینِ شعرائے ہند
5۔قندِ پارسی
6۔سخن شعرا
7۔زبان ریختہ
8۔اشعارِ نساخ
9۔قطعہ منتخب
10۔شاہدِ عشرت
11۔گنجِ رواریخ
12۔مرغوبِ دل
13۔ارمغان
14۔کنز تواریخ
15۔انتخابِ نقص
16۔مظہرِ معمہ
17۔ترانۂ خامہ
18۔نصرۃ المسلمین
19۔ارمغانی
20۔باغِ فکر معروف بہ مقطعاتِ نساخ
21۔تذکرۃ العاصرین
22۔خودنوشت سوانح حیات نساخ

آگے شہناز نبی نے ان کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ وہ نہ صرف کتاب کا تعارف پیش کرتی ہیں بلکہ ان کی موجودہ حالت کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ان کے اسلوب، انداز بیان، اہمیت ومعنویت ان سبھی پر محققانہ اور ناقدانہ نکتۂ نگاہ سے گفتگو کی ہے۔ وہ نساخ کی کتابوں پر دیگر محققین کی رائے کو بھی پیش کرتی ہیں۔نساخ کی کچھ کتابیں موضوعِ بحث بھی ہیں وہ اس کا بھی ذکر کرتی ہیں اور آخر میں شہناز نبی اس بات کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی وہ نساخ کی تمام تصنیفات کو دریافت نہ کرسکی ہیں۔غرض نساخ کی دریافت شدہ تصنیفات کا جائزہ لینے کے بعد شہناز نبی اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ:۔

> ''نساخ کی اردو نوازی کا صلہ اسی وقت زیادہ بہتر طور پر دیا جاسکتا ہے، جب ان کی ساری تصنیفات کو یکجا کر کے ایک بار منظرِ عام پر لایا جائے اور ان کو زیادہ بہتر طور پر دریافت کر کے ان کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جائے۔'' 55

کتاب کے آخر میں کلام نساخ کے عنوان سے شہناز نبی نے ان کے کلام کے نمونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو نساخ کے آخری شعری مجموعے''ارمغان'' میں ہے۔اس کی پیش کش میں شہناز نبی نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ یہ ردیف کے مطابق سلسلے وار ہوں۔اس طرح انھوں نے نساخ کی غزلیں ،قطعات، رباعیات کے

نمونے قاری تک پہنچانے کی سعی کی ہے تا کہ نساؔخ کی اہمیت ان کے کلام کے فنی محاسن کے ذریعے سمجھا جا سکے۔

الغرض شہناز نبی کی یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب کے ذریعے انھوں نے نساؔخ کی ہمہ جہت شخصیت کو عالم ادب سے روشناش کرانے کی جو کوشش کی وہ لائق تحسین ہے۔قابلِ غور بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس کتاب کو نساؔخ پر لکھی ہوئی ایک مکمل کتاب ثابت نہیں کرتی ہیں وہ لکھتی ہیں:۔

> ''اس کتاب کی اشاعت کے بعد نساخ کو دریافت کرنے کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔نساخ کے احباب،ان کے معاصرین،ان کی دوسری تصنیفات پر مزید گفتگو کی جاسکتی ہے۔ابھی نساخ پر تحقیق کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں۔ان کی تربت کی تلاش اوران کی یادگار قائم کرنے کا فریضہ ابھی باقی ہے۔56

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی کی یہ کتاب اردو کے ایک اہم شخصیت کی تلاش اور اس کی ادبی خدمات سے نہ صرف ہمیں متعارف کرواتی ہے بلکہ اس میں نساخ کے اسلوب،انداز بیان، اور باقی ساری خصوصیات پر بھی بھر پور تنقیدی بحث بھی ملتی ہے۔لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی کی یہ کتاب تحقیقی اور تنقیدی دونوں نقطۂ نظر سے اہم ہے۔

شہناز نبی کی تحقیق کی طرح ان کی تنقید بھی معیاری ہے۔ان کا تنقید سے لگاؤ اتنا ہے کہ انھوں نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کے موضوع کے لیے تنقید کو ہی منتخب کیا اور''1960 کے بعد اردو تنقید کا ارتقا'' کے موضوع پر اپنا مقالہ داخل کیا چونکہ یہ باب ان کی تحقیق اور تنقید دونوں پر مبنی ہے اس لیے میں ان کی تحقیقی کتابوں کا جائزہ لینے کے بعد اب ان کی تنقیدی کتابوں کا جائزہ لینا مناسب سمجھتی ہوں جس سے بحیثیت نقاد ان کے مقام کا تعین ہوگا

تانیثی تنقید (2009)

یہ کتاب کلکتہ یونیورسٹی سیلز کاؤنٹر 87،کالج اسٹریٹ کولکاتا۔73 پریس سے شائع ہوئی ہے۔یہ 128 صفحات پر مشتمل ہے۔شہناز نبی کے مضامین کا یہ مجموعہ 2009 میں منظرِ عام پر آیا۔اس میں شامل کل مضامین کی تعداد 9 ہے۔یہ مضامین درج ذیل ہیں:

1۔عورت اور لغات

2۔اردو میں نسائی نظموں کے موضوعات

3۔مرد ادیبوں کے فکشن میں عورت کا تصور اور کردار

4۔اردو نظم کے فروغ میں خواتین کا حصہ

5۔خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقی حسیت

6۔اردو شاعرات کی نظموں میں لسان کا عمل

7۔اکبرالہ آبادی اور تعلیم نسواں

8۔سجاد ظہیر کا اشترا کی نظریہ اور خواتین قلم کار

9۔فراقؔ کا تصور عشق

اس کتاب کی ابتدا میں چند مغربی خواتین ادیبوں کے تانیثی ادب کے ہمنوائی میں لکھے گئے مقولات کو شہناز نبی نے مثال کے طور پر لکھا ہے۔اپنے پیش لفظ میں شہناز نبی اس کتاب کا نام ''تانیثی تنقید'' رکھنے کا سبب کچھ یوں بتاتی ہیں:۔

> ''اس کتاب کا نام 'تانیثی تنقید' رکھنے کی وجہ صرف اتنی ہے کہ کچھ تو مجھے پرانے متون سے متعلق سوالات اٹھانے تھے اور کچھ خواتین قلم کاروں کو اپنے طور پر سمجھنا تھا۔''57

شہناز نبی ادب میں جنس کو بنیاد بنا کر خواتین قلم کاروں کو نظر انداز کیے جانے اور ادب میں مردوں کی بالا دستی کی وجہ سے نالاں نظر آتی ہیں اس لیے وہ اس کتاب کی تخلیق کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:۔

> ''مرد اساس معاشرے میں مردوں نے ہر میدان میں اپنی بالا دستی قائم رکھی ۔ادب میں بھی وہ عورتوں کو برابری کا درجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔۔۔۔امید ہے کہ میری یہ کتاب ادب میں تانیثی تنقید کی روایت کو مظبوط کرنے کا کام کرے گی اور تانیثیت کی روایت کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔''58

اس کتاب کے پہلے مضمون کا عنوان ''عورت اور لغات'' ہے۔اس مضموں میں شہناز نبی نے لغات میں لفظ 'عورت' کے مفہوم بتاتے ہوئے عورتوں کے ساتھ ہوئی زیادتیوں کا ذکر کرتی ہیں اس سلسلے میں انھوں نے فرہنگ آصفیہ ،نور الغات، فیروز الغات ،لغاتِ کشوری، اردو انسائیکلو پیڈیا میں لفظ 'عورت' کے مفہوم بتاتے ہوئے یہ ثابت

کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ عورت زمانۂ قدیم ہی سے ایک کمزور، بے بس، انڈہ دینے والی وغیرہ کے معنوں میں لی جارہی ہے۔ان باتوں پر پر وہ سوالات بھی اٹھاتی ہیں کہ عورت کے متعلق نظریات میں تبدیلیاں کب آئیں گی؟ زبان وبیان کے نئے اصول کب مرتب ہوں گے؟ عورتیں اپنے استحصال سے کب واقف ہو پائیں گی ؟ ہندستان میں بالخصوص اردو میں تانیثیت بحیثیت ایک مظبوط تحریک کے کب پھولے گی؟

اس مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہناز نبی تانیثی ادب کے حوالے سے کتنی فکرمند ہیں ۔وہ ادب میں خواتین قلم کاروں کو ان کا الگ مقام دینے کی متمنی ہیں ۔وہ قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، وغیرہ کا ذکر کرتی ہیں کہ اگر چہ ان کے ادب میں تانیثی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے لیکن وہ ناکافی ہے پتا نہیں ابھی کتنا وقت اور لگے گا عورت کو اپنا مقام حاصل کرنے میں وہ لکھتی ہیں:

> ’’تانیثیت کے تعلق سے سنجیدہ مباحث کا دروازہ اب بھی بند پڑا ہے جس زبان نے فیمینیزم کے معنی بتانے میں اتنے سال لگا دیئے، جس کی لغت میں اب تک تانیثیت کا لفظ ہی شامل ہی نہیں ہوا ہو یا ’نسائیت‘ کا لفظ ایک تحریک کے طور پر سمجھا ہی نہ گیا ہو، وہاں عورتوں کی ادبی، لسانی، سماجی اور قانونی حیثیت کا تعین اب بھی نامکمل ہے‘‘59

اس کا دوسرا مضمون ’’اردو میں نسائی نظموں کے موضوعات‘‘ کے عنوان سے ہے۔اس مضمون میں وہ نسائی نظموں کی تاریخ سرسید کی تحریک سے جوڑتی ہیں وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ گو سرسید نے عورتوں کی تعلیم کے لیے کوئی خاص پہل نہیں کی تھی لیکن عورتوں پر اپنی تحریک کے اثرات کو نہ روک سکے۔اس کے بعد وہ جنگ آزادی کے دور میں عورتوں نے جوشیلی نظمیں کہیں اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔شروعات میں عورتوں نے قلمی نام کا سہارا لیا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اپنے اصل نام سے لکھنا شروع کیا اور اس دور کے رسائل اور اخبارات نے ان کی بھر پور ہمت افزائی کی۔

تقسیم ہند کے بعد سرحد پار بہت سی شاعرات ابھریں جن کے وہ نام گنواتی ہیں ان میں فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، کا خاص طور سے ذکر کرتی ہیں اور ہندستان میں ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، شائستہ یوسف، شفیق فاطمہ شعریٰ کا خاص طور سے ذکر کرتی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ان خواتین شاعرات کے موضوعات ہی ان

کی مقبولیت کا اصل سبب ہیں۔

اس کے بعد وہ نسائیت کی طرف بڑھتی ہیں اور پروین شاکر، کشور ناہید، عذرا پروین، شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ثمینہ راج، ناہید قمر، بشریٰ اعجاز ان تمام کے کلام کی مثالیں دے کر ان کے محاسن پر روشنی ڈالتی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتی ہیں کہ اردو شاعرات اب صرف اپنی ذات کے نہاں خانوں میں گم نہیں ہیں اور نا ہی ان کا تجربہ اب محدود رہا ہے۔انھوں نے دنیا دیکھ لی ہے کئی بار ٹھوکریں کھائیں، سنبھلیں بھی اور اس طرح ادب میں اپنی شناخت بنائی۔آج نہ صرف عورت کے موضوعات الگ ہیں بلکہ ان کا اپنا منفرد اسلوب بھی ہے لیکن ابھی بھی اسے وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا ہے جس کی وہ حق دار ہیں۔

تیسرا مضمون ''مرد ادیبوں کے فکشن میں عورت کا تصور اور کردار'' کے عنوان سے ہے۔اس مضمون کی شروعات وہ مختلف ادوار میں شاعری ہو یا فکشن دونوں میں عورت کے بدلتے ہوئے تصور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ اب تک کوئی بھی دور رہا ہے عورت کی حیثیت ہمیشہ سے ہی مردوں کے مقابلے میں کم ہی رہی ہے اس سلسلے میں وہ ان مغربی عورتوں کے نام گنواتی ہیں جنھوں نے عورتوں کے حالات سدھارنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا لیکن مکمل طور پر برابری کی دعویدار نہیں تھیں اس کے لیے وہ مسز مارٹن کی مثال دیتی ہیں۔اس کے برعکس وہ لٹین، جین آسٹن، اسکاٹ کچھ ایسے قلم کاروں کے بارے میں بتاتی ہیں جو عورتوں کے ضمن میں آزاد خیال ضرور تھے پر قائم شدہ رائے سے انحراف کرنے سے ڈرتے تھے۔وہ کئی انگریزی ناولوں کی مثال دیتی ہیں جن کی ہیروئنیں سگھڑ گھریلو عورتوں کا کردار پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ان ناولوں میں اگر کوئی جوان لڑکی جو اپنے والدین کا حکم ماننے کے بجائے اپنی خوشی کے لیے جیتی تھی تو ایسے کردار انگریزی ناولوں میں کسی خاطر خواہ انجام تک نہیں پہنچتے تھے بلکہ یہ سبق دیا جاتا تھا کہ ایسی عورتیں مرد اور عورت کے خوبصورت رشتے کو برباد کرنا چاہتی ہیں۔

اس طرح شہناز نبی اس مضمون میں فکشن میں عورت کے تصور اور کردار کے بارے میں بتانے کے لیے پہلے مغربی ادب کے مختلف ادوار میں فکشن عورت کے لیے کیا تصورات تھے مختلف ادیبوں کے ناولوں کی مثالیں دے کر واضح کرتی ہیں کہ اس کے بعد وہ اردو کی طرف آتی ہیں اس کی شاید ایک وجہ یہ ہوگی کہ اردو فکشن ہر دور میں مغربی فکشن کے زیر اثر تخلیق ہوتا رہا ہے۔

ہندستان میں عورت کے تصور اور مقام کو بتانے کے لیے وہ ویدک دور سے شروع ہوتی ہیں اور تفصیل سے

اپنا جائزہ پیش کرتی ہیں ادب کے تعلق سے وہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے اثر سے لکھے گئے اصلاحی ناولوں کا ذکر کرتی ہیں جن میں نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' کی اصغری اور اکبری دو کردار کا ذکر کرتی ہیں جس میں سے ایک مہذب ہے اور دوسری بدتمیز ہے۔ یہ کردار خیر وشر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ رسوا کے کردار معاشرتی زندگی کے ترجمان ہیں۔ پریم چند کے کردار سماجی طبقات کے مطابق ہیں۔ ان کے یہاں ہمت وحوصلے والی، رسوم رواج سے لڑنے والی ایک باغی عورت کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ناولوں یا فکشن میں عورت کے تصورات سب سے زیادہ قوی نظر آتے ہیں۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ وغیرہ قابل ذکر فکشن نگار ہیں۔ اس دور میں عورت کے تصور کو لے کر بڑی بحثیں ملتی ہیں۔ مارکس، فرائڈ، لینن کے نظریات اس میں ایک طرح کا تال میل چاہتے تھے۔ اس دور کے کرشن چندر کے کردار طبقاتی محبت میں ناکام ہوتے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں جنسی استحصال کا شکار ہیں۔ منٹو نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا ہے۔ منٹو کی عورت کہیں کہیں باغی نظر آتی ہیں لیکن کامیاب نہیں۔ بات اگر بیدی کی جائے تو شہناز نبی کے خیال سے ان کے یہاں عورتیں سیتا دروپدی اور ساوتری ہیں۔

ترقی پسند کے بعد جدیدیت کے تجریدی افسانوں اور ناولوں کا وہ ذکر کرتی ہیں۔ اس دور کے لکھنے والوں میں بلراج مین را، سریندر پرکاش، بلراج کومل، انور سجاد، کمار پاشی وغیرہ ہیں۔ شہناز نبی کے مطابق اس دور کے کردار مرکزی کردار پر حاوی نہیں ہوتے بلکہ کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ اس دور میں عورت کا تصور کچھ خاص نہیں رہا ہے۔ اس کے بعد مابعد جدیدیت کی وہ بات کرتی ہیں کہ آج کے کردار توڑ پھوڑ کے عمل سے گذر رہے ہیں۔ آج عورت اپنی شناخت بنا چکی ہے لیکن اب بھی فکشن میں اس کا تصور اس انداز میں کھل کر سامنے نہیں لایا جا رہا ہے اس کی وجہ شاید پدری سماج ہے جو عورتوں کے بدلتے ہوئے روپ کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس پورے مضمون میں شہناز نبی نے عورتوں کی مختلف صورتحال کو مختلف ادوار میں فکشن میں پیش کیے جانے کا ذکر بڑے مفصل اور جامع انداز میں کرتی ہیں۔ اگر چہ مرد کے فکشن میں عورتوں کے تصور اور کردار مختلف ادوار کا سفر کرتے ہوئے مختلف صورتیں بدلیں لیکن پھر بھی ابھی بھی وہ تشفی بخش نہیں ہے۔ شہناز نبی لکھتی ہیں کہ:۔

''نذیر احمد کی اصغری سے صلاح الدین پرویز کی نمرتا تک بہت کچھ بدل گیا ہے

بقول بلراج مین را'' شاعری اور فکشن کی حد بندیاں ٹوٹی ہیں''۔ان تبدیلیوں کے درمیان عورت کا کردار بھی ایک نئی defination چاہتا ہے۔''60؎

واقعی ان کی یہ تجویز غور وطلب ہے۔زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک ادب میں عورت کے تصورات اور کردار نے ہر عہد میں ہر موڑ پر اپنے روپ بدلے لیکن آج بھی اسے مقام نہیں مل پایا جس کی وہ حقدار ہیں۔کبھی اسے سگھڑ اور باوفا عورت کے روپ دیکھا گیا تو کبھی صرف من بہلاوے کا سامان،کبھی ناولوں کی دلچسپی بڑھانے کے لیے اسے سجا کر پیش کیا گیا تو کبھی اس کی روتی بسورتی صورتیں دکھا کر ہمدردیاں حاصل کرنے کا ذریعہ لیکن صحیح معنوں میں نہ پہلے اور نہ آج انھیں سمجھا گیا اور نہ ہی اس کے جذبات واحساسات کی حقیقی ترجمانی کی گئی اس ضمن میں موصوفہ کی یہ تجویز قابلِ غور ہے۔

اس کتاب کا چوتھا مضمون ''اردو نظم کے فروغ میں خواتین کا حصہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے ابتدا ہی میں شہناز نبی سوال قائم کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''اردو کی ادبی تاریخوں میں عورتوں کو معمار کی حیثیت سے کبھی شامل نہیں کیا گیا ۔اب تو اردو کی ادبی تاریخوں میں اکا دکا کسی خاتون کا نام نظر بھی آجاتا ہے تاہم اس نکتے پر غور کرنے کی ضرورت ایک عرصے تک محسوس ہی نہیں کی گئی کی آیا اردو شعروادب کے فروغ میں عورتوں کا کوئی حصہ ہے بھی یا نہیں؟۔''61؎

آگے وہ ترقی پسند تحریک کا اولاً ذکر کرتی ہیں کیونکہ اسی کے زیر اثر عورتوں نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ اتنا معیاری نہیں تھا جتنا کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی کی خواتین قلم کاروں کا تھا۔اس وقت کی شاعری اصلاحی ہوا کرتی تھی۔ برابری کا تصور اس وقت مضحکہ خیز بات تھی۔گرچہ شاعری کے موضوعات عورت سے جڑا ہوتا تھا۔اس کے حسن کی تعریف کی جاتی تھی لیکن اگر یہی بات اگر کوئی عورت بیان کر دیتی تو اسے بے حیائی اور بے باکی سے تعبیر کیا جاتا تھا اور یہ صرف اردو ادب تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ مغربی ادب میں بھی خواتین قلم کاروں کو اس کی اجازت نہیں تھی ۔اس کا اثر یہ ہوا کہ خواتین قلم کاروں نے اپنی تخلیق کے لیے قلمی ناموں کا سہارا لینا شروع کیا اس سلسلے میں وہ ز۔خ۔ش (زاہدہ خان شیروانیہ) کی مثال دیتی ہیں۔

اس کے بعد وہ تقسیم ہند اور اس کے زیر اثر لکھنے والی شاعری کی طرف رخ کرتی ہیں۔اس کا اثر اردو

شاعری پر کس طرح ہوا اور اردو شاعرات نے کس طرح اپنے موضوعات میں تبدیلی لائی اس کے ذکر میں وہ لکھتی ہیں:۔

> ''عورتوں کی شاعری میں تقسیم کا دکھ،ہجرت کا کرب ،اپنوں سے بچھڑنے کا صدمہ،نئی تنہائیوں کی غیر مانوسیت کے ساتھ ساتھ مرد اساس معاشرے میں اپنی بے قدری ،بحیثیت فرد خود کو منوانے کی ضد ،رشتوں کی مختلف سطح پر جینے کا تصور۔۔۔غرض کہ سوچ وفکر کے اتنے زاویے نظر آئے کہ بحیثیت تخلیق کاران کی پہچان بننے لگی۔'' 62

اس عہد میں خواتین قلم کاروں نے اپنی فکر کو وسعت دی اب وہ خوابوں کی دنیا سے باہر نکل کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا۔معاشی آزادی نے اسے مردوں کے برابر لا کھڑا کر دیا اور یہیں سے وہ اپنے تشخص کے لیے بے چین ہو اٹھیں ۔گھریلو ذمے داریاں اور تلاش معاش کی صعوبتیں نے اسے گھر اور باہر کی دنیا سے متعارف کروایا ایسے میں ان کا لہجہ خود اپنی ذات کے متعلق سوالیہ ہونے لگا۔اس دور میں جتنی بھی شاعرات نے اپنی تخلیقات پیش کیں ان کے دیباچوں میں عورت کو خود کو منوانے کی تڑپ صاف طور پر دیکھنے کو ملتی ہے مثلاً فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کے یہاں یہ چیزیں دیکھنے کو مل سکتی ہیں شہناز نبی نے اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

وقت نے کروٹ بدلی اور تعلیم کے پھیلاؤ نے عورتوں کو اثر انداز کیا۔انھوں نے نہ صرف اپنی تخلیقات میں عشق ومحبت کی باتیں کیں بلکہ بے وفائی کے قصے بھی کہنا شروع کر دیئے۔طرح طرح سے جنس مخالف ہی نہیں بلہ پوری دنیا کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئیں۔اس دور کی تخلیقات میں ہمیں ان کے لہجے کی انفرادیت خاص طور سے دیکھنے کو ملتی ہے۔لسانی سطح پر بھی خاص فرق دکھائی دیتا ہے۔اب یہ مردوں کے بنائی ہوئی شاہراہ پر چلنے کو تیار نہیں ۔آج کی قلم کاروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بدن کے ساتھ ساتھ ذہن بھی رکھتی ہیں۔اس سلسلے میں شہناز نبی کشور ناہید، پروین شاکر،فہمیدی ریاض،شفیق فاطمہ شعریٰ،ساجدہ زیدی،ترنم ریاض،ملکہ نسیم،عذرا پروین،شبنم عشائی کے ساتھ خود اپنے نام بھی گنوائے ہیں۔جنھوں نے ہندستان اور پاکستان میں نظم کی روایت کو مضبوط کرنے کا کام کیا ہے ۔ان کے علاوہ شائستہ حبیب،ثمینہ راجہ،شاہدہ حسن،ثروت زہرا،اسماء راجہ،نوشی گیلانی،صبیحہ صبا،عذرا عباس وغیرہ کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ان خواتین شاعرات نے شاعری میں وہ نئے نئے تجربے کیے ہیں جو مرد

حضرات نے بھی نہیں کیے ہیں۔اگر دیکھا جائے تو شہناز نبی اپنے اس دعوے میں کافی حد تک صحیح نظر آتی ہیں۔

اگلا مضمون ''خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقی حسیت'' کے عنوان سے ہے۔ابتدا میں شہناز نبی خواتین افسانہ نگاروں کا پس منظر بیان کرتی ہیں اوراس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ شروعات میں عورتیں مردوں سے متاثر ہوکرلکھنا شروع کیا تھا لیکن ترقی پسند تحریک سے قبل رشید جہاں کے افسانوں نے اپنی بے باکی اورصاف گوئی سے دھوم مچادی۔اس کے بعد رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، عصمت چغتائی، وغیرہ خواتین قلم کاروں نے نے ایسے افسانے لکھے جوحقیقت پر مبنی ہوتے تھے اور نہ صرف موضوعات بلکہ نئے لب و لہجے اور کردار کی وجہ سے انفرادیت رکھتے تھے۔

اس کے بعد تقسیم ہند کے اثرات سے متاثر ہوکر لکھنے والی قلم کاروں میں وہ قرۃ العین حیدر کے فن کا جائزہ لیتی ہیں اوران کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ان کے بعد آنے والی نسلوں میں جیلانی بانو، واجدہ تبسم ، آمنہ ابوالحسن، صغریٰ مہدی وغیرہ کو تانیثی ادب کے فروغ کی اہم کڑی بتاتی ہیں۔

اس مضمون میں انھوں نے موجودہ خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات، ان کی کردارسازی کومثال دے کراپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔اس سلسلے میں وہ خدیجہ مستور کا افسانہ 'خرمن'، خالدہ حسین کا 'پردہ'، ذکیہ مشہدی کا 'آدم خور'، وغیرہ کی مثال دے کرواضح کرتی ہیں کہ موجودہ خواتین افسانہ نگاروں نے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو زمانے کے ظلم کا شکارتو ہیں لیکن وہ نہ ٹوٹتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ایسے کرداروں سے نہ صرف ان کی نفسیات کا پتا چلتا ہے بلکہ ان کی ذہنی پیچیدگیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔

موجودہ خواتین افسانہ نگاروں کی ایک خرابی جس کووہ گرفت میں لیتی ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں انگریزی زبان کے الفاظ کا کثرت سے استعمال ہے۔اس سلسلے میں وہ کئی افسانوں کومثال کے طور پر پیش کرتی ہیں جن میں سے ترنم ریاض کا ایک افسانہ ''میرا کے شام'' بھی ہے جس میں انگریزی زبانوں کا کثرتِ استعمال نے اردو زبان کی شکلیں بگاڑ دی ہے۔ان کا یہ اعتراض قابل غور ہے اور یہ ان کی حقیقت پسندی ہے کہ تانیثی تنقید کرتے وقت وہ نہ صرف عورتوں کی اچھے پہلوؤں پر بات کرتی ہیں بلکہ ان کی کمزوریوں کوبھی گرفت میں لیتی ہیں اوریہی ایک معیاری تنقید کی پہچان ہے۔

ان کا ماننا ہے کہ آج خواتین افسانہ نگاروں کا ادب اپنے لسانی، جذباتی، جنسی، ذہنی رویے کے اعتبار سے

الگ پہچان رکھتا ہے۔ آج ان کے ادب کی ایک الگ تاریخ ہے وہ لکھتی ہیں:۔

''آج خواتین کے اسالیب، ان کے موضوعات، ان کی نفسیاتی کش مکش، ان کے گھر اور باہر کے تجربوں، ان کے جذبات واحساسات کو نئے سرے سے جانچنے اور اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خواتین کی ذہنی روش کو مدنظر رکھ کر تانیثی ادب کی تاریخ تحریر ہونی چاہیئے۔''63

''اردو شاعرات کی نظموں میں لسان کا عمل'' کے عنوان سے اگلا مضمون ہے۔ یہ مضمون اپنے منفرد عنوان کی وجہ سے ہماری توجہ اپنی طرف مرکوز کرتا ہے۔ مضمون کے آغاز میں ہی وہ اس بات پر اعتراض کرتی ہیں کہ اردو کے قدیم تذکرے شاعرات کے ذکر سے خالی ہیں ہاں البتہ انیسویں صدی میں چند شاعرات تذکروں میں جگہ پاتی تو ہیں لیکن ان کی ادبی کاوشیں زیادہ نہیں ہیں۔ نظم گو شاعرات زیادہ تر بیسویں صدی میں ابھر کر سامنے آئیں ہیں جن میں ز۔خ۔ش، خدیجہ بیگم، منجھو بیگم، برکت رائے وغیرہ کا وہ ذکر کرتی ہیں۔ آگے کی شاعرات میں ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، وغیرہ ہیں جنھوں نے نسائی شاعری کو فروغ دیا۔

جہاں تک لسان کا سوال ہے تو اس کے جواب کی تلاش وہ ترقی پسند سے کرتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس وقت اصلاحی موضوعات پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور ایسے میں لسانی تجربات ایک مشکل عمل ثابت ہوا۔ اس دور کی شاعرات نے اقبال کی طرز پر شاعری کرنے کی کوشش کیں جس کی وہ مثالیں بھی پیش کرتی ہیں۔ ان کے مطابق ترقی پسندی تک زیادہ تر عورتوں نے مردوں کے طے شدہ معیارات ہی سے روشنی حاصل کی۔

اردو شاعری میں نسوانی شاعری کی پہلی توانا آواز ادا جعفری کی ملتی ہے۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری کو شہناز نبی ایک طرح کی خود کلامی مانتی ہیں اور دلیل کے طور پر ان کے ایک دیباچے کا حوالہ دیتی ہیں۔ اب نمبر آتا ہے کشور ناہید کا جن کے یہاں آزادی کی شدید خواہش کا اظہار ملتا ہے لیکن ان کے یہاں لفظیات کا ایسا ماحول بھی ملتا ہے جس میں ایک دبی کچلی ہوئی عورت کھل کر سانس لینے کے لیے تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پروین شاکر کے ذکر کے وقت شہناز نبی ان پر اعتراض کرتی ہیں کہ ان کے مجموعوں میں اکثر نظمیں طویل ہیں تو کہیں مختصر اور مختصر بھی اتنی کہ کہیں کہیں تین مصرعوں پر ہی نپٹ جاتی ہیں۔ ان کا یہ اعتراض اگرچہ اپنی جگہ درست ہو کر بھی پروین شاکر کی شاعری پر گہن نہیں لگا سکا جس کا اظہار مجھے خود ان ہی کی زبانی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:۔

''پروین نے حسیات کی مدد سے ایسی دنیا بنائی ہے جہاں سنگ ہے، لطافت ہے، خوشبو ہے، جھنکار ہے، وصل کے پر کیف لمحات بھی ہیں، ہجر کے جاں گسل لمحے بھی ۔ پروین نے خوشبو کے ساتھ سفر کیا ہے، رنگوں کے بیچ گذر کی ہے ۔ ایک ایک مختصر سی نظم کا بھی ہر مصرعہ کسی نہ کسی رنگ کو پیش کرتا ہے۔'' 64

شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی، کی نظمیں موضوعات کے اعتبار سے اچھوتی ہیں ۔ ان کے یہاں عربی، فارسی، ہندی کی تراکیب کا امتزاج ملتا ہے ۔ موجودہ نظم گو شاعرات میں وہ (سارہ شگفتہ) زاہدہ زیدی، شائستہ یوسف، شائستہ حبیب، شاہدہ حسن وغیرہ کو قابل ذکر سمجھتی ہیں کی انھوں نے تجربات کے تنوع ،فکر کی تہداری، اور اظہار کی جدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ادبی حیثیت بنالی ہیں ۔

مضامین کے سلسلے کی اگلی کڑی ''اکبرالہ آبادی اور تعلیم نسواں'' کے عنوان سے آگے بڑھتی ہے ۔ اکبرالہ آبادی اور تعلیم نسواں دونوں متضاد پہلو ہیں کیونکہ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اکبرالہ آبادی عورتوں کی تعلیم کے حامی نہیں تھے اور اس کا اظہار انھوں نے جابہ جا اپنے کلام میں بھی کیا ہے ۔

اس مضمون میں شہناز نبی نے اکبرالہ آبادی کا تعارف کراتے ہوئے ان کے عہد کا پس منظر بھی پیش کرتی کہ کس طرح ایک طرف انگریز حکومت کا بڑھتا ہوا اقتدار تھا اور دوسری طرف ہندستانیوں کے دلوں میں اپنی کھوئی ہوئی زمین کو حاصل کرنے کا جذبہ تھا ۔ ایسے حالات کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا اور ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے انگریز اور ان کی پالیسیوں کے خلاف لکھ رہے تھے وہیں سرسید ایک ایسے ادیب تھے جنھیں انگریزوں سے خاص لگاؤ تھا ۔ وہ انگریزی تعلیم وتربیت کے ہمنوا بن کر ابھرے اس طرح دو گروپ بن گئے ایک انگریز کا ہمنوا اور دوسرا مخالف ۔ ایک طرف سرسید تو دوسری طرف اکبرالہ آبادی ۔

اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے انگریز حکومت اور ان کی طرز اسٹائل اپنانے والوں پر کھل کر طنز کیا ہے ۔ اکثر محققین کا خیال ہے ان کی یہ شدید مخالفت سرسید کی وجہ سے تھی ۔ وجہ کوئی بھی ہو اکبر کو ہر طرح سے انگریزی زبان، انگریزی تعلیم سے بیر تھا ۔ یوں تو سرسید بھی عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے وہ تو سید محمود نے خواتین کے لیے اسکول کھولے اور ان کا نصاب تیار کیا اور اس طرح سے عورتیں تعلیم یافتہ ہونے لگیں ۔ اور یہ بات اکبر کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئی جس کا اظہار کرتے ہوئے شہناز نبی لکھتی ہیں :۔

''اکبر نے اپنی شاعری میں جا بہ جا عورتوں کی تعلیم پر چھینٹے کسے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم عورتوں کو بے شرم بنا دیگی۔وہ گھر کی چہار دیواری میں قید رہنے کے بجائے آزادانہ گھومے گی۔اکبر صحیح معنوں میں male chauvinist ہیں۔عورت کو محکوم،مجبور، بے بس اور مرد کا غلام دیکھنا پسند کرتا ہے۔''65

اپنے خیال کی تائید کے لیے موصوفہ نے اکبر کے کلام سے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اکبر ایک ناصح اور واعظ کی طرح آخرت کا سہارا لے کر لوگوں کو اپنی طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ان کے نزدیک تعلیم حاصل کرنا بے حیائی کی علامت ہے۔شہناز نبی اس بات کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ ایسا نہیں تھا کہ اکبر عورتوں کی تعلیم کے پوری طرح سے مخالف تھے نہیں ان کے نزدیک عورتوں کو اتنی ہی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے کہ ان سے مذہب سے واقفیت، حفظان صحت کے اصول، حساب کتا، بچوں کی تربیت، امور خانہ داری، اور شوہر کی رفاقت میں معاون ثابت ہوں۔اس لیے شہناز نبی ان کی مماثلت روسو سے کرتی ہیں۔زمانۂ قدیم میں جو خیالات روسو عورت کے متعلق رکھتا تھا وہی خیالات اکبر کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔آگے وہ ثابت کرتی ہیں کہ اکبر کے یہاں دو طرح کی خواتین کا ذکر ملتا ہے ایک مغربی اور ایک مشرقی۔ان کے نزدیک مشرقی عورتیں قابل احترام تو ہیں لیکن مغربی عورتوں کے ذکر میں تو انھوں نے ساری حدیں پار کردی ہیں۔ان کے رہن سہن کا ذکر کرتے ہوئے نہایت ہی نازیبا انداز اپنایا ہے گویا اس طرح وہ اپنا بدلہ انگریزوں سے لینا چاہتے تھے۔کچھ محققین کا خیال ہے کہ اکبر نے یہ طنزیہ انداز شہرت پانے کے لیے اپنایا تھا جس پر شہناز نبی اظہار خیال کرتی ہیں:۔

''اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اکبر نے اودھ پنچ کے ذریعے مقبول ہونے کے لیے طنز مزاح کا سہارا لیا تھا۔سرسید کی مخالفت کی اور مغربی تہذیب جس کے وہ بظاہر اتنے مخالف معلوم ہوتے ہیں، کا اس لیے مذاق اڑایا کہ وہ طنزیہ مضامین لکھ کر جلدی شہرت حاصل کر لینا چاہتے تھے بھلے ہی اس کا خمیازہ ان معصوموں کو بھگتنا پڑے جنھوں نے اگر ملک وقوم کو آگے لے جانے میں کوئی نمایاں رول ادا نہیں کیا تو اسے پیچھے بھی گھسیٹنے کا جرم بھی ان پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔''66

اگر ہم بلا واسطہ اس مضمون پر تنقید کریں تو یہ بات ثابت ہوگی کہ واقعی اکبر کے ذریعے عورتوں کی حق تلفی

ہوئی ہے اور ایک عرصے تک عورتوں کی تعلیم سے دوری کی وجہ اکبر کی شاعری رہی ہے چاہے اس کے پس پردہ جو بھی رہا ہو لیکن کفارہ تو بے چاری صنف نازک کو ہی بھرنا پڑا۔

اس کتاب کا ایک اور مضمون ''سجاد ظہیر کا اشتراکی نظریہ اور خواتین قلم کار'' کے عنوان سے ہے۔ ابتدا میں شہناز نبی سجاد ظہیر کے افکار وخیالات، ان کے نزدیک ادب کا مقصد، ان کے نظریات اور ادب کے فروغ کے لیے ان کے اقدامات وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کئی مقالے اور کتابیں بھی آ چکی ہیں لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں خواتین قلم کاروں کا ذکر بہت کم ملتا ہے عصمت اور رشید جہاں کو چھوڑ کر۔ شہناز نبی کا ماننا ہے کہ ان کے علاوہ بھی بہت سی خواتین قلم کار تھیں جو اس وقت بھی اپنی پہچان رکھتی تھیں لیکن ان کا ذکر نہیں ملتا مثال کے طور پر جیسے نذر سجاد حیدر، ز۔خ۔ش، خدیجہ بیگم وغیرہ ان سب کا ذکر ملتا تو ہے لیکن مختصراً رشید جہاں کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں:۔

> ''رشید جہاں افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ایک تنقید نگار بھی تھیں لیکن ان کے تنقیدی کارناموں کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ رضیہ سجاد ظہیر کے کارنامے بھی پس وپشت پڑے رہے۔ ادا جعفری کو بھی ترقی پسند کی تاریخ کا حصہ سمجھنے سے گریز کیا گیا۔''67

وہ اس بات پر بحث چھیڑتی ہیں کہ ترقی پسند ادب کے لیے جو خصوصیات خلیل الرحمٰن اعظمی نے بتایا ہے ان کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو خواتین قلم کار کے قلم بھی اس پر کھرے اترتے ہیں صرف اسی وقت نہیں بلکہ آج بھی اتر رہے ہیں اس سلسلے میں وہ کئی خواتین قلم کار کے نام گنواتی ہیں۔ شاعرات کے تعلق سے لکھتی ہیں کہ جن شاعرات کا ذکر ترقی پسند کے حوالے سے ہونا چاہیئے ان سے بھی گریز کیا جاتا ہے آخر یہ رویہ کیوں اپنایا جارہا ہے۔ اس مضمون کا آخری پیراگراف خاص توجہ چاہتا ہے وہ لکھتی ہیں:۔

> ''تاریخ گواہ ہے کہ خواتین قلم کاروں نے بھی اپنے فرائض بساط بھر انجام دیئے ہیں ضرورت ہے تو بس اس کے صحیح تخمینے کی اور اردو میں ترقی پسند ادب کی نئی تاریخ لکھنے کی۔''68

اگر ہم منصفانہ انداز سے دیکھے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ حقیقت میں اب تک خواتین قلم کاروں کو سماج کے

ساتھ ساتھ معاشرے اور ادب میں دورخی رویے کا شکار ہونا پڑا ہے۔موجودہ عہد میں تو کسی قدر خواتین قلم کاروں کے مقام کا تعین تو کسی قدر ٹھیک ہے پر ہماری بڑوں کے ساتھ ناانصافی ضرور ہوئی ہے۔اس سلسلے سے شہناز نبی کا یہ مضمون اہمیت کا حامل ہے۔

اس کتاب کا اگلا اور آخری مضمون ''فراق کا تصورعشق'' کے عنوان سے ہے۔فراقؔ گورکھپوری اردوشاعری کا ایک بڑا نام ہے۔انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعے سے اردوادب کے گیسو سنوارے ہیں بلکہ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جس میں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کے مضامین کے ذریعے سے ان کی شخصیت کے کئی پوشیدہ راز بھی عیاں ہوتے ہیں۔شہناز نبی نے اپنے مضمون کی ابتدا فراقؔ کے مضامین کے ذکر ہی سے کرتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ان میں سے کچھ مضامین ایسے ہیں جس میں فراقؔ نے خود کو عام انسان سے منفرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کی تصدیق کے لیے وہ فراقؔ کے مضمون ''میری زندگی'' کا حوالہ دیتی ہیں جس میں فراقؔ نے خود کو حسن پرست بتایا ہے۔

فراقؔ بچپن سے بہت حسن پرست تھے لیکن بدقسمتی سے ان کی شادی ایک بدصورت لڑکی سے کر دی جاتی ہے جس کی وجہ سے فراقؔ زندگی بھر اس کو کوستے رہتے ہیں اور اس سانحے کو بھلانے کے لیے ہی وہ شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن ان کی شاعری ان کے غم کی ترجمانی کرنے کے بجائے شادمانی عطا کرتی ہے۔شہناز نبی فراقؔ کے تصورعشق کے بیان میں خود فراقؔ کے کئی نظریات پیش کرتی ہیں اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچتی ہیں:۔

> ''عشق کے متعلق ان کا نظریہ روایتی ہے یعنی دوسروں کی طرح وہ یہ مانتے ہیں کہ عشق رنج ومحن کا ذریعہ ہے لیکن انھیں اس سے بچنے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔وہ عشق کے آگے خود کو بے سمت وپا محسوس کرتے ہیں۔'' 69

فراقؔ کے اس نظریے کی تصحیح کے لیے وہ ان کی شاعری سے کئی مثالیں ڈھونڈ کر لاتی ہیں اور جہاں تک فراقؔ کے عاشق کا سوال ہے تو اس کے جواب میں بھی وہ آگے لکھتی ہیں:۔

> ''دراصل فراقؔ اردو کی عشقیہ شاعری میں محبوب کو جیون ساتھی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔اگر اردو غزل کی بات کریں تو یہاں محبوب پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔وہ حقیقی ہے یا مجازی، اس کا سوال بعد میں اٹھتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو اس پر

غور کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔فراقؔ محبوب کو ہندستانی رنگ وروپ
بھی عطا کرنا چاہتے ہیں اسے گھر آنگن سے جوڑ کر رکھنا چاہتے ہیں۔''70؎

اس کے ساتھ ہی وہ آگے عشق کے تصور کے بدل جانے کی بات کرتی ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ عشق کا تصور بھی بدلتا ہے۔ پہلے جس بات کو سماج میں برا سمجھا جاتا تھا اب اس کا اثر کم ہوگیا ہے بات چاہے ایک مرد کا مرد کے ساتھ رشتے کی ہو یا ایک عورت کا ایک عورت کے ساتھ رشتے کی پہلے ان سب باتوں کو بہت برا سمجھا جاتا تھا لیکن آج لوگ اسے تسلیم کرنے میں ہچکچاتے نہیں ہے لیکن فراقؔ کے یہاں عشق کا تصور شروع سے لے کر آخر تک روایتی رہا ہے۔وہ اخیر تک محبوب کو گھر، ہندستان سے جوڑے رکھنے کی بات کرتے رہے اس پر شہناز نبی اعتراض کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''ضروری نہیں ہے کہ محبوب کی شہریت پر اصرار کیا جائے۔وہ ایرانی بھی ہوسکتا ہے اور ہندستانی بھی۔ارضی بھی ہوسکتا ہے سماوی بھی۔اس کے پاس اگر جسم ہے تو یقیناً وہ بے روح نہ ہوگا اور اگر جسم ہے تو اس کے تقاضے بھی ہونگے۔ذہن ہے تو سوچ بھی ہوگی۔محبوب کو جیون ساتھی اور جیون ساتھی کو محبوب کے روپ میں دیکھنے کی ممانعت جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، استادفن نے نہیں کی ہے۔''71؎

اتنا ہی نہیں وہ محبت، شادی اور انسانی رشتے کے بدلتے ہوئے تصورات کا بھی ذکر کرتی ہیں کہ آج وقت نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔ بدلا تو فراقؔ کے وقت میں بھی بہت کچھ تھا لیکن پرانی روایت کی پاسداری نے فراقؔ کو محبوب کے تصور میں آگے سوچنے کے لیے روکے رکھا۔انھوں نے عورت کو کبھی دیوی کا روپ دیا کبھی ماں کبھی بیٹی لیکن بحثیت فرد اسے قبول کرنے میں انھوں نے تامل برتا جس پر شہناز نبی اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں:

''فراقؔ کی عشقیہ شاعری ایک دوسری طرح کی گھٹن کو جنم دیتی ہے جو عورت کو صرف عورت سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے، جہاں وہ حیات وکائنات سے بندھی تو ہے لیکن اس کا اپنی ذات سے کوئی رشتہ باقی نہیں ہے۔''72؎

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی کی یہ کتاب اپنے مضامین کے نوعیت کے بنا پر تانیثی تنقید کے حوالے

سے ایک اہم کتاب ہے۔اس کتاب کے ذریعے سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ کہاں کہاں اور کس کس کے ذریعے خواتین کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔وہ ناانصافی چاہے فراؔق سے ہوئی ہو یا اکبؔر سے یا اردو کے تذکرہ نگاروں یا پھر ترقی پسند ادب کے تاریخ نویسوں سے شہناز نبی کی نظر سے کوئی بھی چھپ نہیں سکا ہے۔انھوں نے نہ صرف اس کے لیے آواز اٹھائی بلکہ یہ تجویز پیش کی کہ ادب کی تاریخ کو دوبارہ سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے اس کے لیے انھوں نے ایسی ایسی دلیلیں پیش کی ہیں جسے رد کرنا مشکل ہے۔اس طرح اس کتاب کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو ہمارے لیے فکر کے دروازے نہ کھولے ہوں۔اس لیے اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ واقعی ان کی یہ کتاب تانیثی تنقید کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

فیمنزم، تاریخ وتنقید (2012)

''فیمنزم تاریخ وتنقید'' 2012 میں رہروان ادب پبلی کیشن ، 28اے رپن لین کولکاتا 700016۔ کے ذریعے شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔

فیمنزم یا تانیثیت ایک ایسی اصطلاح ہے آج کل موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے۔اس طرح ایسے موضوع پر قلم اٹھانا اور اسے کتابی شکل دینا ہمت کی بات ہے اور اس کی جرات شہناز نبی صاحبہ نے کی ہے اور ایک 432 صفحات کی کتاب منظر عام پر لے آئیں۔یہ اردو ادب میں خاص طور سے تانیثیت کے حوالے سے ایک اہم اضافہ ہے۔

اس کتاب کو شہناز نبی نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے جو کچھ یوں ہیں:۔

پہلا باب: تانیثیت (faminism) کی تعریف

فیمینسٹ کسے کہتے ہیں

دوسرا باب: تانیثیت کی ابتدا اور ارتقا

تانیثیت بحثیت تحریک

تیسرا باب: مختلف ممالک اور تانیثی تحریک

چوتھا باب: تانیثیت کی تھیوریاں

حریت پسند تانیثیت، مارکسی، انتہا پسند، تحلیل نفسی، سماجی، وجودی، مابعد جدید تانیثیت

پانچواں باب: تانیثی نظریات: اختلاف-اتفاق-اثرات

پیش لفظ کے پہلے ہی اقتباس سے وہ بحث چھیڑتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ:

''تانیثیت کی اصطلاح اب تک اردو میں عام نہیں ہوسکی ہے۔ اردو کے لغات میں اب تک غالباً یہ لفظ شامل نہیں ہوسکا ہے۔''73

اس طرح کتاب کے ابتدائی متن ہی سے وہ اپنی بحث کا آغاز کرتی ہیں اور اردو اور مغربی ادب کا مقابلہ کرتے ہوئے تانیثیت کے معاملے میں اردو کو کہیں پیچھے بتاتی ہیں۔ اس طرح وہ اردو ادب پر سوال اٹھاتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ:

''اردو میں یہ بات اب تک موضوعِ بحث ہے کہ عورتوں کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی آزادی کے لیے جو تحریک چلی یا عورتوں کا جو ادب پیدا ہوا اسے نسائی کہا جائے یا تانیثی۔ سوال یہ بھی ہے کہ تانیثی تحریک صرف عورتوں کی مرہون منت ہے یا مردوں نے بھی عورتوں کی آزادی کے لیے کوششیں کیں۔ کیا عورتوں کا لکھا ہوا ادب ہی تانیثی کہلائے گا یا پھر عورتوں کے زاویہ نگاہ سے لکھا گیا ادب چاہے مردوں نے ہی کیوں نہ لکھا ہو نسائی یا تانیثی کہلائے گا۔''74

اس طرح وہ فیمینزم اور تانیثی ادب کے حوالے سے سوالات قائم کرتی ہیں اس کے آگے وہ اس کی تعریف اور مختلف مما لک میں اس کے ابتدا کے تعلق سے بڑی تفصیلی گفتگو کرتی ہیں۔ فیمینزم یا تانیثیت کی تعریف کے لیے وہ مغربی مفکرین کی تعریفیں پیش کرتی ہیں اور اس کے ابتدا کے سلسلے میں یہ بتانے کی کوشش کرتی ہیں کہ فیمینزم مغرب سے مشرق کی طرف سفر طے کرتی ہوئی پہنچی۔ مختلف مما لک میں اس کی شکلیں بھی مختلف رہیں اور مقاصد بھی لیکن آج فیمینزم کی اس تحریک کو تقویت تو ضرور ملی ہے لیکن اب بھی اس میں کمی نظر آتی ہے۔ اس تحریک کے ذریعے عورتوں کو یکساں حقوق، حقوق رائے دہندگی، خاندان اور گھر کے اندر اس کا مقام سبھی کچھ حاصل ہوا ہے۔

ہندستان میں اس تحریک کا آغاز مغرب کے مناسبت سے کہیں دیر سے ہوا اس کی ایک وجہ ایک عرصے تک عورتوں کی تعلیم سے دوری ہوسکتی ہے۔ جہاں تک عورتوں کے ادب کا سوال ہے تو عورتوں کے تخلیقی سفر کا باقاعدہ آغاز

انیسویں صدی سے مانا جاتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اکثر تذکروں میں اٹھارہویں صدی میں چند شاعرات کا ذکر مل جاتا ہے جیسے ماہ لقا بائی چندا، محمدی بیگم وغیرہ کا خیر وجہ کوئی بھی ہو فیمینزم کی تحریک ہندستان میں دیر سے آئی لیکن اب وہ اپنا مخصوص مقام بنا چکی ہے۔ آج اس تحریک کے زیر اثر کئی شاعرات اور ادیبہ اپنی تخلیقات کو سپردِ قلم کر رہی ہیں اور ادب کے ورثے میں بھی اضافہ کر رہی ہیں۔ یہاں سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ فیمینزم کی تاریخ لکھنے کا آخر شہناز نبی کا مقصد کیا تھا۔ آخر وہ کیا وجوہات تھیں جس کی وجہ سے انھوں نے 432 صفحات کی یہ کتاب لکھ ڈالی اس کا جواب شہناز نبی کے اس اقتباس سے ملتا ہے:

> ''زیرِ نظر تصنیف عورتوں کی آزادی کی تحریک کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس میں عورت کے متعلق قدیم وجدید نظریات، پدری سماج میں عورت کی حیثیت، مغربی ممالک میں عورتوں کے حقوق کے متعلق بیداری، مرد اساس اس معاشرے میں عورت پر ظلم استبداد کی وجہیں اور اس وجھوں کے دریافت کرنے کے سلسلے میں مختلف نظریات یا تھیوریاں۔ دینا کے مختلف ممالک میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کی نوعیت، تاریخ، کامیابیاں اور ناکامیابیاں وغیرہ، عورتوں کی آزادی اور مردوں کے مساوی حقوق کی حمایت، تانیثیت کے مختلف ادوار، عورتوں کی ادبی کاوشیں اور ان کا کاوشوں میں مرد اساس معاشرے کے خلاف احتجاج وغیرہ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔'' 75

ظاہر ہے جہاں اتنے سارے مقاصد یکجا ہو جائیں تو پھر کتاب کا ضخیم ہونا تو طے ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب تانیثیت کی تعریف کے عنوان سے ہے جس میں وہ تانیثیت کی تعریف میں لکھتی ہیں::

> ''تانیثیت انگریزی لفظ فیمینزم (feminism) کی اردو اصطلاح ہے۔ لاطینی زبان میں femina کے معنی عورت کے ہیں۔ فیمینزم (femi-nizuum) اسی لاطینی لفظ سے وجود میں آیا ہے۔ فیمینزم یا تانیثیت کی مختلف دور میں مختلف تعریفیں وضع کی گئی ہیں۔ عام طور سے اس کے معنی میں عورت، عورتوں کا وغیرہ اور ism سے مراد نظریہ، ہے۔ گویا فیمینزم کے معنی

ہوئے تانیثی نظریہ یا تانیثیت۔''76؎

اس کے آگے وہ فیمینزم کی تعریف کے لیے مختلف مغربی ادیبوں،لغات اور ڈکشنریاں کا حوالہ دیتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ فیمینزم سے وہ تحریک مراد ہے جو عورتوں کے حقوق کے لیے چلائی گئی ہو یا پھر وہ نظریہ جو عورت اور مرد کے لیے یکساں معیارات زندگی کا خواہش مند ہوں۔اس کی تعریف پر بحث کرنے کے بعد اب مرحلہ آتا ہے کہ فیمینسٹ کسے کہتے ہیں؟ یا کہیں گے۔کیا صرف عورت قلم کار ہی فیمینسٹ ہوسکتی ہیں یا مرد بھی؟ اس کے لیے وہ مغربی مفکرین،نقاد اور ڈکشنریوں کا حوالہ دے کر ایک تفصیلی بحث کرتی ہیں۔کوئی فیمینزم کو عورتوں کے حقوق کے حمایت کا نام دیتا ہے تو کسی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فیمینسٹ وہ ہیں جو اس روایتی جبر کے خلاف آواز اٹھائی ہو جس کی شکار عورتیں رہی ہوں اور آگے وہ یہ بھی واضح کرتی ہیں کہ عورتوں کے حقوق کی آواز صرف عورتوں نے ہی نہیں اٹھائی بلکہ کچھ مرد حضرات بھی اس میں پیش پیش رہے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فیمینسٹ دونوں ہوسکتے ہیں۔

اس سلسے میں اگر اردو ادب کی بات کی جائے تو مولوی نذیر احمد کو بحیثیت فیمینسٹ تسلیم کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے ناول ''مراۃ العروس''1869 کے ذریعے تعلیم نسواں پر زور دیا ہے۔وہ تعلیم کے ذریعے عورتوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور ایک اچھے معاشرے کے خواہش مند تھے۔ایسے وقت میں جب عورتوں کا لکھنا پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا نذیر احمد کا عورتوں کو تعلیم کے لیے اکسانا بہت بڑا کام تھا۔نذیر احمد ہی کی طرح علامہ راشد الخیری نے بھی عورتوں کو علم وادب میں آگے دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے کئی کوششیں بھی کیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہندستان میں فیمینزم کی تحریک ابھری تو عورتوں کے ساتھ ساتھ مرد حضرات نے بھی اپنی دلچسپی دکھائی اور انیسویں صدی میں ایک حلقہ بن گیا اور بیسویں صدی میں اس موضوع پر کافی کچھ لکھا جانے لگا۔ادیبوں کے ساتھ ساتھ کئی شاعر اور شاعرات نے بھی اس میں حصہ لیا اور کئی شعری تخلیقات پیش کیں۔احمد ندیم قاسمی نے خواتین قلم کاروں کی بہت حوصلہ افزائی کی اور ان کے موضوعات کی تعریف کی اس طرح ہندستان میں عورتوں کے بارے میں اس کی تعلیم وتربیت کے بارے میں مرد حضرات نے غور وفکر کرنا شروع کر دیا تھا اور خواتین کی تخلیقات کو نہ صرف موضوعِ بحث بنایا بلکہ سراہا بھی اس طرح خواتین کے ادب کو اہمیت دی جانے لگی۔

دوسرا باب۔تانیثیت آغاز اور ارتقا کے عنوان سے ہے۔اس باب میں شہناز نبی نے مغربی ممالک میں آغاز وارتقا کی بات کرتی ہیں۔مغرب میں کب اور کیسے تانیثیت کی تحریک کا آغاز ہوا۔مختلف ممالک کے ادیبوں

،نقادوں،سماجی و سیاسی رہنماؤں نے اسے کس طرح سے دیکھا اس سلسلے میں ان کے نظریات بھی پیش کیے ہیں ۔ہندستان میں اس کے آغاز وارتقا کے تعلق سے وہ پہلے زمانہ قدیم کا پس منظر پیش کرتی ہیں۔تاریخ میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ عہد وید میں عورتوں کی بہت عزت کی جاتی تھی اور بدھ مذہب کے فروغ نے اس کی عزت میں اور بھی اضافہ کیا۔عورتوں کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا انھیں نالندہ،ٹیکچھشلا جیسی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل تھا۔اس طرح گپت دور میں عورتوں نے لکھنا بھی شروع کر دیا تھا اور اداکاری بھی کرتی تھیں اس کی مثال کالی داس بھابا بھوتی کی تصنیف میں ملتی ہے۔

ہندو مذہب کے ذکر میں لکھتی ہیں کہ اس دور میں دو طرح کی عورتوں کا تصور ملتا ہے اچھی اور بری۔اس طرح کے جب دو تصورات ملے تو اس میں تصادم ہوا اور اچھے پر برے تصورات حاوی ہو گئے اور انجام کار عورتوں پر پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔آریاؤں اور دراوڑوں کی جنگ نے سماج کو دو طبقوں میں بانٹ دیا۔برہمن ،چھتریہ،ویشیہ،اور شودر۔شودر اور عورتوں کو نیچی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔انھیں مذہبی رسوم میں شامل ہونے کی آزادی نہیں تھی اور یہ پابندی آگے چل کر تعلیم حاصل نہ کرنے کی صورت میں بھی لگائی گئی۔ان کا جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا اور ایسے میں'منوسمرتی' جیسی کتاب نے آگ میں گھی ڈالنے کا کام کیا۔اس کتاب نے سیدھا عورتوں کی کردار کشی کی اور اسے بے وفا ثابت کر کے اسے محکوم بنانے کی ترغیب دی۔شوہروں نے عورتوں کے جائز حقوق چھین لیے اور عورتوں کو مردوں کی چتا کے ساتھ جلایا جانے لگا۔غرض کہ اس وقت عورتوں کی صورتحال بڑی دکھی تھی ۔ہندو مذہب کے مقابل میں جین ،بدھ،اسلام میں بہت حد تک آزادی تھی ۔اس طرح شہناز نبی نے دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ ہندستان میں عورتوں کی صورتحال کا پس منظر بڑے عمیق امشاہدہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

انگریزوں کی آمد نے ایک بار پھر عورتوں کی تعلیم وتربیت کی طرف غور وفکر کرنے کا راستہ ہموار کیا۔راجہ رام موہن رائے نے سماج میں پھیلی ستی پرتھا کو روکا تو ایشور چندر ودیا ساگر نے بیواؤں کی دوسری شادی کرنے کا حق دلوایا ۔سوامی دیانند سرسوتی اور وویکانند نے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا اس طرح عورتوں پر لگائی ھئی پابندیوں میں سدھار کی کوشش ہوئی۔عورتوں کی رائے دہندگی،حق تعلیم ،اور حق روزگار وغیرہ پر دنیا بھر میں سوچا جانے لگا کہیں پہلے تو کہیں بعد میں۔

اس کے بعد شہناز نبی بات کرتی ہیں مختلف ممالک میں تانیثیت کی تحریک کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی۔اس

کے ابتدائی مراحل کیا تھے اس کے لیے وہ سب سے پہلے مغربی ممالک کا ذکر کرتی ہیں کیونکہ مغرب میں ہی تانیثیت بطور ایک تحریک بن کر ابھری۔ مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ وہ ایشیائی ممالک کا بھی ذکر کرتی ہیں اس کے لیے وہ برطانیہ، امریکہ، جرمنی، فرانس، چین، جاپان، اٹلی، پاکستان، بنگلہ دیش، عرب، ایران، جنوب مشرق ایشیا اور ہمارے ملک ہندستان میں اس کے آغاز وارتقا اور اس کے ابتدائی مراحل پر تفصیلی گفتگو کرتی ہیں۔

ان تمام ممالک میں تانیثیت کی تحریک کی ابتدا سے پہلے وہ وہاں کی خواتین کی سماجی، معاشرتی، معاشی صورتحال کا جائزہ لیتی ہیں۔ عورتوں کا گھر اور سماج میں کیا مقام تھا، اسے کتنی آزادی تھی، تعلیم میں اس کیا تناسب تھا، گھریلو زندگی شادی بیاہ میں، رسوم ورواج اور مذہب کی آڑ میں اس کے حقوق کا کس طرح استحصال ہوا، پدرانہ نظام نے ان پر کیا اثرات مرتب کیے وہ ان سب کا تفصیل سے ذکر کرتی ہیں۔

اس طرح وہ سبھی ممالک میں پہلے عورتوں کی صورتحال کا جائزہ لیتی ہیں اس کے بعد عورتوں کے ذریعے کیے گئے احتجاج کی بات کرتی ہیں کیونکہ انسان فطرتاً آزاد ہوتا ہے اسے قید کر کے نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ ان زنجیروں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال عورتوں کے ساتھ بھی ہوا۔ پدرانہ نظام کے جبر واستبداد کے خلاف اور مساویانہ حقوق کی خلاف ورزی نے عورتوں کے اندر احتجاج کی آگ بھڑکا دی۔ عورتیں اب اپنے حقوق کے لیے آوازیں بلند کرنے لگیں۔ کسی نے شاعری کے ذریعے کسی نے تحریروں کے ذریعے اور وقت پڑنے پر عملی اقدامات بھی اٹھائیں اور اپنے حقوق کی لڑائی لڑنے لگیں۔

شہناز نبی نے مختلف ممالک میں کب اور کس خواتین قلم کار نے اپنے قلم کے ذریعے حقوق کی آواز بلند کی اور اس کی اس آواز نے کیسے دوسری خواتین کو متاثر کیا اور اسے آگے بڑھنے کے لیے راستے ہموار کیے ان سبھی کا بڑی عرق ریزی سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کی مدد سے مختلف ممالک میں تانیثیت کی تحریک کی ابتدا اور موجودہ صورتحال کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں یہاں مختلف ممالک کو صرف نظر کر کے ہندستان میں فیمینزم کی تحریک کی ابتدا کے متعلق گفتگو کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔

ہندستان میں فیمینزم کی ابتدا کے لیے وہ پہلے ہندستان کا تاریخی پس منظر بیان کرتی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں عورتوں کی سماجی صورتحال پر نظر ڈالتی ہیں وہ یہ کہ زمانہ قدیم میں عورتوں کو عزت دی جاتی تھی انھیں دیوی مانا جاتا تھا۔ انھیں تعلیم حاصل کرنے کا حق تھا لیکن عورتوں کو یہ حقوق عہد ویدک ہی تھے۔ عہد رزمیہ میں عورتوں پر پابندیاں عائد

کی جانے لگیں۔اس عہد میں عورتوں کو ایک وفا شعار بیوی، گھر سنبھالنے والی ماسی سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی ۔اگنی پرکچھا،ستی پرتھا غرض کہ ہر طرح سے اسے ایک محکوم طبقہ مان لیا گیا تھا۔شہناز نبی اسے سیتا اور دمینتی کے واقعے کی مثال سے اس دور کی عورتوں کی صورتحال بتانے کی کوشش کرتی ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ایسے حالات میں جہاں عورتوں کا اس طرح استحصال ہوتا ہو،ان کے حقوق کی پامالی ہوتی ہو تو فیمینزم کی تحریک کی ابتدا کا خیال ہی لانا پانی پر تصویر بنانے کے مترادف ہے۔اس لیے ہندستان میں تانیثیت کی تحریک دوسرے ممالک کے مقابل بہت دیر سے شروع ہوئی ہے اس کی ایک بڑی وجہ عرصے تک عورتوں کی تعلیم سے دوری تھی۔اس لیے جب ہندستان میں عورتوں کی تعلیم عام ہوئی تو ان کا سماجی شعور بھی بڑھا اور ان کے اندر یہ احساس جاگنے لگا کہ جنس کے نام پر، مذہب کے نام پر ان کا استحصال کیا جارہا ہے۔عورتوں کو تعلیم کا حق دلوانے کے لیے چند مرد حضرات نے ہی پہل کی جن کے ذکر میں وہ راجہ رام موہن رائے،ایشور چندر ودیا ساگر،،راشد الخیری،مولوی نذیر احمد وغیرہ کا نام گنواتی ہیں۔جنھوں نے اپنے طور پر عورتوں کی تعلیم کی کوشش کی،انھیں سماج کے بنائے ہوئے برے رواجوں سے باہر نکالا اور جب عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کیں تو ان میں ان مرد حضرات کی بھی آوازیں شامل تھیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں ک ہندستان میں عورتوں کے حقوق کی لڑائی کے لیے مردوں نے ہی سب سے پہلے آواز بلند کی اور پھر عورتوں نے ان کا ساتھ دیا دھیرے دھیرے یہی آواز ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے لگی جسے آج ہم فیمینزم کی تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔

اس کے بعد شہناز نبی ان خواتین قلم کاروں کا ذکر کرتی ہیں جنھوں نے اپنے اقدام کے ذریعے،اپنی تحریروں کے ذریعے اس تحریک کی بنیاد رکھی اور ابتدائی دور کا ادب تخلیق کیا۔ان میں عبداللہ بیگم کا نام قابل ذکر ہے انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے اپنے خرچے سے ایک اسکول قائم کیا اور گھر گھر جا کر عورتوں میں تعلیم کی بیداری جگائی۔بھوپال کی ملکہ سلطان جہاں بھی تعلیم نسواں کے لیے جان مال سے کوشاں رہتی تھیں۔عطیہ فیضی اپنی روشن خیالی کی وجہ سے آج بھی مثال بنی ہوئی ہیں وہ اور ان کی بہن دونوں نے شعروادب کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔رقیہ سخاوت حسین تحریک آزادی نسواں کی روشن مینار تھیں۔آپ نے ادب اور عملی اقدام کے ذریعے اس کو آگے بڑھایا۔آپ انگریزی اور اردو دونوں میں لکھتی تھی آپ کا ایک افسانہ 'سلطانہ کا خواب' شائع ہوا جس نے تہلکہ مچا دیا تھا۔اس طرح یہ کچھ ابتدائی دور کی خواتین تھیں جنھوں نے فیمینزم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد کی شہناز نبی

ان سب کا تفصیل سے جائزہ پیش کرتی ہیں۔

فیمینزم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اردو ادب کی تحریکوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ شہناز نبی نے اس حوالے سے علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، اور ان تحریکوں نے عورتوں کے خیالات میں کس طرح تبدیلی لائی ان سبھی کا تفصیل سے جائزہ لیتی ہیں اور اپنا نظریہ پیش کرتی ہیں۔

’انگارے‘ کے ذریعہ وہ رشید جہاں کے افسانے کی حقیقت نگاری کا ذکر کرتی ہیں کہ کس طرح رشید جہاں نے آنے والی نسل کے لیے راہیں ہموار کیں جس پر چل کر عصمتؔ، اور قرۃ العین حیدر وغیرہ نے فیمینزم کی تحریک میں مثالی کردار ادا کیے۔ اگر مرد حضرات کی بات کریں تو راشد الخیری، نذیر احمد، حالیؔ، شبلیؔ، سخاوت حسین، وغیرہ نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اسے تقویت دینے میں اہم کردار ادا کیے۔ اس طرح شہناز نبی انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کی خواتین قلم کاروں کی تخلیقات کا ذکر کرتی ہیں جنھوں نے ناول، افسانے اور شاعری کے ذریعے فیمینزم کی تحریک کو وقار بخشا۔

ناول کے حوالے سے وہ لکھتی ہیں کہ انیسویں صدی میں خواتین قلم کاروں نے جب ادب لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو پہلے نثر کی طرف مائل ہوئیں۔ ان کے ابتدائی کاوشوں میں زیادہ تر افسانے، ناول، ڈرامے وغیرہ شامل ہیں۔ شاعری میں چند شاعرات نے طبع آزمائی کی۔ ناول نگار خواتین میں رشیدۃ النسا کا نام پہلے آتا ہے انھوں نے ’’اصلاح النساء‘‘ کے نام سے ایک ناول لکھا۔ دوسرا محمدی بیگم کا ہے جو امتیاز علی تاجؔ کی والدہ تھیں انھوں نے عورتوں کے متعلق کئی ناول لکھے۔ ان کے علاوہ اکبری بیگم، طیبہ بیگم، تراب علی، محمودہ بیگم اور صغریٰ ہمایوں مرزا کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے چودہ ناول لکھے ہیں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیا ہے۔

خواتین فکشن نگاروں میں نذر سجاد حیدر کو نمایاں مقام حاصل ہے انھوں نے تقریباً دس ناول اور دو سو افسانے لکھے ہیں۔ ’’اختر النساء‘‘، ’’آہِ مظلوماں‘‘، ’’جاں باز‘‘، ’’حرماں و نصیب‘‘ ان کے شاہکار ناول ہیں۔ صالحہ عابد حسین کا ناول ’’لالہ رخ‘‘، ’’عذرا‘‘، ’’آتش خارش‘‘ ڈرامے کا ایک مجموعہ ’’زندگی کا کھیل‘‘ اور افسانوی مجموعہ ’’نقش اول‘‘ ہے۔ شہناز نبی ان سب کا تفصیل سے ذکر کرتی ہیں۔

یہ تمام خواتین ناول نگاروں نے اپنے دور کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کو ادب میں سمو کر جاوداں بنا دیا اور ادب کے ذریعے سماج کو سدھارنے کا فریضہ انجام دیا۔ تعلیم نسواں کا ان کا خاص موضوع تھا۔ وطن

پرستی، اخلاقی، اقدار کا تحفظ، سیاسی بازیگری، خواتین کے حقوق کی پامالی ان کا استحصال وغیرہ کو کہانی کا رنگ دے کر اسے اپنی تخلیقوں کے ذریعے سماج کے سامنے لانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اپنے وجود کو منوانے کے لیے سوال بھی اٹھائے اس طرح ان خواتین ناول نگاروں نے اپنے زور قلم سے فیمینزم کی تحریک کو مظبوط بنانے میں اہم رول ادا کیا ۔

اس کے بعد وہ افسانہ نگاروں کا ذکر چھیڑتی ہیں کہ کس طرح ان کے افسانے فیمینزم کی تحریک کو قوی بنانے میں رول ادا کیے۔ اس سلسلے میں وہ خواتین کے افسانوں کا ایک مجموعہ جو آزادی سے پہلے چھپا تھا ''نقوش لطیف'' کا ذکر کری ہیں جس کے مصنف احمد ندیم قاسمی تھے۔ اس مجموعے میں احمد ندیم قاسمی نے افسانہ نگاروں کو مختلف ادوار میں بانٹا ہے۔ پہلے دور میں وہ ان خواتین افسانہ نگار کو رکھتے ہیں جن کے افسانوں میں پلاٹ کی حکمرانی ہے۔ اس میں حجاب امتیاز علی، مسز عبدالقادر، صالحہ عابد حسین اور طاہرہ دیوی شیرازی کو رکھتے ہیں۔ دسر دور کو وہ دور متوسط کا نام دیتے ہیں۔ ان میں ان افسانہ نگاروں کو رکھتے ہیں جن کے یہاں کردار اہم ہوتے ہیں اس میں وہ رشید جہاں، حمیدہ سلطان، شیرین، شکیلہ اختر، صدیقہ بیگم، شفیق بانو، شائستہ درانی، اشرف اور سنجیدہ کو رکھا ہے۔ تیسرے دور کی افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، تسلیم چھتاری، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، کوشیلیا اشک، ممتاز شیریں، سرلا دیوی، سحاب قزلباش، اور زہرہ جبین کو رکھتے ہیں ان کے یہاں پہلے ذہنی تجربے گذرے ہیں اس کے بعد حسیاتی عمل کو افسانے کی صورت دیا گیا ہے۔ شہناز نبی ان کی کتاب کے حوالے سے ان تمام خواتین افسانہ نگاروں کے تعلق سے معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں اور یہ واضح کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اس دور کی افسانہ نگاروں نے محض افسانے نہیں لکھے بلکہ بڑے ہی بے باکی سے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو نشانہ بنایا۔ عورت کی جنسیت پر بات کرنا اس وقت فحش نگاری مانا جاتا تھا ایسے میں صدیقہ بیگم، رشید جہاں اور عصمت نے کھل کر لکھا اور اس طرح خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے ذریعے فیمینزم کی تحریک کو تقویت دی۔

تقسیم ہند کے بعد ماحول بدل گئے اور اس کے اثرات نے ادب کو بھی متاثر کیا اس لیے خواتین افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی۔ اس وقت عورتوں کے ساتھ جو واقعات وحادثات پیش آئے اس کو موضوع بنایا گیا۔ عہد حاضر کی خواتین قلم کاروں کے یہاں تقریباً ہر طرح کے مسائل ملتے ہیں جس کا ذکر شہناز نبی نے اپنے اس باب میں کیا ہے۔

نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں خواتین قلم کاروں نے اپنا الگ مقام بنالیا ہے۔آج ان کے اپنے الگ موضوعات اورالگ نظام ہیں جس سے ان کی ادب میں انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔شہناز نبی ان خواتین شاعرات میں بلقیس ظفر، ملکہ نسیم، عذرا پروین، شبنم عشائی، ترنم ریاض، سارہ شگفتہ، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، اور اپنا نام کا گنواتی ہیں جنھوں نے فیمیزم کی تحریک کومضبوطی عطا کی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندستان میں فیمینزم کی تحریک مرد حضرات کے ہاتھوں شروع ہوئی جس کو آگے بڑھانے میں خواتین فکشن نگاروں اور شاعرات نے اپنا نمایاں رول ادا کیا۔آج ہندستان میں فیمینزم کی تحریک ایک مظبوط مقام پر کھڑی ہے۔ایک نئی تاریخ مرتب کرنے کو تیار ہے۔آج خواتین قلم کاروں کا ایک ہجوم ہے جس کی وجہ سے تانیثی ادب کو الگ مقام دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اس کتاب کا چوتھا باب تانیثیت کی تھیوریاں ہے۔جب فیمینزم کی بحثیت تحریک ابتدا ہوئی تو مختلف عہد میں اس کی مختلف تھیوریاں وجود میں آئیں جس کا ذکر شہناز نبی اپنے اس باب میں کرتی ہیں۔وہ ان تھیوریوں کے وجود میں آنے کے بابت لکھتی ہیں:

> ”Ti Grace Atkinson نے کہا کہ تانیثیت جب ایک علیحیدہ اور منفرد تحریک اختیار کرچکی ہے تو اس کی تھیوری بھی مختلف ہونی چاہیئے۔۔۔۔عورتوں نے فیمینزم کی تھیوری کا مطالبہ اس لیے کیا کہ عورتوں کو مردوں سے الگ مان لیا گیا تھا اور تانیثی تحریک کے حوالے سے عورت کے الگ اور مختلف ہونے کی حقیقت کواز سرنو دریافت کرنے کی کوشش ہورہی تھی۔“77

تانیثیت کی تھیوری کے سلسلے میں شہناز نبی مختلف مغربی مفکرین جوتانیثیت کے ہمنواؤں کے نام گنواتی ہیں اوران کے خیال کا بھی اظہار کرتی ہیں کہ کب اور کس نے تھیوری کو قائم کرنے کی بات کہی۔ان مغربی مفکرین میں سے کسی نے سماجی نظریات کی بات کی، کسی نے معاشرتی، تو کسی نے لسانی اور کسی نے تحلیل نفسی کی۔غرض تانیثیت کے سلسلے میں مختلف نظریات آئے۔ہر مکتبہ فکر نے اپنے اپنے انداز سے عورتوں پر ہوئے ظلم وجبر کی وجہیں تلاش کیں اور اپنی اپنی تھیوریاں قائم کیں جس پر شہناز نبی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:۔

> ”یہ تانیثی تھیوریاں کسی ایک فلسفی یا عورتوں کی آزادی کے کسی ایک علم برداری کی

نہیں ہے بلکہ مختلف دور میں مختلف فیمینسٹوں نے عورت کی محکومیت پر اپنے اپنے طور سے روشنی ڈالی ہے۔''78؎

اس طرح مختلف دور میں مختلف میں مختلف تھیوریاں وجود میں آئیں اور آج ہمارے درمیان مختلف تھوریاں موجو ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔حریت پسند تانیثیت

2۔مارکسی تانیثیت

3۔انتہا پسند تانیثیت

4۔تحلیل نفسی تانیثیت

5۔سماجی تانیثیت

6۔وجودی تانیثیت

7۔مابعد جدید تانیثیت

شہناز نبی نے ان تمام نظریات کے ارتقائی تاریخ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔سب سے خاص بات یہ ہے کہ ایک طرف جہاں وہ ان نظریات کو ماننے والوں کی ان سے وابستگی کا سبب اور مقصد بھی بتاتی ہیں تو وہیں دوسری طرف اس نظریات کو رد کرنے والوں کے خیالات کو بھی واضح کرتی ہیں کہ کس وجہ سے کن کن مفکرین نے اسے رد کیا۔

اس طرح شہناز نبی تانیثیت کی مختلف تھیوریوں کے متعلق بڑی محققانہ گفتگو کرتی ہیں اور موجودہ عہد میں تانیثیت کی تحریک کے لیے تھیوری کی ضرورت ہے کہ نہیں خاص طور سے اردو کے حوالے سے وہ لکھتی ہیں:۔

''چونکہ اردو میں تانیثی تحریک کی وہ روایت نہیں ملتی جو مغرب یا دوسرے ایشیائی ملکوں میں پائی جاتی ہے،اس لیے اردو میں تانیثیت کی تحریک کو سمجھنے کے لیے ان تھیوریوں کا حوالہ ضروری ہو جاتا ہے جن کا اردو ادب سے بظاہر کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن اردو میں تانیثی ادب کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ آخر مرد اساس معاشرے سے نبرد آزما ہونے کا یہ تصور ہندستان اور

تیسری دنیا کے بعض ممالک میں کیسے پہنچا۔'' 79

اس کتاب کا پانچواں باب تانیثی تحریک: اختلاف۔ اتفاق۔ اثرات ہے جو میرے خیال سے یہ باب کافی اہم ہے کیونکہ بقیہ ابواب تانیثیت کی تعریفیں اور مختلف ممالک میں اس کے آغاز وارتقا کے متعلق ہیں لیکن اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کے لیے یہ باب مختص ہے۔ کسی بھی تحریک کے آغاز وارتقا اور اس کے ابتدائی مراحل کے بعد اس کے اثرات ہی اس کا خاصا ہوتے ہیں۔ اس لیے تانیثیت کی تحریک کے آغاز کے بعد اس کے کیا اثرات ہمارے ادب پر پڑا اور ہمارے ادب نے کون سی شکل اختیار کی یہ جاننا ضروری ہے۔ اس باب کے ابتدا میں شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

''عالمی منظرنامے کی بات کریں تو فیمینزم یا تانیثیت ایک تحریک کے طور پر مان لی گئی ہے۔ اس کی تعریف بھی تقریباً متعین ہو چکی ہے۔ اسے عورتوں کی آزادی اور حقوق کے لیے لڑی گئی ایک لڑائی کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔'' 80

اس کے بعد وہ مجموعی جائزہ پیش کرتی ہیں۔ ان مرد حضرات کا بھی ذکر کرتی ہیں جنھوں نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور عورتوں کو آگے آنے کی تلقین کی پھر بھی اس کی بہت مخالفت ہوئی مرد حضرات کے ساتھ ساتھ کچھ خواتین نے بھی اس کی مخالفت کی لیکن اسے بحیثیت تحریک بننے سے نہ روک سکے اور دھیرے دھیرے اس تحریک نے اپنے قدم جمانے شروع کیے اور مغربی ممالک سے نکل کر ایشیائی ممالک اور پوری دنیا میں پھیل گئی۔

تانیثیت کی اس تحریک نے ادب پر کیا اثرات مرتب کیے اس باب میں وہ تفصیل بیان کرتی ہیں۔ سماج میں مساوی حقوق ملنے کے بعد ادب میں بھی تانیثیت کے ہمنواؤں نے اپنا ایک مخصوص اور منفرد ادب کی مانگ کرنے لگی وہ لکھتی ہیں:۔

''ادب میں خواتین کے ادب کی شناخت کا مطلب تھا، ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف۔۔۔۔ ان کا ماننا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ہر شعبۂ حیات میں جنسی بنیاد پر تفریق برتی گئی ہے اور ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔۔۔۔ عورتوں کے الگ تجربات ہیں، ان کا اپنا الگ زاویہ نگاہ ہے۔ ان کی اسلوبیات بھی الگ ہے۔'' 81

عورتوں کے الگ سے اپنا ادب مرتب کرنے کی مانگ کو بھی بہت سے لوگوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ادب کو

جنس کی بنیاد پر الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا اس تفریق سے سماج کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے لیکن عورتوں نے ادب کو جنسی بنیادوں پر اس لیے تقسیم کرنا چاہا کہ انھیں مردوں کے بالمقابل کمزور سمجھنے کی روایت رہی ہے اور ان کی خدمات کو نظر انداز کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ دوسرے ان کے موضوعات ، تجربات واظہار بھی مختلف ہیں۔

یہ تو ادب سے متعلق اثرات رہے ہیں لیکن سماج میں اس تحریک کے اثرات میں شہناز نبی نے درج ذیل تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

1۔ عورت کو رائے دہندگی اور تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہوا۔

2۔ عورت کو مرد کے برابر تنخواہ ملنے لگی۔

3۔ عورت ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے نتیجے میں طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کی اہل ہوگئی۔

4۔ عورت کو جائداد کا حق دیا گیا۔

5۔ زچگی، حمل روکنے کی دوا کا استعمال اور استقاط حمل میں اس کی مرضی شامل ہونے لگی۔

6۔ گھریلو تشدد میں کمی آئی۔

7۔ بچیوں اور کم عمر لڑکیوں پر جنسی استبداد میں کمی آئی۔

8۔ عورتوں کے لیے مخصوص کر دیئے گئے کرداروں میں تبدیلی آئی۔

9۔ سماج میں عورتوں کو مردوں کا محکوم سمجھنے کی روایت ماند پڑنے لگی۔

اس طرح فیمینزم کی تحریک کے زیر اثر عورتوں کو سماج میں ان کا کھویا ہوا مقام حاصل ہوا اور ان کو حقوق مل گئے جس کی وہ طلبگار تھیں۔ ان کے لیے نئے قوانین بنائے گئے۔ ان کے تحفظ کے لیے کئی تنظیمیں سماجی، معاشی مسائل کو دور کرنے کے غرض سے وجود میں آئیں۔ اس طرح اس تحریک کے سبب عورتوں کو ہر طرح سے سیاسی، سماجی ، گھریلو، معاشرتی، حقوق حاصل ہوئے اس کے باوجود آج بھی عورتوں کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے جس کی طرف شہناز نبی کچھ اس طرح اشارہ کرتی ہیں:۔

> ''ان تمام حقیقتوں کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ آج بھی سماج میں
> عورت کو عورت ہونے کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ ہر سطح پر اس کا استحصال جاری

ہے۔وہ سماج کے تشدد سے بچتی ہے تو گھریلو تشدد کا شکار ہو جاتی ہے۔'' 82

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے زمانے کے باوجود عورتوں کو اتنے حقوق ملنے کے باوجود ان کی حالت میں پوری طرح سے بدلاؤ نہیں آیا ہے۔گاؤں اور دیہاتوں میں آج بھی ان کے ساتھ تشدد کی وارداتیں آئے دن خبروں کی سرخیاں بنتی ہیں، زنا بالجبر جیسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں ان سبھی مسائل کو دیکھتے ہوئے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ کیا فیمینزم کی تحریک کو مزید تقویت دینے کی ضرورت ہے یا اس کے لیے دوسرے اقدام کی ضرورت ہے؟ کیا عورتوں کے لیے پھر سے نئے قانون بننے چاہیئے یا سماج کے ذہن کو اچھی نشونما کی ضرورت ہے؟

اس طرح مجموعی جائزہ کے طور پر شہناز نبی کی یہ کتاب ''فیمینزم تاریخ وتنقید'' ایک اہم کتاب ہے۔جہاں تک فیمینزم کی تاریخ کی بات ہے تو انھوں نے اس کتاب کے پہلے دو ابواب میں تعارف، ابتدا اور ارتقا کے تعلق سے لکھا ہے۔تیسرے باب میں مختلف ممالک میں تانیثیت کی تحریک کے ذکر میں بڑی تفصیل میں چلی جاتی ہیں۔اتنی تفصیل میں کہ اس کتاب کے تقریباً 250 صفحات اسی کے متعلق ہیں اور یہی اس کی ضخامت کا سبب بنتا ہے۔تانیثیت کی تحریک کے ابتدا اور ارتقا کا بھی ذکر بھی دو بابوں میں ملتا ہے جس سے طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ہندستان کے ذکر میں بھی وہ صرف اردو کی بات نہیں کرتی بلکہ بنگلہ، مراٹھی زبان کے تعلق سے بھی بات کرتی ہیں۔اس طرح اگر دیکھا جائے تو ان کی یہ کتاب فیمینزم کی تاریخ کی تفصیلات پر ہی مبنی ہے جبکہ اس کتاب کے عنوان میں تنقید بھی شامل ہے لیکن اس پوری کتاب میں تنقید برائے نام ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔اگر شہناز نبی زرا سی توجہ اور دے دیتی تو ان کی اس کتاب کی اہمیت اور معنویت اور بڑھ جاتی۔

بہر حال پھر بھی شہناز نبی نے اس کتاب کو لکھنے میں بہت محنت کی ہے۔مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ان کے مفکرین کے خیالات کو پڑھا اردو کے علاوہ بنگلہ اور مراٹھی ادب کو بھی دیکھا۔تانیثیت کی تعریف اور اس کی کئی ایک تھیوری کا مطالعہ کیا اس لیے بلا شبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی کی یہ کتاب فیمینزم کی تاریخ مرتب کرنے کی ایک کوشش ہے اور اس میں ایک حد تک وہ کامیاب بھی رہی ہیں جیسا کہ علی احمد فاطمی اپنے مضمون ''تانیثیت پر چند نئی کتابیں'' میں اس کتاب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں:۔

''غرض بے حد محنت لگن اور سوجھ بوجھ کے ساتھ لکھی گئی یہ کتاب اردو کی تانیثی تاریخ وتنقید میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔'' 83

تنقیدی مطالعات (2014)

شہناز نبی کی تیسری تنقیدی کتاب ''تنقیدی مطالعات'' ہے جو 2014 میں رہروان ادب پبلی کیشن ،28اے رپن لین کولکاتا۔7000/6 سے شائع ہوئی۔اس میں جملہ 12 مضامین شامل ہیں جومندرجہ ذیل ہیں:

1۔میر تقی میرؔ: شاعرِ آہ

2۔غالبؔ اور گھر

3۔اکبرالہ آبادی اور تعلیم نسواں

4۔پریم چند: حقیقت نگاری اور ہوری

5۔سجاد ظہیر اور نئی اردو شاعری

6۔سجاد ظہیر کی مکتوب نگاری

7۔فیضؔ کی شاعری میں یاسیت

8۔مخدوم محی الدین: بانکا ترچھا ترقی پسند

9۔وامق جونپوری کی شاعری 'جرس' کی روشنی میں

10۔منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ

11۔منٹو کے افسانے کے ضمنی کردار

12۔مجنوں گورکھپوری ''ادب اور زندگی'' کے حوالے سے

اس کتاب کی ابتدا میں شہناز نبی نے نہ کوئی ابتدائیہ لکھا ہے اور نہ ہی کوئی پیش لفظ جس سے ان کا اس کتاب کو ترتیب دینے کا مقصد واضح ہو سکے۔اس لیے ہم اس کتاب کو ان کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ کہہ سکتے ہے ۔اس کتاب میں انھوں نے مختلف ادبی شخصیتوں کا اپنا موضوع بنایا ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون ہماری توجہ کھینچتا ہے۔''میر تقی میرؔ شاعرِ آہ'' کے عنوان سے لکھا یہ مضمون اہمیت کا حامل ہے کیونکہ بات میرؔ کی ہو وہ بھی ان کے شاعرِ آہ ہونے کے حوالے سے تو یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بحث کرنا آسان نہیں ہے۔

اس مضمون کی ابتدا میں ہی شہناز نبی نہایت ہی صاف گوئی سے اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ میر ایسی شخصیت ہے جس پر کئی تنقیدی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں ایسے میں ان پر قلم اٹھانا ذرا مشکل ہو گیا ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ میر جس کی شخصیت پر مجنوں گورکھپوری، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ نے قلم چلایا ہے لیکن وہ آج بھی موضوع بحث بنے ہوئے ہیں اور ان کی شخصیت اور شاعری کے نئے نئے گوشے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جا رہے ہیں اور آگے بھی اس کے امکانات ہیں۔

ایک عرصے تک میر کو شاعرِ آہ کے طور پر مانا جاتا رہا ہے لیکن کچھ ناقدین انھیں ایسا ماننے سے انکار کر رہے ہیں اور محمد حسین آزاد کے اس جملے کو کہ ''میر کا کلام آہ اور سودا کا واہ ہے'' پر تنقید کرتے ہوئے اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس پر شہناز نبی آزاد کا بچاؤ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> ''اگر آزاد نے میر کی شاعری کو آہ سے عبارت کر دیا تو ایسی کیا غلطی کر دی کہ اسے میر کے ساتھ ناانصافی پر محمول کیا جائے۔ میر کے پہلے دیوان کے دوسرے شعر سے لے کر چھٹے دیوان کے آخری شعر تک دل کے اضطراب کا بیان ملتا ہے اور اس اضطراب کا سلسلہ اس 'آہ' سے ملتا ہے جو بقول آزاد میر کی شاعری کا خاصا ہے۔''84

گو شہناز نبی میر کے تعلق سے محمد حسین آزاد سے صد فی صد متفق نظر آتی ہیں۔ وہ اس بات پر اصرار کرتی ہیں کہ میر کے پاس یہ درد وغم، گریہ زاری کی وجہ سے ہی ان کی حساسیت قائم ہے جس سے وہ زمانے کے اتار چڑھاؤ کا اثر، اور دلی کیفیات کا اظہار، ہستی کی بے ثباتی، دل ہو یا دلی کے اجڑنے کا سبب، سب کے بیان میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ:۔

> ''میر کا غم اکثر ان کی طاقت بن گیا ہے۔ وہ اس غم کو ڈھال بنا کر زندگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ میر کی زندگی میں اگر یہ غم نہ ہوتا تو میر، میر نہ ہوتے گنجے کا پتا ہوتے۔''85

میر کی شاعرانہ محاسن پر نظر ڈالتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ میر نے اپنی شاعری میں آفاقی صداقتوں اور تاریخی حقیقتوں کو ایک کر دیا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ میر کی شاعری، ان کی واقعہ نگاری ایسی ہے کہ ہمیں ان کے کردار کو

تلاش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اپنی بات کی تصدیق کے لیے وہ فاروقی صاحب کا قول نوٹ کرتی ہیں۔ وہ میرؔ کی شاعری کو زمانے سے جوڑتی ہیں اور اس بات کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ میرؔ کی نظروں کے سامنے جیسے واقعات وحادثات گذرے ہوں گے میرؔ نے ویسے ہی ان کا بیان کر دیا ہوگا۔ اس میں تخیلات کا بھی دخل ہوسکتا ہے۔ اور اگر میرؔ کی شاعری کو ان کی زندگی سے جوڑ کرنا دیکھیں تو بھی یہ ممکن ہے کہ انھوں نے جس تجربات ومشاہدات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے وہ ممکن بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ارسطو کے المیے کا ذکر کرتی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی سعی کرتی ہیں کہ میرؔ اپنی شاعری میں ایک ڈراما نگار کی صورت میں نظر آتے ہیں جس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے مختلف کرادار نبھائے ہیں۔

اسی طرح آگے وہ میرؔ کے معشوق کے متعلق بحث چھیڑتی ہیں کہ ایک عرصے تک میرؔ کا معشوق بھی بحث کا موضوع بنا ہوا تھا کہ ان کا معشوق وہ خود ہیں یا کوئی اور۔ جو بھی ہے وہ سب الگ الگ روپ دھارنے کا ہنر رکھتا ہے۔ اگر ان کے معشوق کا تصور کیا جائے تو دل میں ایک قسم کا خوف ابھرتا ہے کیونکہ میرؔ کے معشوق نے میرؔ کو جس طرح برباد کیا ہے تو ایسا ہونا لازم ہے۔ میرؔ عشق کر کے تمام عمر پچھتاتے ہیں، روتے ہیں، کبھی جھگڑتے ہیں تو کبھی نادم ہوتے ہیں، عشق کا تلخ تجربہ عاشق کو نہ چین سے جینے دیتا ہے نہ چین سے مرنے دیتا ہے جس کا صاف اظہار ہمیں میرؔ کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے جس کی طرف شہناز نبی نے اشارہ کیا ہے۔

عشق کے بعد اگر میرؔ کے یہاں کوئی اور موضوع آتا ہے تو وہ ہے دنیا کی بے ثباتی شہناز نبی اس پر بھی بات کرتی ہیں اور مثال کے طور پر میرؔ کے اشعار بھی درج کیے ہیں جس میں چند یہ ہیں:

شبنم کی سی نمود سے تھا میں عرق عرق
یعنی کہ ہستی ننگ عدم تھی، خجل ہو گیا

انوکھا تو کہ یاں فکرِ اقامت تجھ کو ہے ورنہ
سب اس دلکش جگہ سے رخت اپنا بار کرتے ہیں

ان اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میرؔ دنیا والوں کو یہ ہدایت دینا چاہتے ہیں کہ دنیا سے امید لگانا فضول ہے۔ زندگی اگر ڈھنگ سے گذارنی ہے تو توقعات کا حد میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ ان کی شاعری کو ارسطو کی ٹریجڈی

بتاتی ہیں کہ میرؔ انسان کو خوف میں مبتلا کر کے اسے ایسے اعمال سے دور رکھنا چاہتے ہیں جو انسان کی زندگی کو مشکلوں میں ڈال دیتے ہیں۔

بے وطنی، ہجرت کا درد بھی میرؔ کا اہم موضوع رہا ہے۔اس کے علاوہ میرؔ نے جھوٹے لوگوں کا مزاق اڑایا ہے تاکہ لوگوں کو ترغیب مل سکے۔شہناز نبی جگہ جگہ میرؔ کی شاعری کی شاعری کے محاسن کو ارسطو کی تھیوری پر پرکھتی ہیں اور اس کو مکمل طور پرفٹ پاتی ہیں اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا میرؔ نے ارسطو کو پڑھا تھا یا نہیں؟۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی پہلے پہل میرؔ کو بطور 'شاعرِ آہ' پیش کرنے کے تعلق سے بحث چھیڑتی ہیں اور میرؔ کے فنی محاسن اور موضوعات پر چلی جاتی ہیں۔اگر وہ ان ناقدین کی مثال دیتی جنھوں نے میرؔ کو بطور 'شاعرِ آہ' ماننے سے انکار کیا تھا اور اس کے پیچھے کیا وجوہات بتائی اس پر بات کرتیں تو اس مضمون کی نوعیت کچھ اور ہوتی ۔بہرحال میرؔ تو میرؔ ہیں ان کی شاعری کی آفاقیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

اس کتاب کا اگلا مضمون ''غالبؔ اور گھر'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون دلچسپ ہے۔مضمون کی ابتدا وہ غالبؔ کی نسل کے تعلق سے کرتی ہیں وہ غالبؔ کی پیدائش اور ان کے آباواجداد کے پیشے وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کے بعد ان کے دلی والے گھر کا نقشہ کھینچتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ غالبؔ کو عالیشان گھر کا بڑا شوق تھا جس کا ذکر ہمیں جا بہ جا غالبؔ کے خطوط میں بھی ملتا ہے ہاں لیکن غدر کے بعد جو خطوط ملتے ہیں ان میں ان کے گھر کی ناگفتہ حالت کا ذکر ملتا ہے۔

شہناز نبی نے اس مضمون میں غالبؔ کے ہر اس گھر کا ذکر کیا ہے جس کو غالبؔ نے تھوڑے ہی دنوں کے لیے ہی کیوں نہ اپنا مسکن بنایا ہو۔وہ چاہے ان کا ذاتی مکان ہوں یا کرائے کی حویلی جس کو غالبؔ نے برسات کے دنوں میں کرائے پر لیا تھا اور وہ ان کو اتنا پسند تھا کہ وہ پوری زندگی اسی میں گذارنا چاہتے تھے۔

ایک اور بات جس کی طرف شہناز نبی نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ غالبؔ نہ صرف اپنے خطوں میں ہی گھر کے متعلق لکھا ہے بلکہ ان کے کلام میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے ۔گھر کے ماحول،فضا ،تنہائی،چہل پہل، بلندی، ویرانی، دوست کے تعلق سے بہت سے ایسے اشعار ہیں جو غالبؔ کے کلام میں شامل ہیں۔شہناز نبی اس بات کو واضح کرنا چاہتی ہیں کہ بھلے ہی مالی حالت اور وقت نے غالبؔ کو زندگی بھر گھیرے رکھا لیکن غالبؔ کو اچھے گھر کی تمنا ہمیشہ رہی اور وہ اس کوشش میں میں بھی رہتے تھے کہ کرائے پر ہی صحیح لیکن انھیں اچھا گھر ملے۔الغرض

’’غالبؔ اور گھر‘‘ کے تعلق سے شہناز نبی کا یہ مضمون اپنی انفرادیت کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔

اگلا مضمون ’’اکبرالہ آبادی اور تعلیم نسواں‘‘ کے عنوان سے ہے۔ یہ ان کی پہلی کتاب ’’تانیثی تنقید‘‘ میں بھی شامل ہے اور اس کا ذکر ’’تانیثی تنقید‘‘ کے حوالے سے میں کر چکی ہوں اس لیے دوبارہ اس کے ذکر سے گریز کرتی ہوں اور آگے بڑھتی ہوں۔

اس کتاب کا چوتھا مضمون ’’پریم چند حقیقت نگاری اور ہوری‘‘ کے عنوان سے ہے۔’ہوری‘ جو کہ پریم چند کے شاہکار ناول ’’گئو دان‘‘ کا مرکزی کردار ہے اور سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال بھی۔ پریم چند کا حقیقت نگاری سے گہرا تعلق ہے۔ یہ پریم چند ہی تھے جنھوں نے پہلی بار ناول اور افسانوں کی بھول بھلیوں سے نکال کر اسے حقیقت سے روشناش کروایا اور کو حقیقت نگاری سے وابستہ کیا۔کئی عظیم المرتبت ناقدین نے پریم چند کی اس خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ شہناز نبی نے بغیر کسی تمہید کے حقیقت نگاری کب اور کہاں شروع ہوئی ،ادب پر اس کا کتنا اثر ہوا ان سب باتوں کا ذکر کر کے یہ عرض کرنا چاہتی ہیں کہ جب پریم چند نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت مغرب میں حقیقت پسندی کی لہر اٹھ کر مدھم ہو چکی تھی تو کیا پریم چند نے اس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا تھا ؟ وہ سوال قائم کرتی ہیں کیونکہ پریم چند کی تحریروں میں اکثر مغربی ادیبوں کا ذکر ملتا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مغرب کے یہ ادیب پریم چند کے مطالعے میں تھے تو یہ ممکن ہے کہ وہ ان کی حقیقت نگاری کی تحریک کے متعلق جانکاری رکھتے ہوں گے۔ان کا یہ سوال قابل غور ہے اور موضوعِ بحث بھی۔

شہناز نبی گئو دان کے متعلق گفتگو میں اس کے پلاٹ کے متعلق لکھتی ہیں کہ اس کا پلاٹ دیہاتی اور شہری زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ پریم چند کی گاؤں والی زندگی کو تو ناقدین نے بہت سراہا لیکن دوسرے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ جہاں تک کرادر نگاری کی بات ہے تو وہ پریم چند کے کردار سے مطمئن نظر نہیں آتی ہیں جب کہ پریم چند کے کردار پر اب تک کئی ناقدین نے اپنے نظریے پیش کر چکے ہیں۔ ہوری کے متعلق وہ اسے ایسا کردار مانتی ہیں جو کئی برسوں تک بحث کا موضوع بنا رہا۔کئی ناقدین کی نظر میں اس کا کردار مجہول ہے۔شہناز نبی بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہیں۔ اولاً وہ ہوری کی طرزِ زندگی ،طرز معاشرت ،اور مکالمے کا ذکر کرتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں:۔

’’ہوری کو ’’گئو دان‘‘ میں جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم پریم

چند کی حقیقت نگاری کی تعریف تو کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ پریم چند کی آواز اتنی تیز ہے کہ ہوری کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔ پریم چند نے ہوری کو بولنے کا موقع دیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ اس کے کردار کے کچھ چھپے ہوئے گوشے ہمارے سامنے آجاتے ور ہوری ایک مجہول کردار ہونے سے بچ جاتا۔''86

گویا اس طرح انھوں نے ان ناقدوں کی حمایت کی ہے جو ہوری کے کردار کو مجہول مانتے ہیں۔شہناز نبی کا یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے لیکن ایسے وقت میں جب حالات انتشار کا شکار تھا۔جاگیردارانہ نظام کی بیڑیوں کو توڑنے کی بات ہو رہی تھی تو ایسے میں ہوری میں سبھی خصوصیتوں کو شامل کرنا وہ بھی ترقی پسند کے مقصدیت کو دیکھتے ہوئے کیا ممکن تھا؟ ایسے حالات میں پریم چند اپنے مقصد پر زیادہ زیادہ زور دیتے یا ہوری کی کردار سازی پر یہ بحث کا موضوع ہے۔

چھٹا مضمون ''سجاد ظہیر اور نئی اردو شاعری'' کے عنوان سے ہے۔سجاد ظہیر پر شہناز نبی نے کئی مضمون تحریر کیے ہیں اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ سجاد ظہیر کے حوالے سے ان کا مطالعہ وسیع ہے۔یوں تو سجاد ظہیر کا نام آتے ہی ہمارا ذہن ترقی پسند تحریک کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔یہ سجاد ظہیر ہی تھے جنھوں نے ترقی پسند کا نظریہ پیش کر کے اردو ادب کو زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی اور ادب کو ادب برائے ادب سے ادب برائے زندگی بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

جہاں تک نثر کی بات ہے تو اس کے تعلق سے سجاد ظہیر کا نظریہ کافی مشہور رہا ہے لیکن اردو شاعری کے حوالے سے ان کا نظریہ کہاں تک کامیاب رہا ہے اس پر بہت کم لوگوں نے گفتگو کی ہے لیکن شہناز نبی کی نظر سے ان کا یہ گوشہ چھپا نہ رہ سکا۔وہ شاعری سے متعلق ان کے جن نظریات کو جوڑتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

1۔سجاد ظہیر نے اپنے نظریات کو کسی پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔

2۔سجاد ظہیر پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی ڈگر بنانے کے قائل تھے لیکن ماضی سے، تہذیب، فن اور زبان سے ملنے والے بیش قیمتی ترکے کو جسے وہ بہترین وراثت مانتے تھے، نظر انداز کرنے کو تیار نہ تھے۔

سجاد ظہیر کے ان نظریات کو جمع کرنے کا مقصد سجاد ظہیر کے خیالات کا نئی شاعری میں شمولیت کو دریافت

کرنا ہے، ترقی پسند کے بعد جدیدیت کے رجحان نے ترقی پسندوں کے نظریوں کو یکسر نظر انداز کردیا۔ وہ خیالات جو روشن خیالی کی دین تھے وہ اسباب وعلل جو روشن خیالی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا اس کو رد کردیا۔ شعروادب میں نئے نئے تجربوں کا سلسلہ چل نکلا۔ استعارات وعلامات کا سلسلہ دراز ہوا لیکن جدیدیت کا ڈھانچہ بھی کچا ثابت ہوا اور مابعد جدیدکی تحریک عمل میں آئی۔

شہناز نبی ترقی پسند اور جدیدیت دونوں کا اثر مابعد جدید میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اولاً دونوں کو مقاصد کو واضح کرتی ہیں۔ جدید شاعری پر بحث کرتے ہوئے نئی شاعری یا جدید شاعری کی شروعات کے بارے میں مختلف نظریوں کا ذکر کرتی ہیں لیکن اپنے نظریے سے وہ شاعری کے بیان میں زمانے کی حد کو نہیں مانتی اور اس احتجاجی اور مزاحمتی لہجے کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو قدیم سے لے کر آج تک آتے ہیں۔ غرض وہ پرانے نئے سب شاعر کو شامل کرتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ شاعر جدید ہو یا مابعد جدید احتجاج سے گریز نہیں کرتا۔ آگے وہ 1980 کے بعد کے شاعر اور شاعرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ وہ سب شاعرات ہیں جنھوں نے جنس کے نام پر مساوی سلوک کے لیے آواز اٹھائی ہے لیکن آج بھی ایسے کئی موضوعات ہیں جن پر قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

نئی شاعری کے لیے وہ مابعد جدیدیت کو جدیدیت اور ترقی پسند دونوں سے استفادہ کرنے پر زور دیتی ہیں۔ ان کا یہ نظریہ کہاں تک درست ثابت ہوگا وہ ایک بحث کا موضوع ہے لیکن اگر ہم ایک عمیق نظر ڈالیں تو ان کے اس نظریے میں جان ضرور دکھائی دیتی ہے۔

اس کتاب کا اگلا مضمون ''سجاد ظہیر کی مکتوب نگاری'' کے عنوان سے ہے۔ ''نقوش زنداں'' سجاد ظہیر کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اردو مکتوب نگاری میں ایک میل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو 1951 میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے رضیہ سجاد ظہیر نے شائع کرایا تھا۔ یہ مجموعہ دو سال کے خطوط پر منحصر ہے۔ اس مضمون میں شہناز نبی سب سے پہلے 'نقوش زنداں' سے متعارف کرواتی ہیں اور پھر سجاد ظہیر کی خطوط لکھنے کی وجہ بتاتی ہیں۔ اس مجموعے میں زیادہ تر خط رضیہ سجاد ظہیر کے نام ہے جس میں سجاد ظہیر نے اپنی بیوی سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ شہناز نبی اس کا نمونہ بھی پیش کرکے یہ بتانے کی کوشش کرتی ہیں کہ یہ محبت ہی تھی جس نے سجاد ظہیر کو جیل کی چہار دیواری اور تنہائی کے جنگل میں ان کے اندر جینے کی تمنا جگائے ہوئے تھی۔

اس مضمون کے ذریعے شہناز نبی سجاد ظہیر کی مکتوب نگاری کی خصوصیات بتانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یوں تو

سجاد ظہیر کے جذبات کے اظہار کا وسیلہ ان کے خطوط ہی ہیں لیکن اس میں ہمیں ان کے فنی محاسن کے نمونے بھی جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔جیل کا منظر، پارک اور باغ کا بیان، دن رات کا تذکرہ، چاند تارے کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے جس کی طرف شہناز نبی اشارہ کرتی ہیں۔بعض خطوط سے ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سجاد ظہیر کی طنز مزاح پر بھی گرفت ہے جس کا بیان انگریزی حکومت کے ذکر کے وقت دیکھنے کو ملتا ہے۔

سجاد ظہیر ایک معروف شخصیت تھی۔لکھنا پڑھنا ان کا پسندیدہ شغل تھا اور یہ شغل جیل میں بھی جاری رہا۔وہ خطوط کے ذریعے کتابیں منگوایا کرتے تھے۔سجاد ظہیر شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے۔کبھی کبھی جب وہ نثر سے اوب جاتے تو شاعری کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔شہناز نبی نے سجاد ظہیر کی شخصیت کی ان ہی سب باتوں کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے۔

سجاد ظہیر کی اپنی بیگم رضیہ سجاد ظہیر سے والہانہ محبت کا ذکر تو کئی کتابوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ ایک باوفا شوہر تھے۔جیل میں رہ کر بھی انھیں اپنی بیگم کی فکر ستاتی تھی۔جب وہ جیل میں تھے تو اس وقت رضیہ سجاد حمل سے تھیں اور ان کی صحت کا سجاد ظہیر کو خاص خیال تھا وہ ہمیشہ خطوط کے ذریعے انھیں اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔سجاد ظہیر کو گھر کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھی فکر رہتی تھی۔جنگ سے ہونے والے جان و مال کے نقصانات انھیں بے چین کر دیتے تھے اس کا اظہار بھی ہمیں ان کے خطوط میں دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ وطن اور ادب سب کے بارے میں فکر مند رہتے تھے اس کا ذکر شہناز نبی کچھ اس طرح کرتی ہیں:۔

> ''نقوش زنداں' کے خطوں میں ایک ایسے شخص کا پیکر ابھرتا ہے جو ایک آئیڈیل انسان ہے۔اس کے دل میں اپنے عزیز واقارب کا خیال ہے تو انسانیت کا غم بھی اسے بے چین رکھتا ہے۔''87

جہاں تک ان کے خطوط کے اسلوب کی بات ہے تو ان کا سلوب سادہ اور رواں ہیں جو اس کو دلچسپ بناتا ہے۔سادگی اور علمیت سے بھرپور ان کے یہ خطوط ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔شہناز نبی ان کے خطوط کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرتی ہیں اور ان کی موجودہ حالت کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ان کے لکھنے کی اسٹائل، بیان، اسلوب سب پر نظر ڈالتی ہیں۔

الغرض شہناز نبی کا یہ مضمون سجاد ظہیر کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی نجی زندگی اور ادبی ذوق وشوق پر

روشنی ڈالتا ہے۔ان کی شخصیت کی طرح ان کے خطوط بھی ہر دل عزیز ہیں۔ جہاں ہمیں عشق ومحبت کا اظہار بھی دیکھنے کو ملتا ہے تو وطن اور ادب کے لیے فکر بھی۔شہناز نبی اس مضمون میں سجاد ظہیر کی شخصیت اور ان کی مکتوب نگاری کی خصوصیات بتانے کی کوشش کرتی ہیں اور مثالیں دے دے کر ایک منصفانہ ناقد کی طرح ہر پہلو کو نظر میں رکھا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا یہ مضمون تنقید کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے اور بحیثیت ناقد ان کا مقام بھی متعین کرتا ہے۔

اس سلسلے کی اگلی کڑی مضمون کی شکل میں ''فیضؔ کی شاعری میں یاسیت'' کے عنوان سے شامل ہے۔فیضؔ نرم لہجے کا شاعر ہے۔شہناز نبی نے اکثر بڑے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی تنقیدی مضامین کو موضوع بنا یا ہے جن میں سے فیضؔ بھی ہیں۔اس مضمون میں وہ فیضؔ کی ترقی پسند سے وابستگی سے اپنے مضمون کی شروعات کرتی ہیں پھر بحیثیت شاعر ان کے فنی محاسن پر بحث کرتی ہیں۔انقلاب اور آزادی کا تصور فیضؔ کے یہاں پورے آب وتاب سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے یہاں رومانیت بھی انقلاب میں ڈھل جاتی ہے اس کے بیان میں شہناز نبی کافی تفصیل سے بحث کرتی ہیں جگہ جگہ فیضؔ کے دیباچوں کے ذریعے ان کی فکر کو بھی دکھانے کی سعی کرتی ہیں۔فیضؔ کی شاعری کے محاسن پر نظر ڈالنے کے بعد انھوں نے جو باتیں اخذ کی وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1۔فیضؔ کا کام حالات کا جائزہ لینا ہے۔

2۔فیضؔ حالات کا جائزہ تو لیتے ہیں لیکن اسے بدلنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔

3۔فیضؔ امیدوں سے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ ان کی مایوسی کو نہ بڑھا دے۔

4۔فیضؔ دو شخصیتوں کے حامل تھے۔جس میں ایک طرف ہمیں رومان تو دوسری طرف انقلاب دیکھنے کو ملتا ہے۔

5۔مناظر فطرت فیضؔ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں وہ گھبرا کر ان میں پناہ لیتے ہیں۔

6۔فیضؔ نے اپنے سیاسی نظریات کو پیش کرنے کے لیے اکثر اوقات علائم کا سہارا لیا ہے۔

7۔وہ ناساعد حالات کا شکوہ کرتے ہیں۔وہ نارسائی کو اپنی قسمت مان لیتے ہیں،وہ کسی سے امید نہیں لگاتے ہیں۔

شہناز نبی نے فیضؔ کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے اپنے یہ نظریے قائم کیے ہیں جس سے وہ فیضؔ کو امید اور ناامید کے زیر و بم میں ڈوبتا ابھرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ان کے مطابق فیضؔ دوراندیش تھے اور آنے والے حالات

کا اندازہ لگا لیتے تھے لیکن اس کا سامنا کرنے کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے سے قاصر تھے اس لیے وہ اکثر مایوس ہو جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ دو نظریے کا شکار رہے ہیں رومان اور انقلاب، انقلاب اور رومان لیکن یہ دونوں تصورات بھی انھیں خوشی دینے کے سبب نہ بن سکے جس سے وہ بھاگ کر مناظر فطرت میں پناہ لیتے ہیں اور اسی کو اپنی قسمت مان کر چپی سادھ لیتے ہیں۔ شہناز نبی نے اپنے ان نظریوں کی تائید کے لیے فیضؔ کے کلام کے کئی اشعار، نظمیں مثال کے طور پر پیش کی ہیں۔

چونکہ شہناز نبی نے فیضؔ کی شاعری میں یاسیت کی تلاش میں یہ مضمون تخلیق کیا ہے اور صرف اسی پہلو کو مد نظر رکھ کر فیضؔ کے کلام سے ایسے اشعار ڈھونڈ کر مثالیں دی ہیں جو یاسیت کے عکاس ہیں۔ وہ اپنی اس کوشش میں تو کامیاب رہی ہیں لیکن کہیں نہ کہیں مضمون کے عنوان کی وجہ سے فیضؔ کی شاعری کے فنی محاسن اس سے مجروح ہوئے ہیں اور اس کے منفی اثرات نے فیضؔ کی شاعری کے فنی محاسن پر گہن لگا دیئے ہیں لیکن ایک تنقید نگار کا کام ہی ہے اپنے موضوع اور عنوان سے انصاف کرنا اس لیے جہاں تک تنقید کی بات ہے تو وہ کامیاب رہی ہیں۔

اس کتاب کا اگلا مضمون ایک اور مشہور ترقی پسند شاعر مخدومؔ پر ہے۔ ''مخدوم محی الدین: بانکا ترچھا ترقی پسند'' کے عنوان سے شامل ہے۔ انقلاب کا شاعر مخدوم محی الدین، ترقی پسند خیالات کے ہمنوا اور پرچارک تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی انقلاب کے نام وقف کر دی تھی۔ مخدومؔ کی شاعری ڈرامائی انداز لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ہنستے، بولتے، دکھ اٹھاتے، غصے کا اظہار کرتے ہوئے، عشق فرماتے ہوئے، انقلاب اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک ذہین، خوددار، قربانی کے جذبے سے ہمکنار جذباتی انسان تھے اور یہی وہ خصوصیتیں ہیں جو انھیں مکروفریب سے روکے رکھی۔

شہناز نبی مخدومؔ کو احتجاجی شاعر کے رخ سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:۔

> ''اردو کی انقلابی شاعری کی روایت سے مخدومؔ نے بھرپور استفادہ کیا۔ ان کی تیز سیماب آسا طبیعت نے ان کے انقلابی لہجے کو مزید صلاحیت عطا کی۔ وہ بات کو گھما پھرا کر یا علامتوں کی پرتیں چڑھا کر نہیں پیش کرتے بلکہ صاف اور دوٹوک لہجے میں اپنا مافی الضمیر واضح کرتے ہیں۔'' 88

آگے وہ ''سرخ سویرا'' سے اپنی بات شروع کرتی ہیں اور مخدومؔ کے باغی انداز کو بنگال کے شاعر نذر

الاسلام سے متاثر بتاتی ہیں۔اس کے لیے وہ نذر اور مخدوم کی کئی نظموں میں مماثلت کے نمونے پیش کرتی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہوسکتا ہے مخدوم کو نذرل کی نظم ہی سے باغی لکھنے کی تحریک ملی ہو لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شہناز نبی غلط ہوں کیونکہ ایک جیسے موضوعات اور لکھنے کا انداز کا دو شاعروں کے پاس مل جانا اس بات کی ٹھوس دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ ادب میں ایسی کئی مثالیں ہیں جب دو شاعروں کے کلام میں مماثلت پائی گئی ہو۔اس لیے جب تک شاعر نے اس کا اعتراف نہ کیا ہوں اس کو صحیح تصور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں نذرل اور مخدوم کے درمیان زمانے کا گیپ ہے بہر حال یہ تحقیق کا موضوع ہے۔

اس کے بعد وہ اس بات پر بحث چھیڑتی ہیں کہ مخدوم شاعرِ انقلاب تھے یا شاعرِ رومان وہ لکھتی ہیں:۔

> ''مخدوم کا پہلا مجموعہ ''سرخ سویرا'' ان کے بدلتے ہوئے موڈ کا ترجمان ہے مگر مجموعے کو ترتیب دیتے وقت اس بات پر توجہ نہیں دی گئی ہے اور مخدوم کی ابتدائی نظمیں بعد میں اور بعد کی پہلے رکھ دی گئی ہے تو اس سے ان کی شاعری کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے گی اور ہم وشوق کے ساتھ یہ بھی نہ کہہ پائیں گے کہ مخدوم فیض کی طرح رومان سے انقلاب کی طرف آئے ہیں ۔''89

لیکن یہ بات تو طے ہے کہ مخدوم کے یہاں رومان اور انقلاب کا سنگم ہے۔ان کے یہاں عشقیہ جذبات کے ساتھ ساتھ انقلاب کے تصورات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ہمت، جوش، ولولہ اور خود اعتمادی بھی کافی حد تک پائی جاتی ہے لیکن ان کی سب سے خاص بات سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کھل کر بغاوت کرنا ہے اور وہ ایک باغی بن کر ادب کی دنیا میں داخل ہوئے۔

اس مضمون میں شہناز نبی نے مخدوم کے سیاسی نظریات، عوامی نظریات، ان کی شخصیت کا ان کی شاعری پر اثر ان سب پر تفصیلی گفتگو فرماتی ہیں۔وہ مخدوم کے یہاں رومان اور انقلاب کے بیچ ان کے فلسفیانہ خیال کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ان کے اسلوب اور بیان پر بڑی شاعرانہ گفتگو کرتی ہیں۔مخدوم فطرت سے بہت قریب تھے اس لیے ان کے یہاں چاند، دریچے، گلی، کھیت کھلیان کا ذکر بھی دیکھنے کو ملتا ہے اس کی طرف بھی شہناز نبی اشارہ کرتی ہیں اور مخدوم کی شخصیت اور شاعری کی معنویت بتاتے ہوئے مخدوم کی مقبولیت کے اسباب و علل کے بارے میں لکھتی ہیں

:۔

’’مخدومؔ بحیثیت شاعر اس لیے کامیاب رہے ہیں کہ مخدومؔ کی شاعری انسان کے ذہن ودل کی ترجمانی کرتی ہے۔انھوں نے ایک محدود دائرے میں رہ کر بھی اپنی ذہنی وسعت کا ثبوت دیا ہے ۔۔۔۔موت نے مہلت دی ہوتی تو مخدومؔ اردو شاعری کو حیاتِ انسانی کے مزید اسرار ورموز سے واقف کراتے ۔مخدومؔ کی کامیابی کا سبب ان کی وہ ایمانداری ہے جو ان سے صرف سچ کہلواتی ہے۔‘‘90

الغرض اپنے اس مضمون کے ذریعے شہناز نبی نے مخدومؔ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے شعری محاسن کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے وہ مخدومؔ کے ہر اس گوشے پر نظر ڈالتی ہیں جس سے مخدومؔ خود اور ان کی شاعری کی خصوصیات ابھر کر سامنے آسکے اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی رہی ہیں۔

مضامین کے سلسلے کی اگلی کڑی ’’وامق جونپوری کی شاعری ’جرس‘ کی روشنی میں‘‘ کے عنوان سے آگے بڑھتی ہے۔وامق جونپوری ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔شہناز نبی نے اپنے اس مضمون میں ان کے مجموعے ’جرس‘ کے حوالے سے بات کی ہے۔یہ مجموعہ 1950 میں منظر عام پر آیا تھا۔ابتدا میں وہ اس مجموعے کے متعلق گفتگو کرتی ہیں اس کے صفحات، پیش لفظ جو کہ احتشام حسین نے لکھا اور ’اعتراف‘ کے عنوان سے وامق نے اپنی بات رکھی جس میں انھوں نے اپنے شعر کہنے کی وجہ بتائی وغیرہ وغیرہ کی تفصیل بتاتی ہیں۔

وامق جونپوری کی وہ خاص بات جو انھیں اوروں سے الگ کرتی ہے اور ان کی انفرادیت کی وجہ بنتی ہے وہ ہے ان کی پرانی روش سے بغاوت اور اپنے لیے ایک نیا راستہ نکالنا ہے جس کی طرف شہناز نبی نے اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:۔

’’وامق نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ انھوں نے کئی متروکات کا استعمال کیا ہے اور غیر مانوس ترکیبیں اختراع کی ہیں۔قوافی کے استعمال میں انھوں نے صوفی قوافی کو جائز مانا ہے اور عام رجحانات سے ہٹ کر قوافی باندھے ہیں۔‘‘91

اس کے بعد وہ وامق جونپوری کے شعری خصائص پر بحث کرتی ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وامق نے ترقی پسندی کے اثرات کے تحت شعر کہے ہیں اس لیے ان کی شاعری ترقی پسندی نظریات کی علمبردار

بن گئی ہے۔ وہ مسائل کا سامنا تو کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی گھبرا کر مے خانے کا رخ کر لیتے ہیں۔ انھوں سماج میں پھیلی ہر چھوٹی بڑی برائیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اونچ نیچ، ذات پات، چھوٹا بڑا، امیر غریب جیسے موضوعات پر اشعار کہے ہیں اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وامق کی شاعری دورخی شاعری ہے کیونکہ جہاں وہ ایک طرف امید افزا باتیں کرتے ہیں تو وہیں دوسری طرف مایوسی کا شکار نظر آتے ہیں۔ شہناز نبی کی نظر سے ان کی یہ کمی چھپی نہ رہ سکی اور وہ ان کی شاعری کے ان ہی سب پہلو کو اپنی بحث کا موضوع بناتی ہیں۔

شہناز نبی نے وامق کے شعری موضوع کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب بیان کا بھی احاطہ کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ وامق کا اپنا ایک استعاراتی نظام تھا جس کو وہ حسب ضرورت کام میں لاتے تھے۔ اس وقت کے جاگیر دارانہ نظام سے سماج میں ایک غم آلودہ فضا قائم تھی ایسے کڑے وقت میں بھی وہ امید کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں کیونکہ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ زنجیر ٹوٹیں گی۔ وامق کافی حد تک حقیقت پسند تھے اور اس نے ان کو اتنا سنگ دل بنا دیا تھا کہ رومان کی ان کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی چاند کے چھونے کی خواہش ان کے نزدیک ایک بچکانہ عمل تھا۔

شہناز نبی ادب میں وامق کے مقام و مرتبہ پر سوال اٹھاتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ وامق نے جس طرح کی شاعری کی انھیں ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا۔ وہ 'ترقی پسند ادب' کے خالق خلیل الرحمٰن اعظمی پر بھی اعتراض کرتی ہیں کہ وہ (اعظمی) نے وامق کی شاعرانہ صلاحیت کو مانا ضرور ہے لیکن وہ وامق کو اس قابل نہیں سمجھے کہ ان پر تفصیل سے گفتگو کرتے۔ شہناز نبی کی یہ شکایت بجا ہے وامق کی شعری محاسن کو دیکھتے ہوئے ادب میں ان کے مقام و مرتبے کو پھر سے متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

اگلا مضمون ''منٹو کا پہلا افسانوی مجموعی 'آتش پارے'' کے عنوان سے ہے۔ منٹو اردو افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ نچلے طبقے کا دکھ درد سمیٹے وہ قلم کو انگلیوں میں دبائے اسی دکھ درد کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کا انھوں نے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس سے ادب میں ان کا مقام اور ان کا کام دونوں ہی مثال بن گیا ہے۔

شہناز نبی نے اس مضمون میں منٹو کے پہلے افسانوی مجموعے ''آتش پارے'' کو موضوع بنایا ہے۔ ''آتش پارے'' 1936 میں امرتسر سے پہلی بار شائع ہوا۔ اس کی تصنیف وتالیف پر مختلف ناقدین کی رائے الگ ہے لیکن شہناز نبی نے بحوالہ اسے اسی تاریخ میں شائع ہونے کا بین ثبوت دیا ہے۔ وہ اس مجموعے میں شامل تقریباً سبھی

افسانوں کا ذکر کرتی ہیں۔اس میں کل آٹھ افسانے ہیں۔منٹو کا مقصد تو کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا یہ تو صاف تھا تھا کہ وہ سماج کو بیدار کرنا چاہتے تھے، دبے کچلے لوگوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ ان کی تخلیق کا بھی مقصد تھا۔

شہناز نبی منٹو کے اس مجموعے کے پہلے افسانے سے لے کر تقریباً سبھی افسانوں پر تقیدی نظر ڈالتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ منٹو کا مقصد سماجی مسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا ہے۔وہ اپنے کرداروں کے ذریعے سوالات قائم کرتے ہیں جو سماجی اور طبقاتی فرق سے متعلق ہوتے ہیں۔چھوٹے بچوں کا مزدوری کرنا اور اپنے مالک سے مار کھانا، وہ ان سب کی بڑی دلآویز تصویر پیش کر کے انھوں نے سماج کے سامنے انھیں بے پردہ کرنے کی کوشش کی ہے۔موضوعات کے ساتھ ساتھ منٹو نے اپنے کرداروں سے المناک مکالمے ادا کروائے ہیں ۔''آتش پارے'' کے بارے میں شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

> ''غرض کہ یہ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جس کے متعلق منٹو کا دعویٰ تھا کہ 'یہ فکر طلب افسانوں کا مجموعہ ہے'۔اس اعتبار سے فکر طلب ہے کہ اس میں سماج کے چند اہم مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔''92

اس طرح شہناز نبی نے منٹو کے اس افسانوی مجموعے کا موضوع بنایا جس کو تخلیق کرتے وقت منٹو نے طوائفوں کی زندگی کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ان کا ذہن فرقہ وارانہ فسادات، سماج میں پھیلی غریبی، بھوک مری میں ہی الجھا ہوا تھا۔ان سب کو وہ بڑے سچے دل کے ساتھ اپنے اس مجموعے میں پیش کر کے اپنے بڑے افسانہ نگار بننے کی نیو رکھ دی۔

افسانہ نگاری کے تعلق سے جہاں تک منٹو کی بات ہے تو اس بات سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا کہ منٹو ایک بڑا افسانہ نگار ہے اپنے وقت میں بھی اور آج بھی۔ادب میں ان کی جگہ اور ان کی اہمیت دونوں ہمیشہ مسلم رہے گی۔

اگلا مضمون بھی منٹو پر ہی ہے۔''منٹو کے افسانوں کے ضمنی کردار'' کے عنوان سے یہ مضمون شہناز نبی کی ناقدانہ نظر کا ثبوت ہے کیونکہ عام طور پر لوگوں کی نظر مرکزی کرداروں کے اردگرد گھومتی رہتی ہے لیکن شہناز نبی نے منٹو کے ضمنی کردار کے ذریعے ان کی کردار نگاری کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مضمون کے آغاز میں وہ منٹو کو بے باکانہ اظہار کا نام دیتی ہیں وہی بے باکی جس کی وجہ سے منٹو کو بہت بدنامی جھیلنی پڑی تھی۔اگر حقیقت نگاری کی بات کرے تو افسانوی ادب میں پریم چند نے اس کی نیو رکھ دی تھی اور

دیہات کی زندگی تصویریں دکھا چکے تھے لیکن ایک بات جو پریم چند اور منٹو کو الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ پریم چند کے یہاں مثالیت پسندی دیکھنے کو ملتی ہے تو منٹو کے یہاں حقیقت کا سفاکانہ اظہار اور اسی اظہار کے لیے انھوں نے کرداروں کا سہارا لیا اور مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ ان کے ضمنی کردار بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہے اس تعلق سے شہناز نبی لکھتی ہیں:۔

> ''ان کے افسانوں میں مرکزی کردار کے آس پاس ضمنی کردار بھی ہیں جو اس مرکزی کردار کی شخصیت بنانے، ابھارنے اور تراشنے میں افسانہ نگار کی مدد کرتے ہیں۔ یہ کردار جھیل کی سطح پر دائرے بنانے والا پتھر بن جاتے ہیں اور مرکزی کردار میں اتھل پتھل پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں۔'' 93

مثال کے طور پر وہ 'سوگندھی' کے اس کردار کی بات کرتی ہیں جس کی صرف ایک 'اونہہ' نے سوگندھی کی زندگی میں اتھل پتھل کر دی تھی۔ اس کے اندر عورت کی سوئی ہوئی انا جاگ اٹھتی ہے۔ اس کی ساری مجبوریاں، لاچاریاں، کمزوریاں اس پر قہقہے لگانے لگتی ہے۔ اس ایک 'اونہہ' والے کردار نے ہی مرکزی کردار کے اندر حرکت پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے افسانہ نگار آگے بڑھتا گیا۔ اسی طرح وہ ''ٹھنڈا گوشت'' کی اس مردہ لڑکی کے کردار کا حوالہ دیتی ہیں جسے ایشر سنگھ نے اغوا کر لیا تھا لیکن وہ لڑکی اس کی آغوش میں ہی مر جاتی ہے اور یہ مختصر کردار اس کی زندگی کو اس طرح بدل کر رکھ دیتا ہے کہ کلونت کور کی قیامت خیز جوانی بھی اس کے اندر حرارت پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے، اسی طرح وہ ''نیا قانون'' میں گورے کے کردار کو جو منگو کوچوان کے لیے چڑ کا باعث بنا ہوا تھا، افسانہ ''کھول دو'' میں ڈاکٹر کا کردار جس کے کھول دو بولنے پر سکینہ اپنی شلوار کھول دیتی ہے۔ اس کی اس حرکت پر سکینہ کا باپ تو خوش ہو جاتا ہے لیکن ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو جاتا ہے۔

شہناز نبی نے بڑی ہی عرق ریزی سے منٹو کے ضمنی کرداروں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں:۔

> ''غرض جہاں منٹو نے اپنے افسانوں کے مرکزی کرداروں کو بڑی محنت اور باریک بینی سے گڑھا ہے، وہاں انھوں نے اپنے ضمنی کرداروں پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ یہ مختصر اور بظاہر غیر اہم کردار کبھی کبھی پورے افسانوں کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔'' 94

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منٹو کے وہ ضمنی کردار جو مرکزی کردار کو پیچھے سے آگے بڑھانے کی تلقین کرتے ہیں اور انھیں راستہ بتاتے ہیں ۔شہناز نبی نے اس مضمون میں ہماری توجہ منٹو کے مرکزی کردار سے ہٹا کر ضمنی کرداروں کی طرف مبذول کراتی ہیں ۔انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موضوع کے ساتھ ساتھ منٹو کردار نگاری میں بھی کمال رکھتے ہیں۔

اس کتاب کا اگلا اور آخری مضمون ''مجنوں گورکھپوری: ادب اور زندگی کے حوالے سے'' کے عنوان سے ہے۔مجنوں گورکھپوری بحیثیت تنقید نگار کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ۔اس لیے شہناز نبی بغیر کسی تعارف وتمہید کے اپنے مضمون کا آغاز ان کے تنقیدی نظریے سے کرتی ہیں۔مجنوں گورکھپوری کے شروعاتی مضامین میں تاثرات کا اثر دیکھنے کوملتا ہے لیکن دھیرے دھیرے ان کا یہ تاثرات کب جمالیات کا روپ دھار لیتا ہے پتا ہی نہیں چلتا۔

مجنوں کے تین تنقیدی مضامین کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''تنقیدی حاشیے''، ''نقوش وافکار'' اور ''ادب اور زندگی'' ہیں۔شہناز نبی اپنے اس مضمون میں ''ادب اور زندگی'' کو موضوع بنایا ہے اور مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی معیارات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔اس میں کل 20 مضامین شامل ہیں شروع کے دو مضامین مجنوں گورکھپوری کے تعلق سے بعد کے مضامین میں ان کی تنقیدی مباحث کا نمونہ ہیں۔

شہناز نبی مجنوں کے اہم مضامین پر تبصرہ کرتی ہیں مثلاً ان کا مضمون ''تخلیق اور تنقید'' جس میں مجنوں گورکھپوری تخلیق اور تنقید کا رشتہ بتاتے ہیں اور دوں کی الگ الگ تعریفیں پیش کرتے ہیں۔اس وقت مجنوں پہلے ایسے تنقید نگار تھے جنھوں نے اس پر بحث چھیڑی تھی۔اس کے بعد وہ ان کے ایک اور مضمون ''ادب اور زندگی'' کی بات کرتی ہیں اور مجنوں کا ادب اور زندگی کا نظریہ پیش کرتی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ مجنوں کے نزدیک زندگی میں اگر تواریخ میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا وجود ہے تو یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کی بصیرت ہر ایک نقاد کے پاس ہونا ضروری ہے۔وہ ادب کو زندگی کے ہر شعبے کا رہنما مانتے ہیں۔اس لیے ادب ان کے یہاں تہذیب کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

''ادب اور زندگی'' یہ مضمون اپنی نوعیت کے بنا پر اس مجموعے کے تمام مضمون پر بھاری ہے۔اس مضمون میں مجنوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ انسان کے تہذیبی ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ادب اور زندگی کے رشتے پر بحث کی ہے۔مجنوں کسی بھی ادب پر تنقید کرتے وقت اس کے تخلیقی عہد کے ماحول وفضا کو بھی دھیان میں رکھ کر تنقید کرنے کی

ترغیب دیتے ہیں۔انھوں نے خود کئی ادیبوں پر مثلاً نظیر ہی کو لیجیئے ان پر تنقید کرتے وقت اس کے تخلیقی عہد کے ماحول کو نظر میں رکھے ہوئے تھے جس میں نظیر نے پرورش پائی تھی۔اس طرح وہ فنکاری کو بھی ایک فکریاتی حرکت مانتے ہیں ان کے مطابق فنکاری انسان کے اجتماعی جذبات وخیالات کی نمائندگی کرتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری ادیب اور اس کے فن پر گہری نظر رکھنے میں ماہر تھے۔یہاں تک کہ عصمت چغتائی کے فن پر بھی پہلے ان ہی کی نظر گئی تھی اور انھوں نے عصمت کے فن پر بے لاگ تبصرے کیے اور ان کے فن کو سراہا۔وہ ایک عورت کے ایسے بے اختیار اور بے دریغ افسانے لکھنے پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔

اس طرح شہناز نبی اس تنقیدی مضامین کے مجموعے کے تقریباً ہر مضمون پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے مجنوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرتی ہیں:۔

''مجنوں کے تقریباً تمام مضامین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ چاہے
موضوعات کے اعتبار سے وہ مختلف ہوں لیکن ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے
مجنوں کا طریقہ کار ایک ہی ہے وہ یہ کہ ادب زندگی سے کتنا قریب ہے۔'' 95

شہناز نبی اپنے اس مضمون میں مجنوں پر لگے اس الزام کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ مجنوں مارکسی خیالات کا پرچار کرتے ہیں لیکن ان کا ماننا ہے کہ مجنوں چاہے مارکسی ہوں یا جمالیاتی وہ اپنا ایک تنقیدی نظریہ رکھتے تھے اور اس پر قائم تھے اور یہی وجہ ہے کہ مجنوں کو بیسویں صدی کا اہم نقاد بننے سے کوئی روک نہیں سکا۔

ایک تنقید نگار کا دوسرے تنقید نگار کے نظریات ومعیارات پر تنقید کرنا مشکل کام ہے لیکن شہناز نبی نے بڑے ہی خوش اسلوبی سے اپنے مضمون کے ساتھ انصاف کیا ہے اور مجنوں کے ساتھ بھی۔اس طرح انھوں نے ادب میں مجنوں کے مقام ومرتبے کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے سبھی مضامین کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شہناز نبی نے اکثر ان لوگوں پر لکھا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ترقی پسند تحریک سے رہا ہے۔شروعات کے تین مضامین کو چھوڑ کر باقی تمام مضامین ترقی پسندوں کو اوپر ہے۔پریم چند، سجاد ظہیر، فیض، مخدوم، وامق، منٹو یہ ان شخصیتوں کے نام ہیں جنھیں ترقی پسند کے اہم ستون کہا جا سکتا ہے۔اس لیے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہناز نبی ترقی پسند تحریک اور اس کے ادیبوں وشاعروں پر اچھی گرفت رکھتی ہیں۔

الغرض ہم دیکھتے ہیں کہ اس کتاب کے تقریباً سبھی مضامین اپنے عنوانات اور موضوعات کے بنا پر عمدہ ہیں۔اس کتاب میں شہناز نبی کے بڑی ہستیوں پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں ایسے میں جب کہ ان لوگوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان تمام کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر قلم اٹھانا ایک مشکل کام تھا لیکن شہناز نبی نے اپنی عالمانہ اور ناقدانہ نظر سے موضوع کے ساتھ ساتھ ان ہستیوں کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے اور اس طرح سے ان کا تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ تنقیدی ادب میں ایک معیاری کتاب کہلانے کا حق دار بن گیا ہے۔

*****

حواشی:

1۔شہناز نبی،فورٹ ولیم کالج اورحسن اختلاط،ص 4

2۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 7

3۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 32

4۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 88

5۔ایضاً۔۔۔۔۔۔ص 96

6۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 102

7۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 103

8۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 105

9۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 107

10۔شہناز نبی،منشورات بنگالہ،ص 9

11۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 22

12۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 26

13۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 43

14۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 46

15۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 57

16۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 60

17۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 61

18۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 67

19۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 74

20۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 75

21۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 86

22۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 100

23۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 116

24۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 127

25۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 157

26۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 161

27۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 162

28۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 173

29۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 173

30۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 196

31۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 197

32۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 204

33۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 206

34۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 218

35۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 222

36۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 231

37۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 234

38۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص242

39۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 243

40۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 253

41۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 269

42۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 270

43۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 285

44۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 304

45۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 312

46۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 326

47۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 336

48۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 350

49۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 351

50۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 372

51۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 372

52۔شہناز نبی، کلام نساخ، ص 6

53۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 9

54۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 78

55۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 141

56۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 10

57۔شہناز نبی، تانیثی تنقید، ص 12

58۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 12

59۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 20

60۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 45

61۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 46

62۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص48

63۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 62

64۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص74

65۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 86

66۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 93

67۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 96

68۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 104

69۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 113

70۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 118

71۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 122

72۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 127

73۔شہناز نبی،فیمینیزم تاریخ وتنقید،ص 7

74۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 7

75۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 15

76۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 17

77۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 309

78۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 315

79۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 376

80۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 379

81۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 383

82۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 412

83۔علی احمد فاطمی،مشمولہ مضمون ماہنامہ سب رس، مارچ 2017،ص 9

84۔شہناز نبی،تنقیدی مطالعات، ص 9

85۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 10

86۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 57

87۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 89

88۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 106

89۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 109

90۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 116

91۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 122

92۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 139

93۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 142

94۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 147

95۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 159

باب چہارم: شہناز نبی بحیثیت ڈراما نگار

ادب اور زندگی کا باہمی رشتہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے بغیر اختلاف کے تسلیم کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ ادب اور زندگی کے اس ربط کے اظہار کے لیے ایسا فنکارانہ اسلوب ضروری ہے جس سے ہمارے احساس جمال کو تسکین مل سکے اور اسی تسکین کی طلب نے کئی ادبی اصناف کو جنم دیا جیسے داستان، ناول، افسانہ ،ڈراما وغیرہ۔

ڈراما اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے اور دیگر اصناف سے منفرد بھی۔ ڈراما دیگر اصناف سے منفرد ان معنوں میں ہے کہ ڈرامے پیش کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور دیگر اصناف پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اسی طرح دیگر اصناف کا تخاطب قاری ہوتا ہے اور ڈرامے کا ناظر یا سامع، دیگر اصناف میں پڑھنے والے کا ردعمل انفرادی ہوتا ہے جبکہ ڈرامے کا اجتماعی۔ یہ ساری خصوصیات ڈرامے کو دیگر اصناف سے الگ کرتی ہے۔ ارسطو کے کلیہ کے مطابق ''ڈراما الفاظ اور عمل دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔'' اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ڈراما اپنی انفرادیت کے بنا پر ادب اور زندگی میں ربط قائم رکھنے میں دیگر اصناف سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

ڈراما یونانی زبان کے لفظ ''ڈراؤ'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہے عمل یا کر کے دکھانا۔ اس کو نقل وحرکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زبان کی تعریف کے مطابق ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر مانا گیا ہے۔ عشرت رحمانی اس کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

> ''قدیم زمانے سے لے کر آج تک فنی اصطلاح میں ڈراما کا اطلاق اس صنف ادب پر ہوتا ہے جس کے الفاظ میں گفتار کی متحرک قوت اور کردار میں عمل اور ارادہ کی کیفیت موجود ہے۔'' 1

قابل غور بات یہ ہے کہ ڈراما محض اداکاروں کی ادائیگی اور عمل ہی کے ذریعے تکمیل نہیں پاتا بلکہ اس کے دیگر اہم جزو بھی ہیں جس میں وہ الفاظ بھی ہیں جو ڈراما نگار تحریر کرتا ہے یعنی ایک کامیاب ڈرامے کے لیے پلاٹ ،قصہ، اور اسلوب کی بھی شمولیت ضروری ہے لیکن قصے کی اہمیت اور الفاظ کی قوت کا احساس اس کی صحیح ادائیگی اور عمل

کے بغیر ممکن نہیں یعنی ڈراما کے لیے عمل لازمی ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ڈرامے کے اجزا ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔

ڈرامے کے تعلق سے ارسطو کا نام اہمیت کا حامل ہے اس نے ڈرامے کے چھ عناصر قائم کیے ہیں جس میں کہانی ،کردار، الفاظ، خیال، آرائش اور موسیقی کو شامل کیا تھا۔اس نے کہانی کے تسلسل اور روانی کو خاص اہمیت دی کیونکہ اس کے نزدیک ڈراما افعال اور اعمال کا پیکر تھا۔لیکن وقت کے تقاضے کے ساتھ ان عناصر میں کچھ تبدیلیاں آئیں اور آج جو ڈرامے ہمارے سامنے آتے ہیں اس کی تشکیل و تکمیل میں جن اجزا کی شمولیت ضروری ہیں وہ ہیں پلاٹ (موضوع یا کہانی کا مواد)، آغاز، کردار، مکالمہ، تسلسل یا کش مکش، تصادم، نقطۂ عروج، اور انجام۔ان ہی اجزا پر ڈرامے کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔اس میں اگر ایک بھی جز وکمزور ہو تو ڈراما بھی کمزور ہو جاتا ہے۔اس لیے ڈرامے کا فن دیگر اصناف کے مقابلے میں کافی مشکل ہوتا ہے۔

بات اگر اردو ڈرامے کی ابتدا کی، کی جائے تو اودھ شاہی دور میں اور خاص کر سلطان واجد علی شاہ کے دور میں شعر و نغمہ، رقص سرور کو خاص عروج حاصل ہوا۔اس دور میں نقالی، لیلائیں سنگیت، نوٹنکی، سوانگ کی محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں۔راس لیلا اور کرشن لیلا کی تمثیل اور اداکاری بھی شروع ہوئی۔اس کے ساز وسامان اور لباس کی تیاری پر لاکھوں روپئے خرچ کیے جاتے تھے۔دھیرے دھیرے ان مجالس کو باقاعدہ اسٹیج کیا جانے لگا اور اس کا نام 'رہس' رکھا گیا۔ان ہی 'رہس' کے ذریعے ڈرامے کی بنیاد پڑی۔

ان 'رہسوں' کی پیش کش سے متاثر ہو کر سلطان واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی ''افسانۂ عشق'' کو کچھ اسی طرز پر لکھا اور تمثیل کیا ہے جس کا حوالہ امانتؔ کی ''اندر سبھا'' میں ملتا ہے۔''افسانۂ عشق'' سے پہلے اردو ڈرامے کی کوئی نشانی یا ذکر نہیں ملتا ہے۔بعض ناقدوں نے اسے ہی اردو کا پہلا ڈراما تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ ابھی شک کے دائرے میں ہے کیونکہ اس کا کوئی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔واجد علی شاہ نے ایک رہس ''رادھا اور کنھیا'' لکھا تھا لیکن امانتؔ کی ''اندر سبھا'' جو 1260ھ، 1270ء میں لکھی گئی اور 1271 میں شائع ہوئی اس لحاظ سے یہ ''رادھا اور کنھیا'' سے پہلے کی پیش کش تسلیم کی جاتی ہے لیکن بعض محققین ''اندر سبھا'' کو ''افسانۂ عشق'' کے بعد کی تصنیف مانتے ہیں۔ان کے مطابق امانت نے ''افسانۂ عشق'' کے چرچے سن کر ہی ''اندر سبھا'' لکھی لیکن اس بات کی بھی کوئی مدلل تحقیق نہیں مل سکی ہے۔اردو کا پہلا ڈراما ''رادھا اور کنھیا'' ہے کہ ''اندر سبھا'' اس پر ضرور بحث ملتی ہے۔اس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ اردو ڈرامے کے آغاز میں واجد علی شاہ کی ایجاد پسندی اور فنی جدتوں کا بڑا دخل تھا اس کے رہس مکمل ڈراما نہ سہی لیکن اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ضرور ہیں۔ لہذا اردو ڈراما نگاری میں امانتؔ کی ''اندر سبھا'' کو ہی پہلا ناٹک یا منظوم ڈراما تسلیم کیا جاتا ہے اس طرح ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے۔

تھیئٹروں اور اسٹیج کے آغاز سے ڈرامے کو عروج حاصل ہوا۔ بنگال اور ممبئی کے تھیئٹر اور تھیئٹریکل کمپنیوں کے تحت ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے اس طرح اردو ڈراما مختلف مدارج طے کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اول الذکر ڈراما نگاروں میں واجد علی شاہ، امانت اللہ لکھنوی، نواب علی نفیس، شیخ پیر بخش، حکیم حسن مرزا برق، ماسٹر احمد حسین، مرزا ولی جان باقر وغیرہ کا نام اہمیت رکھتا ہے۔

1879 سے 1895 کا دور قدیم اردو ڈراما اور اسٹیج کا تجارتی یا ترقی کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں ڈرامے میں با قاعدگی اور ہمواری پیدا ہوئی۔ اس وقت کے ڈراما نگاروں میں رونق بنارسی کا نام اہمیت رکھتا ہے ان لوگوں نے ڈرامے کو ترقی دینے میں اہم رول ادا کیے۔

ڈرامے کی ترقی میں پارسی الفریڈ تھیئٹریکل کمپنی نے اہم رول ادا کیا۔ اس نے مغرب کے ڈراموں کی اعلیٰ مثالیں سامنے رکھ کر مستند ادیبوں کو ڈراما لکھنے کی طرف راغب کیا تا کہ اردو اسٹیج پر شعر وادب کے عمدہ نمونے پیش کیے جا سکے۔ اس کمپنی کے تحت ڈراما لکھنے والوں میں سید مہدی حسن احسنؔ لکھنوی، عبد الطیف شاد، پنڈت نرائن پرساد بیتاب بنارسی، سید عباس علی عباس، آغا محمد شاہ حشر کاشمیری، اصغر نظامی، میر غلام عباس، ماسٹر رحمت علی رحمت، آرزو لکھنوی، آغا شاعر قزلباش وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

اس کے بعد تھیئٹر کا زوال ہو جاتا ہے اور جدید ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کے ڈرامے میں فنی تکنیک اور ڈرامائی لوازم کو خاصا دخل تھا اس دور کے ڈراما نگاروں نے جدید اسٹیج کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ڈراما لکھا۔ اس میں سید امتیاز علی تاجؔ، حکیم احمد شجاع، جان احمد حسین خان، امراؤ علی، منشی دوار یکا پرساد افقؔ، اظہر دہلوی، جوالا پرساد برق، مرزا ہادی رسواؔ، پنڈت سدرشن کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ہم ڈراما کی تاریخ کے موضوع پر کسی کتاب کا مطالعہ کریں تو ہمیں بہت سارے ڈراما نگاروں کے نام مل جاتے ہیں لیکن ایک بات جس کو کمی کہہ لیں یا تشنگی وہ یہ کہ ان کتابوں میں تو مرد ڈراما نگاروں کی اچھی خاصی تفصیل مل جاتی ہے لیکن خواتین ڈراما نگاروں کے حوالے سے کوئی بھر پور مضمون نہیں ملتا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ

خواتین ڈراما نگاروں کی تعداد کم ہے مگر یہ تعداد جتنی کم ہے اس سے کم ان کا ذکر ملتا ہے۔ اگر ہم آزادی کے بعد سے اب تک کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں خواتین ڈراما نگاروں کی ایک اچھی خاصی تعداد نظر آئے گی جنھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے مثال کے طور پر چند نام یہ ہیں:۔ زہرہ بیگم، آمنہ نازلی، خدیجہ بیگم، صالحہ عابد حسین، صدیقہ بیگم، عصمت چغتائی، رشید جہاں، قدسیہ زیدی، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، شیلا بھاٹیہ، صادقہ نواب سحر وغیرہ۔

زہرہ بیگم نے 1920 میں اپنا ڈراما ''مال خاتون'' اپنی پہلی مرتبہ کتابی شکل میں شایع کیا۔ آمنہ نازلی بیگم کا ڈراموں کا مجموعہ 1944 میں ''دوشالہ'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں 13 ڈرامے ہیں۔ خدیجہ بیگم نے بھی کئی ڈرامے لکھے ہیں جن میں ''شاہجہاں''، ''گوتم بدھ''، ''راجہ دسرتھ''، ''نور جہاں'' جیسی شخصیتوں پر مبنی ان کے ڈرامے کافی مشہور ہوئے۔ صالحہ عابد حسین نے تقریباً آٹھ ڈرامے لکھے ہیں۔ ان ڈراموں میں ''سازِ ہستی''، ''امتحان''، ''مومن خان مومن''، ''الٹا درخت'' اور ''آنکھ کا ڈاکٹر'' ذکر کے قابل ہیں۔ صدیقہ بیگم نے بہت زیادہ ڈرامے تو تخلیق نہیں کیے ہیں لیکن ان کے دو ڈرامے مشہور ہوئے ہیں ''تصویر'' اور ''عربوں کے خیمے۔ یہ دونوں ڈرامے 1937 میں لکھے گئے ہیں۔ عصمت چغتائی کا نام اردو فکشن میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنے عہد کے چلن کے مطابق انھوں نے ناول اور افسانے کے ساتھ ساتھ صنف ڈراما نگاری میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کا پہلا ڈراما ''فسادی'' کے نام سے 1938 میں ماہنامہ 'ساقی' دہلی سے شائع ہوا۔ چونکہ عصمت چغتائی IPTA سے منسلک تھیں اس لیے انھوں نے کئی ڈرامے لکھے لیکن ان میں سے جو شہرت پا کر عرف عام میں مقبول ہوئے وہ ''دھانی بانکپن''، ''آدھی عورت''، ''آدھا خواب''، ''ایک قطرہ خون''، ''تین اناڑی''، ''جنگلی کبوتر'' اور ''بدن کی خوشبو'' ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''شیطان'' کے نام سے شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ترقی پسند خواتین قلم کاروں میں ایک اہم نام رشید جہاں کا ہے جنھوں نے نہ صرف افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی ہے بلکہ متعدد ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ''بچوں کا خون''، ''نفرت'' اور ''نئی تصویریں'' قابل غور ہیں۔

آزادی کے بعد جب ہندوستان میں ماڈرن تھئیٹر کا دور شروع ہوا تو اس وقت اردو ڈرامے کے ارتقا میں قدسیہ زیدی، زاہدہ زیدی، اور ساجدہ زیدی نے ایک کارہائے نمایاں رول ادا کیے۔ قدسیہ زیدی نے کئی ڈرامے

تخلیق کئے اور بالخصوص ترجمے پر زیادہ توجہ دی۔ ''آذر کا خواب''، ''شکنتلا''، ''گڑیا گھر''، ''مٹی کی گاڑی''، ''مدرا راکشش''، ''امراپلی'' ان کے اہم ترجمہ شدہ ڈرامے ہیں۔اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی زاہدہ زیدی بھی ہیں۔انھوں نے بھی کئی طبع زاد ڈراموں کو تخلیق کرنے کے ساتھ ترجمے بھی کیے ہیں خاص طور سے chekov کے کئی ڈراموں کا انھوں نے ترجمہ کیا جیسے ''چیری کا باغ''، ''تین بہنیں''، ''حبیب ماموں'' وغیرہ۔chekov کے علاوہ انھوں نے ایونیسکو، سیموئل بیکٹ اور ژاں پال سارتر کے ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔زاہدہ زیدی کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ ''دوسرا کمرہ'' 1990 میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ان کے طبع زاد ڈراموں میں ''کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز''، ''جنگل جلتا رہا'' اور ''صحرائے اعظم'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔زاہدہ زیدی کے بعد اردو ڈراما کو ترقی دینے میں ساجدہ زیدی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے بھی طبع زاد ڈرامے لکھنے کے ساتھ ساتھ دیگر ادیبوں کے ڈراموں کے ترجمے کیے ہیں۔ان کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ ''سرحد کوئی نہیں'' کے نام سے 1991 میں شائع ہوا اور ان کے تراجم شدہ ڈراموں کا مجموعہ ''چاروں موسم'' کے عنوان سے 1996 میں منظر عام پر آیا۔ان خواتین ڈراما نگاروں میں سے عصمت چغتائی، قدسیہ زیدی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی کے ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے ہیں اور لوگوں کے ذریعے کافی پسند بھی کئے گیے ہیں۔اردو ڈراما نگاری کی ترقی میں ایک نام صادقہ نواب سحر کا بھی ہے۔انھوں نے متعدد ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''مکھوٹوں کے درمیان'' 2012 میں شایع ہوا اور ادیبوں، ناقدوں کے ذریعے سراہا بھی گیا۔اس مجموعے میں دس ڈرامے شامل ہیں جو یہ ہیں:۔''دیا جلے ساری رات''، ''ظلم تو ظلم ہے''، ''اور گھنگھرو بجتے رہیں''، ''ڈاکٹر کفن پھاڑ''، ''تین دو پانچ''، ''میرج بیورو''، ''ڈسکو کالج ممبئی - 8''، ''سلطان محمود غزنوی''، ''با ادب با ملاحظہ ہوشیار''، ''خودکشی یا موت'' (انجام ہمیں معلوم نہ تھا) مہاراشٹریہ کی ایک ڈراما نگار نورالعین علی کے بھی کچھ ڈرامے شایع ہوئے ہیں۔حال ہی حال میں لکھا گیا یو۔پی کے ضلع الہ آباد سے تعلق رکھنے والی صالحہ صدیقی کا ایک ڈراما ''علامہ اقبال'' کافی چرچا میں ہے۔

یہاں تک تو ڈراما کسی نہ کسی طرح تھیئیٹر اور اسٹیج سے جڑا رہا۔اس کے بعد ادبی ڈرامے کا آغاز ہوا۔اس کے لکھنے والوں نے ڈرامے کے لیے تھیئیٹر کو ضروری نہیں سمجھا اور ڈرامے کو ایک ادبی صنف تصور کیا۔ادبی ڈراموں کے بعد ریڈیائی ڈرامے کا آغاز ہوا لیکن ڈراما کی وہ صورتحال نہ رہی جو تھیئیٹر کے وقت تھی۔دھیرے دھیرے ڈراما کی صنف اپنے عروج سے غروب کی طرف گامزن ہونے لگی۔

اگر چہ اردو ڈرامے کی شمع ماند پڑ چکی ہے لیکن ابھی پوری طرح سے بجھی نہیں ہے۔آج بھی ڈرامے لکھے جا رہے ہیں البتہ ان کی تعداد میں کمی ضرور آئی ہے۔ کچھ لوگ ابھی ہیں جو ڈراما اور ناظرین کے بیچ رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش کرنے والوں میں مرد حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین قلم کار بھی شامل ہیں۔ ڈراما اور ناضرین کے درمیان پیدا ہونے والی اس دوری کو ختم کرنے والوں میں ایک نام شہناز نبی کا بھی ہے۔ان کا تعلق سرزمین بنگال سے ہے اور بنگال کا تعلق اردو ڈرامے سے بہت ہی گہرا رہا ہے۔شاید یہی وجہ رہی ہو جو شہناز نبی سے ڈرامے کی موجودہ صورتحال دیکھی نہ گئی ہو۔وجہ کچھ بھی ہو شہناز نبی نے اردو ڈرامے کی روایت کی پاسداری کے لیے اور تھیئٹر کو زندہ رکھنے کے لیے صنف ڈراما نگاری کی طرف اپنی قلم کو موڑا۔اس طرح شہناز نبی نے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور اردو تھیئٹر کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

شہناز نبی کا شمار موجودہ خواتین قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔وہ ایک قابل استاد ،حقیقی شاعرہ، ذہین نقاد، پر مغز محقق، بہترین افسانہ نگار اور حقیقت پسند ڈراما نگار ہیں۔ان کے ڈراموں کے اب تک دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''بچوں کے ڈرامے'' کے عنوان سے 1989 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں جو کہ مختلف زبان میں لکھے گئے ترجمے ہیں۔ پہلا ڈراما ''بیمار کا دوست'' رابندرناتھ ٹیگور کا لکھا ہوا ہے، دوسرا ''حاسد'' سوکمار رائے کا، تیسرا ''مشکل آسان'' سونیرمل بوسو کا، چوتھا ''افواہ'' انا داشنکر رائے کا، پانچواں ''انجمن دخترِ لا پرواہ'' میہیر سین کا اور چھٹا ڈراما ''پرومیتھیوس کی سزا'' کے عنوان سے رودر پرساد چکروتی کا ہے جس کا اردو ترجمہ شہناز نبی نے اپنے اس مجموعے میں کیا ہے۔

شہناز نبی کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ''پہچان مجھے نادان'' کے عنوان سے 2016 میں سیاق پبلشرز سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ ان کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں جملہ 10 ڈرامے شامل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

1۔پہچان مجھے نادان

2۔شعلوں میں گھرا بچپن

3۔کاہے کو بیاہی بدیس

4۔لوٹ کے بدھو۔۔۔

5۔حسرت ان غنچوں پہ

6۔ہم ایک ہیں

7۔ ہر دم رواں ہے زندگی

8۔جنگل میں اسکول

9۔نمک کا داروغہ (پریم چند کے افسانے پر مبنی)

اس کے علاوہ ان کے کئی متفرق ڈرامے مختلف اخبار اور رسائل میں چھپ چکے ہیں لیکن ڈرامے کی دائمی اہمیت اس کے اسٹیج ہونے سے قائم ہوتی ہے اور شہناز نبی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے ڈرامے نہ صرف اسٹیج ہوئے ہیں بلکہ ناظرین کے ذریعے پسند بھی کیے گئے ہیں۔شہناز نبی نے اپنا ایک ڈرامے کے کرداروں کا گروپ بھی بنا رکھا ہے جس کا نام AWARE ہے۔اس گروپ کے بینر تلے ڈرامے مسلسل اسٹیج ہوتے رہتے ہیں۔ان کے ساتھ کام کرنے والوں میں نیلوفر نبی (ان کی چھوٹی بہن)، الماس شیخ، ندیم احمد، طیب نعمانی، فہیم اللہ صدیقی، نوشاد عالم، محمد گلزار، محمد راشد، محمد شاہنواز عالم، شکیل الرحمٰن، عطاء اللہ، آثار وغیرہ ان کے ناٹک کو اسٹیج کرنے میں اہم کرداروں کا رول ادا کرتے ہیں۔

شہناز نبی کو بچپن ہی سے ناٹک کھیلنے کا شوق تھا وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ شوق بھی پروان چڑھتا گیا۔کالج میں آغا حشر کا ڈرامہ ''صید ہوس'' اسٹیج کیا گیا تو اس میں انھوں نے ایک کردار کا رول نبھایا تھا۔درس وتدریس سے جڑنے کے بعد بحیثیت استاد ڈراما پڑھانے کے ساتھ ساتھ ڈرامے کروانے کی بھی ذمے داری کے فرائض کو بھی انجام دیا اس طرح ان کا ڈرامے سے ربط قائم رہا۔

شہناز نبی کے ڈرامے زیادہ تر سماجی وسیاسی واقعات وحالات پر مبنی ہیں۔تعلیم بالغاں، گھریلو تشدد، قومی یک جہتی، ماحولیات، مادری زبان میں تعلیم، بچوں کا جنسی استحصال، بچوں کے مسائل جیسے بچہ مزدوری وغیرہ ان کے ڈراموں کے مرکزی خیال رہے ہیں۔وہ ان سبھی مسائل کے پیدا ہونے والے وجوہات اور اس سے ہونے والے نقصانات سے لوگوں کو واقف کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔اپنے ڈراما نگاری کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

> ''میں نے ناٹک کی کوئی تعلیم نہیں لی۔میرے نزدیک وقت سب سے بڑا پرفارمر ہے۔میں نے جو بھی سیکھا ہے وہ وقت اور حالات سے سیکھا ہے۔''[2]

ڈراما نگاری ایک مشکل فن ہے کیونکہ ڈراما عملی طور پر دکھانے کے لیےلکھا جاتا ہےاس لیےاس کو لکھتے وقت کئی باتیں ذہن میں رکھنی پڑتی ہے۔اس میں سب سے پہلے وقت کا لحاظ رکھا جاتا ہے تا کہ ناظر یا سامع دیکھتے دیکھتے اکتا نہ جائے۔ایک اچھا ڈراما وہی مانا جاتا ہے جو دو یا تین گھنٹے میں ختم ہو جائے،دوسرا یہ کہ شروع سے لے کر آخر تک مختلف حصوں میں اتنی ہم آہنگی ہو کہ دیکھنے والوں کی دلچسپی اور توجہ میں کوئی فرق نہ آئے بلکہ ایک حصہ دیکھنے کے بعد آگے کے لیے تجسس برقرار رہے۔اس کے علاوہ فن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اچھے پلاٹ اور اچھی کردار نگاری کے سبھی لوازم پر ڈراما نگار کی نظر ہونی چاہیے۔ پلاٹ پیچیدہ ہونے کے بجائے سادہ اور حقیقت سے قریب تر ہونا چاہیے۔کرداروں میں نہ عمومیت ہونی چاہیےاور نہ ہی مثالیت بلکہ انفرادیت ہونی چاہیےاور یہ انفرادیت ان کی رفتار اور گفتار میں رچی ہونی چاہیے۔

غرض ایک ڈراما نگار کو پلاٹ،کردار اور نقطۂ نظر تینوں چیزوں کے تکنیکی اصولوں اور فنی لوازم کے تقاضے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر ایک کو نیا اسلوب دینا پڑتا ہے تا کہ ان سب کے درمیان ایک ربط پیدا ہو سکے چونکہ ڈراما نگار زندگی کے کسی نہ کسی مسئلے کو موضوع بناتا ہے جس کی حیثیت نزاعی ہوتی ہےاور خاص طور سے ایسے مسئلے ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے جس میں اختلاف،کش مکش اور تصادم کا عنصر نمایاں ہوتا ہےاور یہ تصادم نیکی و بدی،معاشرے کے برے رسم ورواج اور کبھی کبھی خود انسان کی ذات میں رونما ہوتا ہے۔ڈرامے میں تصادم اور کش مکش کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اسی کش مکش کی ابتدا اور انتہا کے بیچ واقعات کا اتار چڑھاؤ اور کرداروں کی حالتوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔واقعات کا اتار چڑھاؤ،کرداروں کا تعارف،واقعے کے لیے زمین ہموار کرنا ،واقعے کا دھیرے دھیرے آگے بڑھنا،واقعات کا ارتقا تیز تر،شدید تر،انتہا اور نقطۂ عروج تک پہنچنا اور پھر آہستہ آہستہ اور کبھی بڑی تیزی کے ساتھ خاتمے تک لانا ہی ڈراما نگار کی فنی چابک دستی کے امتحان اور آزمائش کی منزلیں ہوتی ہیں اوراسی پر ڈرامے کی کامیابی منحصر ہوتی ہے۔

ڈراما نگاری کے ان تمام فنی لوازم کو دیکھتے ہوئے کسی ڈراما نگار کے ڈرامے اور ادب میں اس کے مقام کو متعین کیا جاتا ہے۔شہناز نبی کے ڈرامے کہاں تک فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں اور بحیثیت ڈراما نگار وہ کتنی کامیاب رہی ہیں اس کے لیے مجھے ان کے ڈراموں کا فنی وتنقیدی جائزہ لینا ہوگا اس لیے میں اس باب میں ڈرامے کے تمام اجزائے ترکیبی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے ڈراموں کا فنی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

پلاٹ:۔

پلاٹ کو ڈراما نگاری میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ڈرامے کی زیادہ تر کامیابی کا دارومدار پلاٹ یا کہانی کے اصل موضوع پر ہوتا ہے۔اس لیے ڈرامے میں پلاٹ کا مضبوط اور مربوط ہونا ضروری ہے۔ایک ڈراما نگار کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ پلاٹ کے انتخاب کے وقت زندگی کے کسی پہلو یا واقعے کو سامنے رکھ کر جس پلاٹ کا بھی انتخاب کرے اس کی جزیات پر اس کی گرفت ہو۔اس کے لیے واقعات میں پاکیزگی، دلچسپی، جدت اور ندرت کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔عام زندگی کے سیدھے سادے واقعات ڈرامے کی دلچسپی اور کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔ پلاٹ تاریخی ہو یا معاشرتی یا کہ سماجی ہو یا سیاسی ہر صورت میں سادگی اور پرکاری کے حسن سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ پلاٹ کی سطح پر قصے میں صرف ربط ہی ضروری نہیں بلکہ اس میں کش مکش اور تصادم کا مادہ بھی موجود ہو تو یہ ڈرامے کی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے۔

شہناز نبی کے ڈراموں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے زیادہ تر ڈرامے سیاسی وسماجی واقعات وحادثات پر مبنی ملتے ہیں۔مثال کے طور پر تعلیم بالغاں، گھریلو تشدد، قومی یک جہتی، بچوں کے مسائل وغیرہ ان کے ڈراموں کے مرکزی خیال ہیں۔وہ ان سبھی مسائل کے نہ صرف وجود میں آنے کے وجوہات بتاتی ہیں بلکہ اس سے ہونے والے نقصانات کو بھی واقعات کے ذریعے اپنے ڈراموں میں پیش کرنے کی سعی کرتی ہیں۔

ان کے تقریباً سبھی ڈراموں کے واقعات میں ربط ہے۔ڈراما جیسا جیسا آگے بڑھتا ہے ناظرین وقارئین پر غور وفکر کے دروازے وا کرتا ہے۔انھوں نے اپنے ڈراموں میں خیالات کو اشاروں اور کنایوں میں کم سے کم الفاظ میں پیش کرنے کوشش کی ہے۔ان کے ڈراموں کو پڑھنے یا دیکھنے کے بعد قاری یا سامع ان میں پوشیدہ واقعات کی حیثیت اور در پردہ موجودہ عالمی دنیا کا عکس بآسانی دیکھ سکتا ہے۔اس طرح شہناز نبی نے سماجی و عالمی مسائل ،معاشرتی مسائل ،فلسفیانہ خیالات، سیاسی مسائل اور انسانی ذہن کے پیچ وخم کو کامیاب طریقے سے اپنے ڈراموں میں نمایاں کیا ہے جس سے ڈرامے کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔ان کے ڈراموں کے واقعات میں عصری زندگی کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

پلاٹ کے لحاظ سے شہناز نبی کا ڈراما ''پہچان مجھے نادان'' اہمیت کا حامل ہے۔اس ڈرامے کو انھوں نے چار

مناظر میں تقسیم کیا ہے۔اس کے کرداروں میں آتنک،ضعیف مرد،ضعیف مرد، پہلاشخص، دوسراشخص، بہت سارے نوجوان لڑکےلڑکیاں اور بچے ہیں۔ڈرامے کی کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک کالےلبادے میں ملبوس شخص اپنا چہرہ چھپائے ہوئے اسٹیج پر آتا ہے اور اپنا تعارف آتنک کے نام سے کرواتا ہے۔اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گھناؤنے کام کے بارے میں بھی بتاتا ہے کہ اس نے کس طرح انسان کے جان ومال کو نقصان پہنچایا ہے۔ضعیف مرد اور ضعیف عورت ان دونوں کرداروں کے ساتھ آتنک کی بحث ہوتی ہے اور وہ دونوں اس کی ملامت کرتے ہیں اور اسے اس دنیا سے دور چلے جانے کو کہتے ہیں اس پر آتنک کہتا ہے کہ آپ ہی میں سے کچھ لوگ ہیں جو مجھے پناہ دیتے ہیں۔پہلا اور دوسرا شخص کے کرداروں میں دوسرا شخص کا کردار منفی کردار ہے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک علامتی کردار ہے۔اس کے پس وپیش امریکہ کا چہرہ چھپا ہوا ہے جو پہلے دہشت پھیلاتا ہے اور پھر آتنک کو مٹانے کی بات کرتا ہے۔شہناز نبی نے اس ڈرامے کے ذریعہ امریکہ کے دورخی چہرے اوراس کی پالیسی کو بےنقاب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ڈرامہ'' کاہےکو بیاہی بدلیس''میں گھریلو زندگی میں عورت پر ہونے والے سماجی ومعاشرتی ظلم وجبر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ایک لڑکی کی شادی ہونے کے بعد اسے سسرال اور معاشرے میں کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی تصویر کشی ملتی ہے۔اس ڈرامے کے کرداروں میں حامد،ثمینہ، رفیق، چچاجان، بھولو، ماں اور کچھ عورتیں ولڑکے ہیں۔حامد ثمینہ کا شوہر ہے۔یہ شروع میں منفی کردار کے طور پر سامنے آتا ہےلیکن بعد میں اس کے اندر تبدیلی آتی ہے اور وہ ثمینہ کے لیئے اپنے چچاجان سے لڑپڑتا ہے۔ثمینہ ایک سگھڑ اور ایک اچھی بیوی کا کردار نبھاتی ہے۔رفیق حامد کا دوست ہے اور دنیا کی ساری خبر رکھتا ہے۔ساتھ ہی عورتوں کی آزادی اوران کے مساویانہ حقوق کی بات کرنے والا ایک مثالی کردار کے روپ میں نظر آتا ہے۔ماں کے کردار میں ایک بیمار ماں ہے جس کی تیمارداری کے لیے ثمینہ کو اکثر گھر جانا پڑتا ہے اور یہ بات اس کے سسرال والوں کو پسند نہیں آتی ہے۔چچا کا کردار سماج کے اس بزرگ کا کردار ہے جو پرانی روایتوں کی پاسداری کرنے والا عورتوں کی آزادی کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ان ہی کرداروں کے آپسی تصادم اور کشمکش سے ہی اس ڈرامے کا پلاٹ بنا ہوا ہے۔

ثمینہ اپنی بیمار ماں کی تیمارداری کے لیے اکثر اپنے گھر جاتی رہتی ہے جس پر حامد شروع میں لوگوں کی باتوں میں آکر اس کے کردار پر شک کرتا ہےلیکن بعد میں اپنے دوست رفیق کے سمجھانے پر ثمینہ کی اچھائی اوراس کا اپنی

بیمار کی خدمت کے جذبے کا قائل ہوجاتا ہے اور اس کے لیے پورے سماج سے لڑ پڑتا ہے۔ حامد ثمینہ سے بہت پیار کرتا ہے۔ اس کے چچا اور اس کی ماں ہمیشہ ثمینہ کے خلاف بولتے رہتے ہیں جس پر شروع میں وہ خاموش رہتا ہے لیکن آخر میں اس کا غصہ ان پر پھوٹ پڑتا ہے۔ وہ ثمینہ کے خلاف ایک بھی لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس طرح اس کے اندر کافی تبدیلی آتی ہے۔ ادھر چچا کا بیٹا سلیم اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا ہے جس پر حامد اور رفیق انھیں سمجھاتے ہیں اور گھریلو تشدد کے قانون کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اگر اس کی بیوی نے ان کے خلاف رپورٹ کردی تو انھیں جرمانہ بھرنے کے ساتھ ساتھ جیل بھی جانا پڑے گا جسے سن کر چچا خوف کے مارے بے ہوش ہوجاتا ہے۔

غرض پوری کہانی عورتوں پر ہورہے ظلم کی داستان ہے اس کے ساتھ ہی ایک پیغام بھی کہ اب جتنا ظلم سہنا تھا عورتیں سہہ چکی ہیں۔ آگے اب کبھی سسرال میں عزت کے نام پر، جہیز کے نام پر انھیں ستایا نہیں جاسکتا کیونکہ اس کے خلاف قانون بن گئے ہیں۔ اس طرح شہناز نبی اس ڈرامے کے ذریعہ ان لوگوں تک یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں جو عورت کو بے بس، لاچار اور کمزور سمجھتے ہیں۔

ڈرامہ ''لوٹ کے بدھو'' میں مادری زبان کی اہمیت کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ بدلتے وقت میں انگریزی زبان کے پیچھے بھاگنے والے لوگ اپنی مادری زبان اور مادری زبان میں تعلیم کو حقارت سے دیکھنے لگے ہیں اور یہ تصور کرتے ہیں ایسی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ شہناز نبی نے اس ڈرامے میں کچھ اسی طرح کی کہانی کو موضوع بناتی ہیں اور اردو زبان کے حوالے سے آخر میں یہ پیغام دیتی ہیں کہ اردو زبان کی تعلیم سے بھی ہمیں نوکری مل سکتی ہے۔ اردو زبان ایک پیاری اور کبھی نہ ختم ہونے والی زبان ہے۔

ڈراما ''ہم ایک ہیں'' قومی یک جہتی پر لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں گجرات میں ہونے والے اقلیتوں پر ظلم کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے کرداروں میں ادھیڑ عمر کا شخص گجرات میں ہونے والے فساد کا چشم دید گواہ ہے۔ اس دنگے میں اس نے اپنی جوان بیٹی کو کھو دیا تھا جس کی وجہ سے قومی یک جہتی پر سے اس کا بھروسہ اٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر کی عورت کے کردار میں اس کی بیوی ہے جو ہر ماں کی طرح اپنی بیٹی کو ہنستے مسکراتے سسرال میں بسنے کی تمنا رکھے ہوئی تھی لیکن عین شادی کے موقعے پر ہی فساد ہوجاتا ہے جس میں اس کی بیٹی غائب ہوجاتی ہے۔ تین نوجوان کے کردار وطن پرستی، قومی یک جہتی اور امن کے طلبگار ہیں اور ہر حال میں ملک میں امن کے خواہاں ہیں۔ رضیہ اور منوج مذہبی تفرقات کو بھول کر ایک اچھے دوست کے مثالی کردار میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

فساد کے موقعے پر منوج، رضیہ اور اس کے گھر والوں کی مدد کرتا ہے اور ان کی جان بچاتا ہے لیکن اس فساد کا ان پر اتنا گہرا اثر پڑتا ہے کہ وہ ملک کو چھوڑ کر امریکہ میں بس جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں دو کہانیاں ایک ہی ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ ڈرامے کا زیادہ تر حصہ ادھیڑ شخص اور تینوں نوجوانوں کی گفتگو پر منحصر ہے۔ تینوں نوجوان اپنے اپنے طریقے سے ادھیڑ شخص کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے۔ ہم فساد کے خلاف ہیں اور اس کے لیے لڑائی لڑیں گے اور ملک کے امن وامان کی حفاظت کریں گے کیونکہ ہندوستان کئی مذہب، ذات پات سے اوپر اٹھ کر سبھی کا ملک ہے اس کے ساتھ ہی ڈراما اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

شہناز نبی نے اپنے کئی ڈراموں میں بچوں اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں ڈراما ''جنگل میں اسکول'' اہمیت رکھتا ہے۔ اس ڈرامے کا پلاٹ یہ ہے کہ جنگل میں ایک اسکول کھولا جاتا ہے تو جانوروں میں گھوڑا، ہرن، مور، توتا، لومڑی، گدھا وغیرہ بہت خوش ہوتے ہیں کہ اب انھیں بھی پڑھنے کا موقع ملے گا۔ وہ سب اسکول میں نام لکھوانے جاتے ہیں تو سیار جا کر شیر کے کان بھرتا ہے کہ اگر جنگل کی جنتا پڑھ لکھ لے گی تو وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے لگے گی۔ اس سے آپ کمزور ہو جائیں گے۔ اس لیے شیر پہلے ان جانوروں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان کی ایکتا کے آگے ہار جاتا ہے۔ اس طرح تمام جانور پڑھنے کے لیے اسکول جانے لگتے ہیں۔

اگر ہم باریک بینی سے اس ڈرامے کا جائزہ لیں گے تو ہمیں یہاں 'جنگل' سماج کی مشابہ لگے گا اور 'شیر' حاکم کی صورت، 'سیار' اس کے چاپلوس اور دیگر جانور بچے کی شکل میں نظر آئیں گے۔ اس ڈرامے سے بچوں کو کئی سبق ملتے ہیں۔ اول برائی پر اچھائی کی جیت، دوم ایکتا میں طاقت، سوم تعلیم سبھی کمیوں اور خامیوں کو دور کرتی ہے۔ شہناز نبی اس پورے ڈرامے میں کھیل کے ذریعے بچوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ڈراما ''اٹھ جاگ مسافر'' بھی بچوں کے لیے ایک سبق آموز ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں ایک بادشاہ کو دکھایا گیا ہے جو برسوں تک سویا رہتا ہے۔ اسے ملک اور رعایا کی کوئی فکر نہیں رہتی جب اس کے ملک پر دشمن ملک حملہ کرتا ہے تو درباری بڑی مشکل سے اسے جگاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دشمن ملک نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ سن کر وہ تلوار لانے کو کہتا ہے جس پر اس کا وزیر جواب دیتا ہے کہ اب زمانہ بدل چکا ہے دنیا نے ترقی کر لی ہے تلوار کی جگہ بموں نے لے لی ہے۔ وہ تو برسوں تک سویا رہتا ہے جس کی وجہ یہ نام اور اس کے استعمال کے طریقے سب کچھ نئے لگتے ہیں وہ

حیرت سے ان سب کے متعلق پوچھتا ہے۔اس ڈرامے سے بچوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ غفلت میں پڑے رہنا ایک لعنت ہے اور یہ ہم سے کئی نعمتیں اور راحتیں چھین لیتی ہے۔شہناز نبی بچوں کو متحرک دیکھنا چاہتی ہیں اور ساتھ ہی ملک کی ترقی بھی چاہتی ہیں اوراس ڈرامے کی کہانی کے ذریعہ یہی بتانے کی کوشش کرتی ہیں۔اس ڈرامے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں شہناز نبی نے فارس کامیڈی کو اپنایا گیا ہے۔فارس کامیڈی میں بات یا گفتگو تیز تیز اور جلدی جلدی کی جاتی ہے تاکہ دیکھنے والے یہ اندازہ نہ لگا سکیں کہ مکالمہ پرظرافت ہے یا نامعقول۔فارس کامیڈی لکھنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ زراسی بے توجہی سے ڈرامے میں مصنوعی پن پیدا ہوجاتا ہے لیکن شہناز نبی نے اسے کامیابی کے ساتھ اس ڈرامے میں پیش کیا ہے۔

شہناز نبی نے نہ صرف بچوں کے لیے سبق آموز ڈرامے لکھے ہیں بلکہ بچوں کے مسائل کو بھی اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے۔یہ وہ مسائل ہیں جو ہمارے سماج کو داغدار بناتے ہیں۔اتنی ترقی کر لینے کے بعد بھی آج بھی ہمارے سماج میں child abuse اور child labour ایک عام سی بات ہے۔یہ دونوں موضوعات بڑے ہی نازک ہیں۔ڈراما ''شعلوں میں گھرا بچپن'' child labour کے خلاف سخت احتجاج دیکھنے کو ملتا ہے۔جس عمر میں بچوں کے ہاتھ میں قلم ہونی چاہیے اس عمر میں وہ مزدوری کرتے ہیں اس طرح اپنے پاپی پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے انھیں مزدوری کے شعلوں میں جھلسنا پڑتا ہے۔اس ڈرامے کے مرکزی کردار چھوٹو اوراس کی بہن چمیلی ہے۔بچپن ہی میں ان کی ماں کا انتقال ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے چمیلی اپنی پڑھائی چھوڑ کر گھر گھر جا کر کام کرتی ہے تاکہ اس کا بھائی چھوٹو پڑھ سکے لیکن اس کے گاؤں کے زیادہ تر بچے مزدوری کرتے ہیں اس لیے چھوٹو بھی ضد کر کے مزدوری کرنے لگتا ہے اور آخر کار کارخانے میں آگ لگ جانے کی وجہ سے مرجاتا ہے۔اس کی بہن چمیلی انصاف کے لیے در بدر بھٹکتی پھرتی ہے لیکن اس کی سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔اس طرح یہ ڈراما سماج کے سامنے سوال قائم کرتا ہے کہ بچوں کی مزدوری کے خلاف قانون بننے کے بعد بھی اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے لیکن اس کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھاتا ہے۔یہ ہمارے سماج کا ایک المیہ ہے۔

ڈراما ''حسرت ان غنچوں پہ'' child abuse کی بڑی دردناک تصویر پیش کرتا ہے۔اس ڈرامے میں ایک چارسال کی معصوم بچی سونی کے ساتھ محلے کا ایک درندہ صفت انسان زبردستی اس کے منھ پر ربن باندھ کر اس کا جنسی استحصال کرتا ہے۔اس آبروریزی کا اس بچی کے ذہن ودل پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ جب اس کا باپ نیم بے ہوشی کی

حالت میں اس کو چھوتا ہے تو وہ کہہ اٹھتی ہے:۔

"مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔مجھے چھوڑ دو۔۔۔آہ!میرا ربن۔۔۔اماں میرا ربن۔۔۔۔میرے منہ پر ربن مت باندھو۔"3

ایسا کربناک منظر ہمیں منٹو کا افسانہ "کھول دو" کی یاد دلاتا ہے اور ہمارے ذہن ودل کو کچوکے لگاتا ہے۔

اس طرح شہناز نبی کے ڈراموں کو پڑھنے یا دیکھنے کے بعد یہ پتا چلتا ہے کہ ان کے تقریباً سبھی ڈراموں کے پلاٹ، اس کی ترتیب اور مختلف اجزا میں ربط اور آہنگی ہے۔اپنے پلاٹ کو مرتب کرتے وقت انھوں نے ایسا ایک بھی لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس سے کہ پلاٹ کو آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ آئے یا یہ کہ واقعات اور کردار کی وضاحت نہ ہوسکے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ ہر منظر کے اختتام پر کچھ ایسا ہو کہ قاری اور سامع کا تجسس برقرار رہے اور وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو کہ آگے کیا ہوگا اور اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی دکھائی دیتی ہیں۔موضوع اور مضمون کے حوالے سے بھی ان کے ڈرامے اہمیت کے حامل ہیں۔وہ واقعے کی پیش کش ،آغاز سے انجام تک ناظرین کے تجسس کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں اور یہ اچھے ڈراما اور ڈراما نگار کی خوبی مانی جاتی ہے۔

آغاز:

ادب کی چاہے کوئی بھی صنف کیوں نہ ہو اگر وہ آغاز ہی میں قاری یا سامع کی دلچسپی کی وجہ نہ بن سکے تو وہ کامیاب نہیں کہلائے گی۔ڈرامے میں واقعے کا جاذب ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ قاری اور ناظرین کو باندھے رکھے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ ڈراما اپنے آغاز ہی سے تماشائیوں کا مرکز بنا رہے تاکہ ڈراما نگار یا ہدایت کار کو اس کو مسلسل بلندی اور نقطۂ عروج تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔کہا جاتا ہے کہ ڈرامے کا آغاز موسیقار کی پہلی دھن کی طرح ہوتا ہے جسے وہ بڑی آہستگی سے چھیڑتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ تیز اور تیز تر کرتا ہے۔ڈرامے میں ڈراما نگار کے لیے بھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ڈرامے کا آغاز پر کیف، باوقار اور دلچسپ انداز سے کرے تاکہ اسے انجام تک پہنچانے میں کسی مشکل یا دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کا آغاز اس طرح کرے کہ پردہ اٹھتے ہی تماشائی اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ڈرامے کے آغاز

کے تعلق سے عشرت رحمانی لکھتے ہیں:۔

''آغاز اس طرح موزوں اور مرعوب و پسندیدہ ہو کہ صحیح مقصد کے حصول میں کامیاب ثابت ہو سکے اور پھر اتنا مناسب ہو کہ رفتہ رفتہ ترقی کے لیے ضروری منازل طے کرنے میں سہولت رہے اور حسن وخوبی کے ساتھ سرانجام پائے۔''4

ڈرامے کے آغاز کی اس تعریف وتشریح کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی کے ڈراموں کے آغاز بھی دلچسپ ہیں۔ان کے ڈرامے اپنے آغاز ہی سے قاری کو باندھے رکھنے کی قوت رکھتے ہیں۔عمدہ اسلوب بیان اور سب سے خاص یہ کہ جس تجسس کی ڈرامے کو ضرورت ہوتی ہے وہ اپنے ڈراموں میں برقرار رکھنے میں کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔مثال کے طور پر ڈراما ''پہچان مجھے نادان'' کا آغاز دیکھیے:۔

''(اسٹیج پر اندھیرا۔بیک گراؤنڈ میں دہشت ناک موسیقی۔آتنک اسپاٹ لائٹ میں ایک بڑا سیاہ لبادہ پہنے داخل ہوتا ہے۔اس کا چہرہ آدھا کھلا اور آدھا ڈھکا ہے۔وہ اپنے کالے لبادے کی لمبی آستینوں (یا چادر) کو جھٹک جھٹک کر کبھی اپنا منھ دکھاتا ہے اور چھپاتا ہے۔یہاں آتنک تانڈو کرتے ہوئے بھی داخل ہوسکتا ہے۔)

آتنک: (ناظرین سے) مجھے پہچانو۔خوب غور سے دیکھو۔(اپنا چہرہ کبھی دائیں موڑتا ہے کبھی بائیں موڑتا ہے۔روشنی آدھے چہرے پر) میں کون ہوں۔کیا میرے خدوخال دیکھ کر تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کون ہوں۔کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں کس ملک کا باشندہ ہوں؟ کس دیس سے آیا ہوں۔میرا جنم کہاں ہوا؟ میں کس تاریخ، مہینے میں پیدا ہوا، کس سال کو پیدا ہوا (قہقہہ لگاتا ہے)۔

اندازاً اس وقت میری عمر کیا ہے؟ (چڑھانے والے انداز میں) نہیں بتا سکتے نا! بتاؤ گے بھی تو کیسے۔میں غیر محسوس طور پر تمہارے درمیان چپکے سے آ گیا ہوں۔تمھیں اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی ہوگی کہ میں کیسے دھیرے دھیرے تمھاری روزمرہ زندگی کا حصہ بنتا جارہا ہوں۔میری تعریف وتاریخ سے ناواقف ہو تم۔میری پہچان بتانے سے قاصر ہو۔بس اتنا جان لو کہ میں خوف کا جنم داتا

ہوں۔ میں آتا ہوں تو میرے ساتھ آتی ہے تباہی و بربادی۔''5

اس ڈرامے کے آغاز میں شہناز نبی ایسے ماحول وفضا کو ہموار کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ آتنک کی خصلت کے مناسب سے ماحول ہو اس کے ساتھ ہی اس کا لباس اور اس کے بولنے کا انداز اور اس کے مکالمے ناظرین کو اس کی طرف متوجہ کرانے میں کامیاب رہتا ہے ۔اسی طرح ڈراما ''ہم ایک ہیں'' کا آغاز بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔دیکھیے :

''(اسٹیج پر موسیقی ۔نوجوانوں کا ایک مشہور فلمی گیت گاتے ہوئے اور ناچتے ہوئے داخل ہونا)

یہ دیش ہے ویر جوانوں کا ،البیلوں کا،مستانوں کا
اس دیش کے یاروں کا کیا کہنا ،یہ دیش ہے دنیا کا گہنا
یہاں گاتے ہیں رانجھے مستی میں،
مچتی ہیں دھومیں بستی میں۔۔۔

(ایک ادھیڑ عمر کا شخص، پاگلوں کی سی حالت میں اسٹیج پر داخل ہوتا ہے۔اس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔سر پر نقش و نگار والی ٹوپی)

ادھیڑ شخص: (جنونی انداز میں کہتا ہے)
جھوٹ۔۔ بالکل جھوٹ۔۔۔سفید جھوٹ۔

نوجوان: (گاتے گاتے ٹھٹھک جاتے ہیں۔ہم آواز ہو کر پوچھتے ہیں) جھوٹ۔۔۔؟ کیا جھوٹ ہے بھئی۔۔۔؟

پہلا نوجوان: کس کو جھوٹا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟

ادھیڑ شخص: تم جھوٹے، تمھارا شاعر جھوٹا۔۔۔یہ گانا جھوٹا

پہلا نوجوان: اس میں جھوٹ میں کیا ہے آخر۔۔۔؟'' 6

اس ڈرامے کا آغاز میں پہلے تو دیش بھگتی گیت پر اہل وطن کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔اس کے بعد بوڑھے شخص کا داخل ہونا اور اس کی جو حالت ہوتی ہے وہ ناظرین کو اس کے متعلق جاننے کے لیے اکساتی ہے اتنا ہی نہیں اس

بوڑھے کا گاتے ہوئے نوجوانوں کا ٹوکنا، انھیں اور اس گانے کو اس طرح جھوٹا کہنا قاری اور ناظرین کو اس کے آگے کی کہانی جاننے کے لیے تجسس میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ڈراما ''جنگ میں اسکول'' بچوں کے لیے لکھا گیا ڈراما ہے۔ اس لحاظ سے شہناز نبی نے اسٹیج کی سجاوٹ اور اس کے آغاز کا بھی خاص خیال رکھا ہے تا کہ بچے کی دلچسپی ڈرامے کے آغاز ہی سے بنی رہے۔ دیکھیے:

(اسٹیج پر کاغذی درخت وغیرہ لگا کر جنگل کا منظر بنایا گیا ہے۔ طوطا، گدھا اور گھوڑا آس پاس بیٹھے ہیں۔ مور اور ہرن دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور ہم آواز کہتے ہیں۔)

مور اور ہرن: (آواز میں خوشی اور جوش) ارے بھئی کچھ سنا تم لوگوں نے؟

گدھا: کیا؟

مور: (پروں کو نچاتے ہوئے) آہا۔ہا۔ جنگل میں اسکول کھلا ہے۔

گھوڑا: (چونک کر) اسکول؟ اور جنگل میں؟

ہرن: ہاں بھئی۔ وہ اپنے سارس بھئیا ہیں نا۔ ان ہی کا اسکول ہے۔ آج صبح صبح اپنے کئی ساتھی وہاں داخلہ لینے گئے ہیں۔

لومڑی: (حقارت سے منھ بنا کر) اونہہ -- اسکول -- اور جنگل میں۔

گھوڑا: (لہجے میں اشتیاق) سچ کہہ رہے ہو؟ جنگ میں اسکول کھلا ہے؟

طوطا: مجھے بھی یقین نہیں آتا۔ کیا واقعی۔۔۔؟ 7

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی نے اپنے ڈراموں کے آغاز میں اسٹیج کی سجاوٹ اور موسیقی کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے اکثر ڈراموں کی شروعات ہی تجسس سے ہوتی ہے اور وہ سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے

ڈراموں کا آغاز کرتی ہیں تاکہ سامعین اور ناظرین کی تمام تر توجہ وہ ڈرامے کی طرف مرکوز ہوسکے۔

کردارنگاری:

ایک اچھے ڈرامے کے لیے اس کے پلاٹ اور قصے کی جتنی اہمیت ہوتی ہے ویسے ہی قصے کی کامیابی کے لیے کردار کا اہم ہونا بھی ضروری ہے۔کرداروں کی آپسی گفتگو اور حرکت وعمل سے ان کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے ۔کردار اپنی گفتگو اور عمل سے پلاٹ کے پوشیدہ حصوں کی تکمیل کرتے ہیں اور اس طرح کہانی کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔چونکہ ڈراما نگار کو سامنے آنے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے وہ ان کرداروں کے ذریعے ہی اپنی بات پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ان کی گفتگو اور عمل ہی ناظرین کی توجہ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔کرداروں ہی کی وجہ سے پلاٹ اور قصے کی ابتدا،عروج اور خاتمے میں ربط،تسلسل اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور یہی وجہ ناظرین کی دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔ڈرامے میں کرداروں کی اہمیت کے تعلق سے وقار عظیم لکھتے ہیں:۔

> ”ڈرامے کی عظمت کا اندازہ واقعات کی دلکشی اور ان کے انوکھے پن سے نہیں بلکہ کرداروں کی عظمت وشکوہ یا ان کی ناقابل فراموش انفرادیت سے لگاتے ہیں ۔کوئی اچھا ڈراما دیکھ چکنے کے بعد دیکھنے والوں کے ذہن پر واقعات کی شدت ،اہمیت یا دلچسپی کا نہیں بلکہ ایک یا ایک سے زیادہ کرداروں کی انفرادی شخصیت کا نقش قائم ہوتا ہے اور وہ ان میں سے بعض کی باتوں کو مدتوں اس طرح یاد رکھتے ہیں جیسے ہم کسی غیر معمولی شخص سے ملنے کے بعد مدتوں اور بعض اوقات ہمیشہ اسے یاد رکھتے ہیں۔“8

عام طور سے ڈرامے میں تین طرح کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔پہلے وہ جن کا ڈرامے کے عمل سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔یہ نہ صرف کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ اس کے مقصد میں زندگی کا رنگ وآہنگ بھی پیدا کرتے ہیں۔دوسرے وہ کردار ہوتے ہیں جس کے مقابل میں آکر اصل کردار کی شخصیت اور زیادہ نکھرتی ہے اور مؤثر بنتی ہے۔اور باقی کے کرداروں سے صرف کہانی کی فنی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ان کی مدد سے مرکزی کردار کی سیرت کے بعض گوشے سامنے آتے ہیں یا کبھی کبھی ان کی ماضی کے بعض ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جن کے ذکر کے بغیر اس کردار کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

کردار جب اسٹیج پر آتے ہیں تو وہ اکثر کسی نہ کسی کش مکش میں مبتلا رہتے ہیں اور یہی کش مکش اس کے اور ناظرین کے درمیان یگانگت کا رشتہ بناتی ہے۔ایک ڈراما نگار کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کردار کی اس کش مکش کو کس طریقے سے پیش کرے اور کرداروں کو کس طرح سے اسٹیج پر لائے کہ وہ حقیقی صورت اختیار کر لے یہی ڈراما نگاری کے فن کا تقاضا ہے۔

ڈراما نگار کے لیے کردار نگاری ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔وہ اپنے ڈرامے کے لیے کردار کی تخلیق اور جستجو کرتے وقت اپنی آنکھوں سے بھی کام لیتا ہے اور دماغ سے بھی۔اس کا تصور اپنے کردار کو جیتا جاگتا چلتا پھرتا دیکھتا ہے۔وہ اسے عمل اور ردعمل سے گذارتا ہے اور کردار اسی صورت میں دلچسپ بن سکتے ہیں جب اسے بہت سے واقعات میں سے گذرتا ہوا یا بہت سے موقعوں پر عمل کرتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔عمل اور عملی زندگی سے گہرا تعلق ہی اسے حقیقی اور اہم بناتا ہے۔

کردار نگاری میں موقع محل کی موزونیت کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہر کردار اپنے مرتبہ اور ماحول کی مناسبت سے گفتگو کریں اور اس کے لیے اسلوب بیان کا حقیقت سے قریب تر ہونا ضروری ہے۔اس لحاظ سے ہمیں شہناز نبی کا ڈراموں کے کردار حقیقت سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ہمیں ان کے یہاں منفی اور مثبت کرداروں کے ساتھ علامتی کردار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ڈراما ''پہچان مجھے نادان'' دونوں طرح کے کردار دیکھے جاسکتے ہیں۔

''پہلا شخص: (اسٹیج پر آتے ہوئے) کون چیخ رہا ہے۔۔یہ کس کی غراہٹ ہے۔۔۔؟

دوسرا شخص: (اپنے طور سے ڈھونڈتے ہوئے) کہاں گیا وہ۔۔۔؟ کہاں گیا۔۔۔؟

پہلا شخص: (دوسرے سے مخاطب ہو کر) تم جانتے ہو اسے؟

دوسرا شخص: ہاں۔۔۔آتنک نام ہے اس کا۔۔۔دہشت terror---

پہلا شخص: تمھیں کیسے پتہ۔۔۔؟

دوسرا شخص: تم نے سنا نہیں ۔۔۔ چیخ چیخ کر اپنا نام بتا رہا تھا (نقل اتارتے ہوئے) آتنک ہوں میں ۔ آتنک ۔ مجھ سے چھٹکارا آسان نہیں ۔ ویسے وہ نہ بھی بتاتا تو کیا فرق پڑتا ۔ بہت دنوں سے جانتا ہوں اسے ۔

پہلا شخص: اچھا ۔۔ تمھارا کوئی اپنا ہے ۔۔۔ ؟

دوسرا شخص: اپنا ۔۔ ؟ ۔۔۔ نہیں تو ۔۔ لیکن کسی کو اپنا بنانے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے؟ میں جانتا ہوں کی آتنک کو کب، کتنا اور کہاں استعمال کرنا چاہیے ۔

پہلا: کیا مطلب؟

دوسرا: مطلب یہ کہ دنیا کے ہر ملک میں آتنک کو آزمانے کی ضرورت ہے ۔ جب کوئی ملک ترقی کر رہا ہو، آگے بڑھ رہا ہو، دنیا کی بڑی طاقتوں یعنی سپر پاورز سے ٹکر لینے کی جسارت کر رہا ہو تو اسے خواہ مخواہ کی باتوں میں الجھا دینا چاہیے ۔

پہلا: کیسے ۔۔۔ ؟

دوسرا: عالمی امن کے نام پر اس کی ملک کی تلاشی لو ۔ اسے انسان اور انسانیت دشمن بموں کا ذخیرہ ثابت کر دو ۔ اس کی سرزمین پر اپنی فوج اتار دو ۔ اس کی بستیاں اجاڑ دو ۔ شہروں کو تاراج کر دو ۔ اسکولوں اور کالجوں کو مسمار کر دو ۔ اس دیس کا سارا آسمان اینٹی ایئر کرافٹ

کی آواز سے چھا جائے۔اس کی زمین توپوں
کی گھڑگھڑاہٹ سے تھرا جائے (منھ سے
آواز نکالتا ہے) ڈھ۔۔۔ڈھ۔۔۔ڈھیشم
۔۔ڈیشم۔۔

پہلا: لیکن۔۔۔(خوف سے ہکلاتا ہے) بہت
غلط ہے۔یہ سراسر زیادتی ہے۔

دوسرا: (ہنستے ہوئے) "everything is fair
in love and war"

اس ڈرامے میں شہناز نبی نے پہلے اور دوسرے کردار کے ذریعے ہمیں منفی اور مثبت فکر رکھنے والے کرداروں سے متعارف کرواتی ہیں۔دراصل ان میں دوسرا کردار ایک علامتی کردار ہے وہ امریکہ کی علامت ہے۔شہناز نبی اس کردار کے ذریعہ امریکہ کو چہرہ بے نقاب کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ امریکہ کے ذہن میں اپنے مفاد کے لیے ،اقتدار اور دولت کے لیے، کس طرح کے سطحی اور ظالمانہ خیالات پنپتے رہتے ہیں۔اور وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی بھی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا ہے۔اس طرح امریکہ کی دورخی پالیسی اور اس کا اصل چہرہ اس کردار کے ذریعے بے نقاب ہوتا ہے۔

ڈراما ''شعلوں میں گھرا بچپن'' میں چھوٹو اور چمیلی بھائی بہن کے کردار میں نظر آتے ہیں۔ان کے والدین کا بچپن ہی میں انتقال ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بہن گھر گھر جا کر جھاڑو پونچھا کرتی ہوں تاکہ اپنا اور اپنے بھائی کا پیٹ پال سکے۔اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بھائی لکھ کر بڑا آدمی بن جائے اس کے لیے وہ اپنے کام کو اور بڑھا دیتی ہے۔اس طرح وہ ایک بہن کے ساتھ ساتھ والدین کا بھی فرض نبھاتی ہے۔وہیں دوسری طرف اس کا بھائی پڑھائی چھوڑ کر مزدوری کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی بہن کا کچھ ہاتھ بٹا سکے۔بہن بھائی کے یہ کردار حقیقی رشتوں کی آپسی محبت کو پیش کرتا ہے۔

''چمیلی: چھوٹو، ارے او چھوٹو!

چھوٹو: (دوڑ کر آتا ہے) کیا ہے آپا؟

چمیلی: یہ تیرے فیس کے روپئے ہیں۔کل ماسٹر

صاحب کو دے دیجیو۔

چھوٹو: لیکن آپا۔۔۔

چمیلی: لیکن کیا؟

چھوٹو: میں اسکول نہیں جاؤں گا۔

چمیلی: پاگل ہوا ہے کیا؟ ہیں۔۔۔بول بول۔۔۔

(اسے گدگداتی ہے پھر ہاتھ پکڑ کر چک
پھیریاں لیتی ہے اور گاتی ہے)

میرا بھیا پڑھ لکھ کر آفیسر بنے گا۔
ٹھاٹ باٹ سے اونچے بنگلے میں رہے گا
چاند سی دلہن ڈھونڈ کر اک دن میں لے آؤں گی
راجا بھیا کے بچوں کو گود کھلاؤں گی

چھوٹو: (ہاتھ جھٹک کر)
آپا! میں اسکول نہیں جاؤں گا۔

چمیلی: کیوں۔۔۔اسکول کیوں نہیں جائے گا؟

چھوٹو: سارے بچے کچھ نہ کچھ کام کرتے ہیں۔۔
روپئے کماتے ہیں۔۔۔میں بھی کام کروں گا

چمیلی: کام کرے گا؟ (حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر)
کارخانے جائے گا؟ کون سا کارخانہ؟۔۔۔
چپل کا کارخانہ۔۔۔کیلیں ٹھونکیں گا۔۔۔تلے
کاٹے گا۔۔۔لوشن چپکائے گا یا گیراج میں تیل سے تر بتر
کپڑا پہنے موٹر کے پارٹس پہنچاننے کی کوشش کرے گا یا ہوٹل
میں برتن دھوئے گا۔۔۔؟

چھوٹو: سارے لڑکے۔۔۔

چمیلی: کون سارے لڑکے۔۔۔وہ جن کے گھر

کمانے والا کوئی نہیں۔۔۔لیکن میں تو ہوں نا
تیرے لیے!

چھوٹو: نہیں آپا! میں کارخانے جاؤں گا اور مزدوری
کروں گا۔

چمیلی: تجھے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا ہے چھوٹو!10ـ

ڈراما ''کاہے کو بیاہی بدیس'' میں ثمینہ، چچا اور حامد کا کردار اہم ہے۔یہ تینوں کردار ہمارے معاشرتی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔گھروں میں، سماج میں آئے دن ایسے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ تینوں کردار اپنے اپنے عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ثمینہ ایک سگھڑ بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ گھر کے مالی حالت میں بھی اپنے شوہر کا تعاون کرنا چاہتی ہے۔وہ باہر نکل کر کام کرنا چاہتی ہے۔حامد ایک نوجوان شوہر کا کردار ہے جو بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کی آگہی رکھتا ہے تو وہیں چچا کا کردار پرانے خیالات کا مالک، عورتوں کی آزادی اور اس کے گھر سے باہر نکلنے پر برا ماننے والا ہے۔اس کے نزدیک عورت کی حیثیت گائے بھینس کی سی ہے۔تینوں کردار کو دیکھیئے:۔

''حامد: چچا جان۔اندر آجایئے۔

چچا: (داخل ہوتے ہوئے) کیسی ہو ثمینہ بیٹا۔۔۔
کس بات پہ بحث ہو رہی تھی حامد سے

ثمینہ: جی۔۔۔وہ میں کہہ رہی تھی کہ گھر کے کام کاج
سے فرصت ملنے کے بعد سارا وقت بیکار ہی جا
تا ہے۔کیوں نا میں اس وقت کا صحیح استعمال
کروں اور۔۔۔

چچا: کیا کرنا چاہتی ہو۔۔۔

ثمینہ: کوئی روزگار۔۔

چچا: (بوکھلا کر کھانسنے لگتا ہے) لاحول ولاقوۃ۔۔
توبہ۔۔۔توبہ خاندان کی ناک کٹواؤ گی کیا۔

۔۔۔؟ لوگ کیا سوچیں گے۔۔۔آج
میرے بھائی جان مرحوم زندہ ہوتے تو کیا وہ
تمھیں اس کی اجازت دیتے۔۔۔؟ اور حامد
تجھے کیا ہوگیا ہے۔۔۔ بالکل بولا گیا ہے کیا؟

حامد: چچا جان۔۔۔ وہ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔

چچا: اب تو بات بہت دور تک جا پہنچی ہے۔

حامد: ابھی تو میں نے۔۔۔

چچا: تو کر ہی کیا سکتا ہے۔؟ تیرے آزاد خیال
دوستوں نے تو تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ بنا
سوچے سمجھے کہہ دے گا کہ جاؤ، جو جی میں آئے کرو۔

ثمینہ: اللہ نے مجھے کام کرنے کے لیے دو ہاتھ دیے
ہیں۔ اگر ان کا بھرپور استعمال کروں تو غلط کیا
ہے۔

چچا: جب عورتیں، مردوں کو کما کر کھلانے لگیں گی تو
پھر حکم بھی چلانے لگیں گی۔ اپنا رعب بھی
ڈالیں گی۔

حامد: چچا جان! اب جھوٹی شان دکھانے کا زمانہ گیا
۔ ہم اپنے شاندار ماضی کی یاد میں کب تک کھو
ئے رہیں گے؟ ضرورت ہے کہ ہم وقت کی
آواز کو پہچانیں۔۔۔ عورتوں کو ان کے جائز
حقوق دیں۔

چچا: لو بھلا۔۔۔ میں نے کب کہا کہ عورت کا حق
مار لو۔

حامد: لیکن آزادی تو عورت کا سب سے بڑا حق

ہے۔11؎

شہناز نبی کے ڈراموں کے مرکزی کردار کے ساتھ ضمنی کردار بھی کم اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔جس طرح انھوں نے اپنے ڈراموں کے مرکزی کرداروں کی شخصیت کو ابھارنے کے لیے محنت کی ہے اسی طرح ان ضمنی کرداروں کو بھی اکارنے اور سنوارنے میں بھی کی ہے۔کبھی کبھی ان کے یہ ضمنی کردار جو تھوڑی دیر کے لیے نمودار ہوتے ہیں لیکن ان کی زبانی ہم ملک کے ماضی کے حالات سے واقف ہوتے ہیں۔ایسے موقعے پر ڈراما نگار کی فنی مہارت اور ابھر کر سامنے آتی ہے۔شہناز نبی کا ڈراما ''ہم ایک ہیں'' کا ایک کردار اس تعلق سے اہمیت رکھتا ہے۔جس کے ذریعے ہمیں گجرات اور گودھرا میں ہوئے فسادات کا پتا چلتا ہے۔یہ کردار اس کا چشم دید گواہ ہوتا ہے۔اس کردار کے ذریعے اس وقت کے حالات کا پتا چلتا ہے۔غرض ان کے ڈراموں کے مرکزی کرداروں کی طرح ہی ان کے ضمنی کردار بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

شہناز نبی کے ڈراموں کو دیکھ کر یا پڑھ کر اس کا بات کا پتا چلتا ہے کہ ان کے ڈراموں کے ہر ایک کردار چاہے مرکزی ہو یا ضمنی سب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔وہ اپنے کرداروں کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے میں فنی چابک دستی سے کام لیتی ہیں اور انہیں سلیقے سے پیش کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔وہ انہیں اس طرح پیش کرتی ہیں کہ قاری یا ناظرین کے ذہن و دل پر وہ اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔شہناز نبی منفی اور مثبت دونوں طرح کے کرداروں کو پیش کرنے میں موقع محل اور موزونیت کا لحاظ رکھنا نہیں بھولتی اور انہیں ان کی مناسبت سے تراش کر ناظرین کے سامنے لاتی ہیں۔الغرض ان کے ڈراموں کے پلاٹ تقسیم کی طرح ان کے کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں اور کردار نگاری کے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔

مکالمہ نگاری:

ڈراما ایک عمل مانا جاتا ہے جو نقل و حرکت سے عبارت ہوتا ہے لیکن بات جب کردار کی شخصیت، اس کے قوت ارادی اور اس کی صداقت کی ہو تو اس کا اندازہ اس کے مکالمے ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔یہ مکالمہ ڈرامے کے لیے روح کا کام کرتا ہے۔ڈرامے کا پلاٹ چاہے کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو، اس کے کردار کتنے ہی جان دار کیوں نہ ہو ،مکالمے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ مکالمے ہی کے ذریعے ہمیں کرداروں کی مکمل شبیہ اور ان کی نفسیات کو

سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ مکالمے ہی ہیں جو کرداروں اور واقعات کی پرتوں کو آہستہ آہستہ کھولتے ہیں جس سے کردار کی ذہنی سطح اور ان کا عمل ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے شاید اسی لیے ارسطو نے ''مکالمے کو ڈرامے کی ریڑھ کی ہڈی کہا ہے۔''

ڈراما نگار کے لیے مکالمے کو اپنے کرداروں کے ذریعے درست تلفظ وادائیگی کے ساتھ ادا کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ ناول یا افسانہ نگار کی طرح اس کو یہ آزادی نہیں ہوتی کہ وہ لفظوں کے ساتھ کھیلے، بیٹھے بیٹھے قاری کو آسمان کی سیر کرائے یا ہوائی جہاز میں اڑائے ڈرامے کا سیدھا تعلق براہ راست عمل سے ہوتا ہے اس لیے ڈراما نگار کو مکالموں کی پیش کش کے وقت محتاط انداز سے کام لینا پڑتا ہے۔ ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے عشرت رحمانی نے لکھا ہے:۔

> ''مکالمہ عملی صداقت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور کردار وکی کامیابی کی ذمہ داری مکالمہ پر ہے۔ مکالمہ ہی کے ذریعہ تمام خیالات وجذبات کا اظہار ہوتا ہے اس لیے مکالمہ میں الفاظ اور زبان وبیان کی موزونیت بے حد ضروری ہے۔ موقع محل کی مناسبت کے ساتھ مکالموں کو پرکشش اور مئوثر بنانا اوران میں عمل کی قوت پیدا کرنا ڈراما نگار کا اولین فرض ہے۔''12

اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ڈراما نگار مکالمے کے لیے مشکل زبان، بے موقع اور بے ربط جملے، طویل مکالمے سے گریز کرے اور جہاں تک ہو سکے مناسب اور سلیس زبان کا استعمال کرے۔ سادہ اور مختصر جملے جو عمل و حرکت کے ذریعے ادا کیے گئے ہوں، برجستہ اور چست فقرے جس سے کردار کی شخصیت پوری طرح سے واضح ہو ، ایسی زبان کا استعمال ڈرامے کو مئوثر بناتا ہے۔

شہناز نبی نے اپنے ڈراموں کے مکالمے میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے کرداروں کے مکالموں کے پیچھے ان کی فطرت کے ساتھ ساتھ خود ڈراما نگار کا سماجی اور عصری شعور بھی جھلکتا ہے۔ ڈراما ''پہچان مجھے نادان'' میں انھوں نے حقیقت کو تخیل کی آمیزش کے ساتھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ڈرامے کا فن بھی مجروح نہیں ہوا اور حقیقت بھی واضح ہو کر سامنے آگئی۔ وہ اس ڈرامے میں حقیقت کو کبھی صاف اور کھلے الفاظ میں بیان کرتی ہیں تو کبھی اشاروں اور کنایوں سے تو کبھی علامتوں کے ذریعہ قارئین اور ناظرین کو حقیقی صورتحال سے آگاہ کرواتی

ہیں جیسا کہ اس ڈرامے کے پہلے اور دوسرے کے کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے:۔

''دوسرا: اخلاقیات کا پاٹھ نہ پڑھاؤ۔ دنیا جانتی ہے کہ اس کے بازاروں پر چند بڑی طاقتوں کا ہی قبضہ رہ سکتا ہے۔

پہلا: کیا تم ان میں سے ایک ہو؟

دوسرا: بالکل! میں وہ ہوں، جسے کولمبس نے تلاش کرنے کی غلطی کی تھی۔ ایسا دنیا کہتی ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کولمبس نے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ میں ہوں اس لیے طاقت کا توازن قائم ہے۔ (دونوں ہاتھوں کو پلڑے کے انداز میں رکھتا ہے۔)

پہلا: توازن۔۔۔اسے توازن کہتے ہیں۔۔۔؟ آتنک اور دہشت گردی سے کام لے کر توازن بناتے ہو۔؟

دوسرا: اور کیا۔ آتنک نہ ہوگا تو ہمارے آر۔ڈی۔ ایکس کے ذخیرے کا کیا ہوگا۔۔۔؟ آتنک نہ ہوگا تو ہمارے سونگھنے والے کتوں (ناک سے کتوں کے سونگھنے کی آواز) کا کیا ہوگا۔؟ ہمارے میٹل ڈی ٹیکٹیٹرز کا کیا ہوگا۔۔؟ اگر کسی ملک میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو اور ڈر، خوف، دہشت کا گذر نہ ہو تو سب کشل منگل ہوگا۔۔۔لیکن ہم۔۔۔ہم تو شنی کا پہرا چاہتے ہیں۔ جذباتی، کمزور، مذہبی جنون میں مبتلا نوجوانوں کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

پہلا: یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔۔۔نہیں نہیں۔
۔۔یہ جرم ہے۔
دوسرا: اسے جرم کون ثابت کرے گا۔۔۔تم۔۔؟
پہلا: کوئی ذی ہوش انسان تمھاری حرکتوں کو
درست نہیں کہہ سکتا۔
دوسرا: میں نے ذی ہوشوں کے ہوش کو بھی اپنی مٹھی
میں بند کر لیے ہیں۔کسی کو مجھ سے پیٹرول
چاہیے، کسی کو سونا۔کسی کو گیہوں چاہیے کسی کو
بجلی۔میں تیسری دنیا کی ذہانت اور محنت کو کم
قیمت پر خرید کر اونچے داموں میں بیچ سکتا
ہوں۔کوئی کر سکتا ہے ایسی سوداگری۔۔۔؟
میں ساری دنیا پر نظر رکھتا ہوں۔مجھ سے پو
چھے بغیر کوئی سانس بھی نہیں لے سکتا۔'' 13؎

ان مکالموں سے امریکہ کا وہ رخ سامنے آتا ہے جو اس کا اصل چہرہ ہے۔ظاہری طور پر امن کی باتیں کرنے والا امریکہ خود آتنک اور دہشت پھیلانے والا ہے۔اپنے مفاد کے لیے وہ کسی بھی ملک پر حملہ کر سکتا ہے۔شہناز نبی نے اپنے اس ڈرامے میں ان مکالموں کے ذریعے سے امریکہ کا اصل چہرہ بے نقاب کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔

مختصر، رواں اور برجستہ مکالمے ڈرامے کی خوبی تصور کیے جاتے ہیں اور طویل مکالمے کو ڈرامے کا عیب مانا جاتا ہے۔شہناز نبی اپنے ڈراموں میں طویل مکالموں کے بجائے برجستہ، چست اور موزوں مکالموں کو اہمیت دیتی ہیں جن سے کردار کی شخصیت کے ساتھ ان کے قوت ارادی کا بھی پتا چلتا ہے۔ان کے مکالموں میں کسی بھی طرح کا الجھاؤ پن بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ڈراما ''ہم ایک ہیں'' کے مکالمے ملاحظہ ہوں:۔

''دوسرا نوجوان: ہم مایوس نہیں ہیں بھائی۔ہم سب
مل کر اپنی لڑائی تیز کریں گے۔

پہلا نوجوان: یہ حیوانوں کے خلاف انسانوں کی لڑائی ہوگی۔

دوسرا نوجوان: دیوتاؤں نے ہمیشہ اسوروں کا ودھ کیا ہے۔ ہم اچھے لوگوں کو ساتھ لے کر ایسے شیطانوں کے خلاف جنگ چھیڑیں گے۔

تیسرا نوجوان: انھیں ان کی بلوں سے کھینچ کر باہر نکالیں گے اور پوچھیں گے کہ اس دیش کو بانٹنے کا ادھیکار انھیں کس نے دیا ہے؟

ادھیڑ شخص: اگر انھوں نے کہا کہ اس دیش کی جنتا نے تو۔۔۔؟

سارے نوجوان: (ہم آواز ہوکر) تو ہم اس دیش کی جنتا کے پاس جائیں گے اور کہیں گے (ہاتھ جوڑ کر ناظرین سے)

پہلا نوجوان: ایسے لوگوں کے ہاتھ اس دیش کی باگ ڈور نہ دیں جو آپ کا سر باہر ملکوں میں نیچا کرتے ہوں۔۔۔

دوسرا نوجوان: جو ہماری ماؤں اور بہنوں کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے۔۔۔

تیسرا نوجوان: جو ہمارے نوجوانوں کو نوکریاں دینے کے بجائے قبر کی گود میں سلانے کا گھناؤنا کام کرتے ہیں۔۔۔

پہلا نوجوان: چتا کی آگ میں پھونکتے ہیں۔۔

دوسرا نوجوان: ہم اپنی شاعری کے ذریعہ۔۔۔

پہلا نوجوان: تصویروں کے حوالے سے۔۔۔

تیسرا نوجوان: کہانیوں کے دوارا۔۔۔

پہلا نوجوان: ڈراموں کے مادھیم سے بتانا
چاہتے ہیں کہ (ہم آواز ہوکر)
ہمیں امن چاہیے۔امن چاہیے۔
ہم سب ایک ہیں۔'' 14؎

شہناز نبی نے اپنے ڈراموں کے مکالموں میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی کا بھی استعمال کیا ہے لیکن ڈراموں کے مطالعے کے بعد ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے فن میں طنز و مزاح کسی خوش بختی کا ذریعہ نہیں بلکہ کسی سنجیدہ واقعہ یا تلخ حقیقت یا کسی گہرے خیال کی ترجمانی کا اظہار ہے۔اس کی مثال ڈراما ''ہم ایک ہیں'' میں ادھیڑ شخص اور تینوں نوجوانوں کے کرادار کے مکالمے دیکھنے کو ملتی ہے:۔

''دوسرا نوجوان: ہم اپنی تصویروں، تحریروں اور
تقریروں کے ذریعہ ساری دنیا کو
بتائیں گے کہ ہم ہندوستانی امن
وچین اور سکون سے رہنا چاہتے
ہیں۔

پہلا نوجوان: لیکن مٹھی بھر لوگ ہمیں مندر، مسجد
کے نام پر لڑوا کر حکومت کرنا
چاہتے ہیں۔۔۔

ادھیڑ شخص: (امید بھرے لہجے میں حسرت کے
ساتھ) پھر شاید کوئی صورت نکلے
۔۔۔شاید اس ملک سے کوئی یہ
سوال پوچھے۔۔کیا تمھارے دیش

میں جمہوریت ہے؟ (قہقہہ مار کر
ہنستا ہے) کیا جواب دیں گے یہ
بزدل، یہ کائر، یہ دیش دروہی
---گاندھی کے قاتل--'ہاں'
---(ہنستا ہے) ہا--ہا--ہا
یا 'ناں'---؟ (پیٹ پکڑ کے ہنستے
ہنستے گر پڑتا ہے)

پہلا نوجوان: اگر ہاں کہیں گے تو---؟

ادھیڑ شخص: سراسر جھوٹ---اگر جمہوریت
ہے تو پھر یہ ظلم، یہ بربریت کیوں
---؟ یہ لوٹ مار، یہ نوچ کھسوٹ
کیوں--؟ کیا ہے یہ سب--؟

دوسرا نوجوان: اور اگر ناں کہیں تو---؟

ادھیڑ شخص: تو بھی جھوٹ---یہ ہندو راشٹر تو
ہے نہیں۔

پہلا نوجوان: دنیا کو کوئی جواب دینے سے پہلے
اپنا کردار بدلنا ہوگا۔ فاشزم کے
راستے سے ہٹنا ہوگا۔ آپسی بھائی
چارہ اور محبت کو بڑھاوا دینا ہوگا۔

ادھیڑ شخص: بھائی چارہ---ہاہاہا---ہم تو
انھیں بھائی سمجھتے ہیں---لیکن وہ
ہمیں ''چارہ''---سمجھے تم--
--؟''15

ان مکالموں میں طنز کی کاٹ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں شہناز نبی اپنے مکالموں میں مزاح کی چاشنی

گھولنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔اس وقت ان کے مکالمے ہلکے پھلکے سادہ ہوتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں میں وہ مزاح کے پس وپیش اپنے کرداروں سے بڑی معنی خیز باتیں ادا کرواتی ہیں۔ڈراما ''اٹھ جاگ مسافر'' جوکہ ایک فارس کامیڈی ہے مزاح کے مکالموں سے بھرا ہوا ہے۔چند مکالمے نمونے کے طور پر دیکھے جا سکتے ہیں:۔

''سنتری: (چونکتا ہے پھر ونگ سے بھاگتا ہوا بادشاہ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے)
عالم پناہ۔(نہایت ادب سے)
بے داری مبارک عالم پناہ!

بادشاہ: میں بیدار کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟

سنتری: شاید آپ کی نیند کی مدت پوری ہو گئی ہے ظل سبحانی۔

بادشاہ: میں خود جاگا نہیں بلکہ جگایا گیا ہوں

سنتری: عالم پناہ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔؟

بادشاہ: طبیعت۔۔؟ ہماری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔(آواز میں خمار) بس ذرا گرمی لگ رہی ہے۔یہ پنکھا بردار کدھر مر گیا ہے۔؟

(پنکھا بردار کے ہاتھ رکے ہوئے۔وہ سو رہا ہے۔)

سنتری: لوڈ شیڈنگ۔عالم پناہ۔لوڈ شیڈنگ۔

بادشاہ: لوڈ شیڈنگ۔۔۔؟ یہ کیا بلا ہے۔؟

سنتری: لوڈ شیڈنگ۔بلائے ناگہانی۔یعنی

آپ جانتے ہی نہیں کہ یہ بلا کب
نازل ہونے والی ہے۔

بادشاہ: کیا مطلب ہے تمھارا۔ صاف
صاف کہو۔

سنتری: پنکھا بردار تھک گیا ہے۔ تھک کر
بیٹھ گیا ہے۔ جتنے میگا واٹ آپ کو
چاہیے، اتنے واٹ کے قابل نہیں
رہا۔

بادشاہ: (سنبھل کر بیٹھتے ہوئے) یہ کیا ہو
گیا ہے تمھیں۔؟ کون سی بھاشا
بول رہے ہو۔؟ لوڈ شیڈنگ۔۔؟
میگا واٹ۔۔؟

سنتری: انگریزی زبان ہے ظلِ الٰہی۔

بادشاہ: انگریزی۔۔۔؟

سنتری: جی حضور والا۔

بادشاہ: یہ زبان اس ملک میں کب آئی۔؟

سنتری: جب آپ سو رہے تھے ظلِ سبحانی۔
انگریز آئے۔ انھوں نے تجارت
کی، حکومت کی۔ ہم نے بغاوت
کی۔ آزادی کی جنگ لڑی۔ وہ ہار
گئے۔ ہمارا دیش چھوڑ کر چلے
گئے۔

بادشاہ: اور ہم کہاں تھے۔۔۔؟

سنتری: آپ تو اس وقت تخت پر رونق افروز

تھے مِحوِ خواب تھے بلکہ محوِ خواب خرگوش
تھے۔

بادشاہ: بدتمیز۔ بادشاہ کو خرگوش کہتا ہے۔

سنتری: حضور مائی باپ۔ میں تو محاورۃً
کہہ رہا تھا۔'' 16

اتنا ہی نہیں شہناز نبی نے اپنے ڈراموں میں مکالموں کے اوصاف بڑھانے کے لیے فنی اور ادبی وسائل کو بھی بروئے کار لایا ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں موقع محل کے لحاظ سے محاوروں اور ضرب المثل کا استعمال کیا ہے ۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی تاریخی واقعے کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ چند محاوروں کو درج ذیل پیش کیا جا رہا ہے۔

محاورے اور ضرب المثل:۔

آنکھ لگنا، آنکھوں میں دھول جھونکنا، پسینے میں تر بتر ہونا، آنکھیں دکھانا، نیکی کر دریا میں ڈال، لکیر کے فقیر، اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، جو سویا وہ کھویا وغیرہ۔

اس طرح جا بہ جا ہمیں ان کے مکالموں میں محاورے اور ضرب المثل کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس سے مکالموں میں خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے اور معنی آفرینی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ شہناز نبی نے کئی ڈراموں میں تاریخی اور سیاسی واقعات کا ذکر بھی علامتی اور اشاراتی انداز میں کیا ہے ایک مثال ڈراما ''ہم ایک ہیں'' سے یہاں پیش کی جاتی ہے جس میں پہلا نوجوان دوسرے نوجوان سے کہتا ہے:۔

''ادھیڑ شخص: جس دیش میں رہنما ہی رہزن بن
جائیں وہاں کس سے انصاف کی
امید رکھتے ہو تم۔۔۔؟ گجرات
میں ایک ایسا ایم۔ ایل۔ اے بھی
ہے جس نے عوامی نمائندہ ہو کر
عوام کے گھروں میں اپنے سامنے
آگ لگوائی۔ ایسے پولیس افسران
ہیں جنھوں نے عورتوں کا تحفظ

کرنے کے بجائے اس راستے پر
ڈال دیا جہاں بلوائی کھڑے تھے
ایک ایسا چیف منسٹر ہے جو ایک
خاص فرقہ سے تعلق رکھنے والوں
کی نسل کشی کرتا ہے اور پھر بڑے
فخر سے ''گورو یا ترا'' نکالتا ہے۔
اور اس کے بعد بھی سب
خاموش۔17؎

بعض اوقات ڈرامے کی زبان کا انحصار اس کے موضوع پر ہوتا ہے۔ایک تاریخی ڈرامے کی زبان اور ایک ہلکے پھلکے ڈرامے کی زبان میں کافی فرق ہوتا ہے۔شہناز نبی نے اپنے تاریخی ڈراموں میں حقیقت نگاری کو حتی الامکان مسخ ہونے سے بچایا ہے۔سیدھے سادے اور روزمرہ محاوروں کا استعمال کیا ہے۔دقیق اور مشکل الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔واقعات کی پیش کش میں احتیاط سے کام لیا ہے۔بعض مقامات پر انگریزی، ہندی اور بنگلہ زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن ان کے استعمال سے ڈرامے کی افہام وتفہیم میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ الفاظ ایسے ہیں جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں عام بول چال کی زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔مثال کے طور پر چند الفاظ دیکھیے:۔

ریہرسل، لوڈ شیڈنگ، میگا واٹ، کولڈ اسٹوریج، ڈومیسٹکو ائلنس وغیرہ انگریزی کے اور چِتا، دوارا، مادھیم، ودھ، وشواش، راشٹریہ، بھاشا، شُنی، کشل منگل، وغیرہ ہندی کے الفاظ ہیں جو ہمارے روزمرہ کی زندگی میں عام بوچال کی زبان میں استعمال میں آتے ہیں۔

شہناز نبی چونکہ سرزمین بنگال سے تعلق رکھتی ہیں اور بنگلہ ان کی علاقائی زبان ہے۔اپنے کچھ مکالموں میں انھوں نے بنگلہ زبان کے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے مثال کے طور پر ڈراما ''حسرت ان غنچوں پہ'' میں رادھا کے یہ مکالمے دیکھے جاسکتے ہیں:۔

''رادھا: (باہر سے آواز دیتی ہے) بلبل
آچھے؟

عاصمہ: آؤ رادھا۔ بلبل یہاں بیٹھی رو رہی ہے۔

رادھا: کینو کا نچھے؟

عاصمہ: اس کا شامی بہار چلا گیا ہے۔ کہتا ہے ساتھ نہیں لے جائے گا۔

رادھا: اے کی کوتھا؟ یہاں تو سب مدد کرتا ہے اور وہ باپ ہو کر اپنی بیٹی کو چھوڑ دیا-- کیمن لوک رے بابا۔۔۔

رادھا: (بلبل سے) اے بلبل۔! شون ،تھانا اوسی صاحب تو کے تین شوٹا کا دیے چھین۔۔۔۔ آر ایک جن دیدی مونی کھوٹا کا دیئے چھین۔ ۔۔۔ائی نے۔۔ ملم کن بی۔۔۔

بلبل: میری بچی کا کیا ہوگا؟

رادھا: ارے سب اچھا ہوگا رے۔۔۔ ہم ہے نا تیرا ساتھ۔۔۔ ہسپتال میں تیسرا آپریشن کا ڈیٹ دیا ہے ۔۔۔ سمجھا کچھ؟

بلبل: (سر ہلاتی ہے)

رادھا: (سینے پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے) آمی نئے جابے تو کے۔۔۔ گھابرا بی نہ۔۔۔ ٹھیک آچھے۔۔ (میں تجھے لے جاؤں گی۔ گھبرانا نہیں)

18

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جہاں شہناز نبی کے ڈرامے عصری زندگی کے مسائل اور حالات پر مبنی ہوتے ہیں تو وہیں ان کے مکالمے ان کی سیاسی وسماجی شعور اور حقیقت پسندی کا مظہر ہیں۔

تصادم اور کش مکش:

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں تصادم کو سب سے اہم جز مانا جاتا ہے۔ ماہرین فن ڈراما نگاروں نے تصادم کی حیثیت کو ڈرامے میں کچھ اس طرح سے تسلیم کیا ہے کہ اس کے بغیر ڈرامے کا وجود ہی ممکن نہیں۔ ڈرامے میں تصادم کی شمولیت اس کی ابتدا ہی سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ عموماً یہ تصادم دو طرح کے ہوتے ہیں داخلی اور خارجی۔ داخلی تصادم انسان کے اندرون میں جذبات وخیالات، شعور اور تحت الشعور کے درمیان ہوتا ہے اور خارجی تصادم دو کرداروں یا دو دماغوں کا آپسی ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یہ ٹکراؤ جھوٹ سچ، خیر وشر، نیکی بدی کی کشاکش میں ہوتا ہے۔ اس طرح کے تصادم زیادہ تر ٹریجیڈی ڈراموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس کے علاوہ کامیڈی یا مزاحیہ ڈراموں میں اکثر تصادم یا کش مکش کسی شخص یا جماعت کے مابین واقع ہوتا ہے۔ اگر ڈرامے میں تصادم کا انجام خوشگوار ہو تو یہ کومیڈی کا نیک انجام تصادم ہوتا ہے۔ اس تصادم کا اظہار کئی صورتوں میں ہوتا ہے کبھی نیکی وبدی کی صورت میں، کبھی انسان اپنی قسمت سے لڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کبھی اس کی ٹکر معاشرے کی رسم ورواج سے ہوتی ہے تو کبھی یہ کش مکش انسان کی اپنی ذات سے بھی ہوتی ہے۔ اس کش مکش یا تصادم کی ابتدا واقعہ ہی سے شروع ہوتی ہے جیسے جیسے واقعہ آگے بڑھتا جاتا ہے دھیرے دھیرے یہ بھی شدید ہوتا جاتا ہے لیکن ناظرین کا اس کا پتا نہیں رہتا کہ جیت کس کی ہوگی ایسے ہی یہ تصادم انتہا کو پہنچتا ہے اور ساتھ ہی ناظرین کی دھڑکن بھی بڑھاتا جاتا ہے۔ خاتمہ کے ذرا پہلے اسے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ کون جیتے گا اور پھر واقعہ کا خاتمہ ساری کش مکش اور تصادم کو ختم کر دیتا ہے۔

ڈرامے میں تصادم کے عنصر کو کامیابی سے پیش کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ڈراما نگار کا حیات انسانی کے نفسیات کا مطالعہ گہرا ہو اور وہ انسان کی تمام فطری خصوصیات سے واقفیت رکھتا ہو تاکہ ڈرامے میں کسی بھی طرح کے تصادم کو پیش کرنے میں اس میں مصنوعی پن کا اظہار نہ ملے۔ تصادم کی عملی پیش کش میں ایک ڈراما نگار کی گرفت جتنی مظبوط ہوگی اس کا ڈراما اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

شہناز نبی کے ڈراموں میں تصادم اپنی تمام تر فنی خوبیوں کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے اکثر ڈرامے کومیڈی ہوتے ہیں کیونکہ ان میں تصادم کے بعد انجام خوشگوار دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے اکثر ڈراموں میں ہمیں خیر وشر، نیکی بدی کے مابین تصادم دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ اپنے ڈراموں میں تصادم کی آپسی کشاکش کے عملی پیش کش میں اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ بناوٹ سے پاک ہو اور انسانی زندگی کے نفسیات کا حقیقی عکاس ہو۔ڈراما ''پہچان مجھے نادان'' میں کچھ اسی طرح کا تصادم دیکھنے کو ملتا ہے:۔

''ضعیف عورت: تو نے ہی ننھے ہاتھوں میں ہتھیار تھمائے۔

ضعیف مرد: یہ مت بھول کہ یہ وہ دیس ہے جہاں شنکھ بجتے ہیں تو اذان کی صدا بھی گونجتی ہے۔

ضعیف عورت: یہ نانک اور چشتی کا وطن ہے۔اسے بابر اور اکبر نے سنوارا، رانا پرتاپ اور شیواجی نے نکھارا ہے۔

ضعیف مرد: دور ہو جا۔چل دور ہو۔نکل جا۔یہ دیس تیرا گھر نہیں بن سکتا۔

آتنک: ہاہاہا۔۔۔کہیں نہ کہیں تو جاؤں گا ہی۔۔۔میرے لیے بہت سے راستے کھلے ہیں۔عرب ایران سوڈان۔پاکستان۔کبھی فلسطین۔کبھی چین۔کبھی غزوہ پٹی۔کبھی عراق۔۔۔بغداد۔۔۔افغانستان۔۔۔کہاں کہاں سے نکالو گے مجھے۔۔۔؟ میں سیاست دانوں کے دماغوں میں۔(طنزاً) روشن

خیال لوگوں کی زبانوں پر۔ میں
کٹر پنتھیوں کے دلوں میں ہوں۔
میں فسادیوں کے سپنوں میں ہوں
مجھے نکالنے سے پہلے اندھیروں کو
اجالوں میں بدلو، میں خود فنا ہو جاؤں گا۔
میں اندھیرے کا دوست ہوں۔ تم اپنے دماغوں
میں اجالا کرو دلوں میں محبت کا سویرا جگاؤ، میں
آپ ہی آپ مر جاؤں گا۔

ضعیف عورت: بحث نہ کر۔۔۔ جا۔۔۔ چلا جا۔۔
۔ چھوڑ دے ہماری بستی۔۔۔ لیتا
جا یہ اندھیارا۔

ضعیف مرد: اس دنیا سے دور ہو تو بھاگ۔۔۔
چل بھاگ۔۔۔
(آتنک بھاگتا ہے۔ پیچھے پیچھے مرد اور عورت
۔ آتنک ونگ سے باہر۔ بیک گراؤنڈ سے
نغمہ)19

اس پورے ڈرامے میں ہمیں خیر و شر کے بیچ تصادم دیکھنے کو ملتا ہے۔

ڈراما ''کاہے کو بیاہی بدیس'' میں دو کرداروں کی سوچ میں تصادم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان دونوں کرداروں میں سے ایک عورت کے تعلق سے پرانے خیالات کا مالک او ور پرانی روایتوں کا پاسدار ہے تو دوسرا اس کے مخالف عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کو دلانے والے مرد کا کردار ہے۔ ان دونوں کے کرداروں کے درمیان کا تصادم کچھ اس طرح دیکھنے کو ملتا ہے۔

''چچا: دیکھو ذرا۔۔۔ میاں حامد۔۔۔ غور کرو۔۔۔
تمہاری دی ہوئی آزادی نے اس عورت کے ذہن میں کیسے
کیسے سوال ڈال دئے ہیں، جبھی ہم کہتے ہیں کہ عورت کو

سوچنے کا موقعہ ہی نہ دو۔ میں نے اس لیے اپنے بیٹے سلیم
سے کہہ دیا ہے کہ اپنی بیوی کی نکیل ہاتھ میں رکھے۔ اگر
عورت باتوں سے نہ مانے تو دوسرا طریقہ
اختیار کرو۔

حامد: چچا جان۔۔۔ آپ کیسی باتیں کہہ رہے ہیں۔

چچا: اور کیا۔۔۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں
مانتے۔ تمھیں ثمینہ پر پابندی لگانی ہی چاہیے
۔۔۔۔ (ثمینہ روتی ہوئی نکل جاتی ہے)

حامد: چچا جان! خدارا بس کیجیے۔ ان باتوں سے میر
ے گھر کا ماحول اور بگڑ جائے گا۔

چچا: بس ڈر گئے۔ یہ عورتیں آنسو بہاتی ہی ہیں اس
لیے۔۔ مرد پر قابو پانا چاہتی ہیں۔۔۔ انہیں
کمزور اور بزدل بنانا چاہتی ہیں۔۔۔ وہ مرد
ہی کیا جو عورت کے آنسوؤں سے ہار مان لے۔۔

حامد: افوہ۔۔۔ چچا جان۔۔۔ اب میں آپ کو کیسے
سمجھاؤں۔۔۔۔

چچا: مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ضرور
ت اس بات کی ہے تم عقل کے ناخن لو۔

حامد: چچا جان۔۔۔ خدا کے لیے اب بس بھی کیجیے

چچا: میاں۔۔۔ تم تو جورو کے غلام بنتے جا رہے ہو۔۔۔
ہیں۔۔۔ ہمارے خاندان میں یہ کبھی ہوا ہے۔۔۔ عورتوں
کا پلو سر سے نیچے نہیں سرکتا۔ بزرگوں کے سامنے وہ
منہ ہی نہیں کھولتیں وہ۔ اور تمھاری بیوی ہے کہ چپڑ چپڑ بولے
جا رہی ہے۔۔۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو زبان کھینچ لیتا۔ ایک

عورت کی اتنی مجالا اس کی چٹیا کھینچ کے وہ مار مارتا کہ
بس۔۔۔۔کھال کھینچ کے بھس بھروا دیتا۔۔20؎

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی کے ڈراموں میں تصادم کبھی نیکی و بدی کے درمیان تو کبھی خیر وشر کے تو کبھی سماج کی بری رسم ورواج کے درمیان دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اکثر اس کا انجام خوشگوار ہوتا ہے۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز نبی کے ڈرامے طربیہ ہیں اور یہ برائی پر اچھائی کی جیت کی امید کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے ڈرامے ناظرین کی ہمت وحوصلہ کو بڑھاتے ہیں اور اسے ہر طرح کی مشکل سے نکلنے کا راستہ بتاتے ہیں۔

انجام:

کوئی بھی ادبی صنف ہو اس کی کامیابی کا دارومدار اس کے انجام پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ڈرامے میں انجام کو نتیجہ خیز اور کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ڈراما نگار اس کے انجام کی فکر اس کے آغاز ہی سے کرے۔انجام کا سیدھا تعلق مرکزی خیال سے ہوتا ہے۔ایک ڈرامے کا موضوع جتنا سلجھا ہوا اور تسلسل وعروج جس قدر مربوط اور بے عیب ہوگا اس کا انجام اتنا ہی مئوثر ہوگا۔واقعے کی صداقت اس کی سادگی اور کش مکش وتصادم، وسعتوں کی صفائی انجام کو اور بھی جاذب بناتے ہیں۔انجام کے تعلق سے عشرت رحمانی لکھتے ہیں:۔

’’انجام ڈراما کی آخری چیز اور واقعہ کا نچوڑ ہے۔اس کی کامیابی ڈراما کی فتح ہے ۔اس لیے فتح مندی کے لیے ڈراما نگار کا ہر جز اور ہر پہلو پر نظر رکھتے ہوئے تنوع، جدت، وسعت اور جاذبیت کا خوگر ہونا ضروری ہے اور درمیانی روابط و اجزا کی کامیابی کو انجام کی کامرانی کا رازدار تسلیم کرنا چاہیے۔‘‘21؎

انجام کی ان فنی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہم شہناز نبی کے ڈراموں کے انجام کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ ان کے تقریباً سبھی ڈراموں کے انجام خوشگوار اور مئوثر ہوتے ہیں۔وہ اپنے ڈراموں کو انجام تک اس سلیقے سے پہنچاتی ہیں کہ وہ ناظرین اور سامع پر دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ان کے ڈرامے زیادہ تر طربیہ یا کومیڈی قسم کے ہیں اس لیے ان کے انجام بھی مثبت ہوتے ہیں۔ان کے ڈراموں کے انجام ناظرین کو مشکلوں سے سامنا کرنے کے لیے ہمت اور حوصلہ عطا کرتے ہیں۔برائی پر اچھائی کی جیت ہمیشہ ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی اس کی مثالیں بھی

ہمیں ان کے ڈراموں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس لحاظ سے ڈراما ''پہچان مجھے نادان'' انجام اس کے کرداروں کے ان مکالموں سے دیکھے جاسکتے ہیں:۔

آتنک: (گھبرا کر کھڑا ہوتا ہے) جانے دو مجھے۔۔۔
آزاد کرو۔۔۔آزاد کرو۔۔۔اپنی گندی
پالیسیوں سے۔۔۔اپنے گھناؤنے منصوبوں
سے۔۔۔آزاد کرو مجھے۔۔۔رہائی دو۔۔۔

دوسرا: میں چاہوں بھی تو تمھیں آزاد نہیں کر سکتا۔
پنپتے رہو گے تم اس وقت تک جب تک کسی
ملک میں جہالت کے اندھیرے باقی ہیں۔زندہ رہو گے
اس وقت تک جب تک مذہب اور بھاشا کے نام پر
جھگڑے باقی رہیں گے۔مچاتے رہو گے تباہی جب تک
نوجوان بے روزگار ہیں،عورتوں اور بچوں کی خرید وفرو
خت جاری ہے۔کرتے رہو گے دھماکے
جب تک لوگ ایک دوسرے سے مکمل طور پر
نفرت نہ کرنے لگیں۔کھیلتے رہو گے اپنا کھیل جب تک کرسی
کی بھوک باقی ہے،اقتدار کی ہوس تازہ ہے۔تم اندھیرے
کے زائدہ ہو،تمھیں روشنی راس نہیں۔۔۔

آتنک: مجھے مار ڈالو۔۔۔(جنون میں) مجھے ختم
کرو۔۔۔اے دنیا کے امن پسند لوگوں آگے بڑھو۔

(دھیرے دھیرے اسٹیج پر بہت سے نوجوان ناچتے گاتے داخل ہوتے ہیں)

ہم لہریں دریا کی ،کوئی ہم کو کاٹ نہ پائے
ہم پنچھی بگیا کے ،کوئی ہم کو بانٹ نہ پائے
(بچے ہاتھوں میں چراغ لیے داخل ہوتے ہیں)
مذہب کی دیواریں ،چلو مل کر آج گرا دیں

دہشت کے سوداگر، تجھے آج یہ ہم بتلا دیں
جہاں روشن ہیں صبحیں وہاں تیرا کام نہیں ہے
جہاں زندہ ہیں روحیں ،وہ تیرا گام نہیں ہے
اس دنیا سے دہشت کو ،دور کریں گے مل کر
ہر سرحد پہ روشن ہو ، امن و اماں کا منظر
ہم لہریں دریا کی کوئی ہم کو کاٹ نہ پائے
(گیت: شہناز نبی)

(آتنک خوف زدہ ہوکر بھاگتا ہے۔ دوسرا شخص بھی اس کے پیچھے۔ دونوں کئی چکر لگاتے ہیں۔ اسٹیج پر نغمہ جاری رہتا ہے۔)''22

ڈراما ''شعلوں میں گھرا بچپن'' بچہ مزدوری پہ لکھا گیا ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کا انجام کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ شروع سے آخر تک اسے دیکھنے کے بعد ناظرین کے ذہن ودماغ پر بچہ مزدوری کے خلاف کچھ کرنے کا عزم جگہ بنا لیتا ہے اور وہ سماج ومعاشرے میں پھیلی اس برائی کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ یہ ڈراما یہ ثابت کرتا ہے کہ شہناز نبی اپنے انجام کو کچھ اس طرح سے غور وفکر کر کے تیار کرتی ہیں کہ ناظرین یا سامع پر اس کا مثبت اثر پڑے۔ مثال کے طور پر ''شعلوں میں گھرا بچپن'' کا انجام دیکھیے:۔

''بلو: کوئی نہیں بچا۔۔۔(آہ وزاری) کوئی نہیں بچا۔۔۔سب کے سب خاک۔۔۔ہسپتال میں جلی ہوئی لاشوں کے ڈھیر ہیں۔

چمیلی: (خالی خالی آنکھوں سے فضا میں تکتی ہے اور دھم سے زمین پر بیٹھ جاتی ہے) چھوٹو۔۔۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔۔۔میرا چھوٹو نہیں مر سکتا۔۔۔اس کے دل میں حوصلہ تھا اور آنکھوں میں کچھ کرنے کی چمک۔۔۔

بلو: چمیلی! صبر کر۔۔۔صبر۔۔۔ان بچوں میں تیرا چھوٹو بھی ہے۔۔۔

چمیلی: (چیخ مار کر) نہیں نہیں۔ایسا نہیں ہوسکتا۔۔۔
ایسا نہیں ہوسکتا۔۔۔خدا اتنا بے رحم نہیں ہو
سکتا۔۔۔۔میں نے کیا گناہ کیا ہے۔۔۔۔
میرے لیے یہ سزا کیوں؟نہیں۔۔نہیں۔۔
میں نہیں مانتی۔۔۔میں نہیں مانتی۔۔۔۔
(زمین پر لوٹ کر روتی ہے) پس منظر سے
غمگین آواز میں ہچکیوں کے درمیان۔۔۔
میرا بھیا پڑھ لکھ کر آفیسر بنے گا
ٹھاٹ باٹ سے اک اونچے بنگلے میں رہے گا
(چمیلی کی سسکیوں کی بیچ بچے پلے کارڈ لے
کر اسٹیج پر آتے ہیں۔۔۔ان کے منہ پر کالی
پٹیاں بندھی ہیں۔۔۔۔پلے کارڈ پر لکھا ہے
''بچہ مزدوری بند کرو۔۔۔۔بچوں کی تعلیم
عام کرو۔۔۔بچہ مزدوری نہیں چلے گی۔'' 23؎

اگر دیکھا جائے تو شہناز نبی نے اپنی شاعری اور مضامین میں تو مسائل نسواں کو موضوع بنایا ہی ہیا ور یہی ان کے ڈراموں کا بھی اہم موضوع ہے۔مسائل نسواں ان کا سب سے اہم موضوع ہے جس کی جھلکیاں ہمیں ان کے ڈراموں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ڈراما'' کاہے کو بیاہی بدیس'' میں ایک عورت کو سماج اور معاشرے کی بری رسم و رواجوں سے جھوجھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔اس ڈرامے میں مرد حضرات کی دو کیٹیگری دیکھنے کو ملتی ہے۔ایک نوجوان نسل اور دوسری پرانی نسل۔شہناز نبی نے اس ڈرامے میں یہ دکھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ نوجوان نسل تو کچھ حد تک عورتوں کی آزادی اور اس کے حقوق کی حامی ہے لیکن پرانی نسل کے ابھی بھی کچھ لوگ باقی ہیں جو آج بھی عورتوں کو محکوم سمجھتے ہیں۔وہ اس ڈرامے کے انجام سے یہ سبق دیتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں کہ اب پرانی نسل کے لوگوں کو بھی جاگنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ عورتوں کے حقوق کو سمجھ سکے انجام دیکھیے:۔

''رفیق: میں وکیل تو نہیں۔۔باقی باتیں آپ کسی وکیل

یا مجسٹریٹ سے پوچھ سکتے ہیں۔۔۔اور ہاں
اس مغالطے میں مت رہیے گا کہ مقدمہ زندگی
بھر جھولتا رہے گا۔کورٹ میں نالش کرنے
کے بعد صرف تین دن کے اندر ہی سنوائی
شروع ہو جائے گی اور فیصلہ پہلی سنوائی کے
ساٹھ دن کے اندر فیصلہ سنا دینے کا حکم ہے۔
آئی بات سمجھ میں۔۔۔

چچا: یہ کیا بک رہے ہو میاں۔۔۔تم تو مجھے پاگل
بنا دو گے۔۔۔

حامد: چچا جان۔۔۔رفیق بک نہیں رہا ہے بلکہ بالکل
صحیح کہہ رہا ہے۔۔۔بہو کو راہ راست پر
لانے کے بجائے بیٹے کو سیدھے راستے پر
لے آیئے۔

ثمینہ: چچا جان کچھ تو سوچیے۔

چچا: میرا سر گھوم رہا ہے۔۔۔ہائے کوئی مجھے
سنبھالو۔۔۔حامد۔۔۔رفیق۔۔۔

(دونوں آگے بڑھ کر چچا کو سنبھالتے ہیں۔چچا دونوں کے ہاتھوں پر جھول جاتے
ہیں۔سارے کردار ایک ایک کر کے اسٹیج پر آتے ہیں اور گاتے ہیں)''24؎

شہناز نبی کے ایسے ڈرامے بھی جو بچوں کے مسائل یا ان کے موضوع پر مبنی ہیں ان کے بھی انجام بڑے خوشگوار اور مثبت ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے ڈرامے بچوں کو کوئی نہ کوئی سبق ضرور دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے سبق حاصل کریں اور زندگی میں کامیاب ہو سکیں۔ڈراما ''اٹھ جاگ مسافر'' کا انجام کچھ اسی طرح ہوتا ہے:۔

''بادشاہ: (سوچتے ہوئے) ہوں۔۔۔جس ملک میں
اتنے سارے کام پڑے ہوں وہاں کا بادشاہ
کیسے سو سکتا ہے بھلا۔ہم نے بھی جان لیا ہے

کہ جو سویا وہ کھویا۔ اگر آپ سب نے ہمیں نہ
جگایا ہوتا تو اب تک ہمارے دیش پر ملکِ فتنہ
پرواز کا قبضہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ
ہماری نیند گئی کہاں؟

سب: ملکِ فتنہ پرواز کے بادشاہ کی آنکھوں میں،
اور کہاں۔۔۔

(سب مل کر ہنستے ہیں)

بادشاہ: اپنے تخت سے اٹھ کر چوکیداروں کے انداز
میں) جاگتے رہو۔۔۔۔!

(درباری درج ذیل گانا گاتے گاتے اسٹیج سے اتر جاتے ہیں)

جاگو رے، جاگو رے سب، جاگو رے۔۔۔ راجا پرجا جاگو رے
۔۔۔ دین دکھی سب۔۔۔ جاگو رے۔۔۔ دھنی سکھی۔۔۔ سب جاگو
رے۔۔۔ جاگو رے جاگو رے جاگو رے۔۔۔ سب جاگو رے۔۔۔
بچے بوڑھے جاگو رے۔۔۔۔۔۔
نرناری سب جاگو رے۔۔۔ نوکر مالک جاگو رے۔۔۔
کھیت مجورے جاگو رے۔۔۔ بھومیہار سب جاگو رے شلپ کار سب
جاگو رے۔۔۔ جاگو رے۔۔۔۔ جاگو رے۔۔۔ سب جاگو
رے۔۔۔

(گیت: شہناز نبی)

(ناظرین گانے میں شامل ہو جاتے ہیں)'' 25؎

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی کے ڈرامے فن ڈراما نگاری کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ جہاں تک بات اگر تکنیک کی، کی جائے تو انھوں نے اپنے زیادہ تر ڈراموں میں بیانیہ، علامتی، فلیش بیک کی تکنیک کو بروئے کار لایا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے ڈراما ''پہچان مجھے نادان''، ''شعلوں میں گھرا بچپن'' میں بیانیہ، ''جنگل میں اسکول'' میں علامتی اور ڈراما ''ہم ایک ہیں'' میں فلیش بیک کی تکنیک سے ان ڈراموں کی ڈرامائیت برقرار رکھنے میں

بھر پور فائدہ اٹھایا ہے۔ایسے ڈراموں میں انھوں نے واقعات کو حال سے ماضی اور ماضی سے حال کی جانب لانے میں اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ان کے زیادہ تر ڈرامے 2 سے 3 ایکٹ اور 3 سے 4 مناظر پر مشتمل ہیں۔کچھ ڈراموں میں وہ ڈرامائیت کو بجائے چھپانے کے اسے نمایاں کر کے ناظرین اور قارئین کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔

اس طرح شہناز نبی کا اپنے ڈراموں میں قارئین اور ناظرین سے براہ راست خطاب،خوبصورت گیت اور ان کی لے،سر اور تال یہ سبھی مل کر ڈراموں کو پر کشش بناتے ہیں جس کی وجہ سے ناظرین اور قارئین کی دلچسپی اخیر تک قائم رہتی ہے۔ان گیتوں کی یہ خاصیت ہے کہ یہ ڈرامے کے موضوع کے مناسبت سے ہوتے ہیں یعنی کہ بچوں کے موضوع پر لکھے گئے ڈراموں میں ان کے حساب سے اور سنجیدہ موضوع پر لکھے گئے ڈراموں میں یہ فکر انگیز لیے ہوتے ہیں۔ان کے ڈراموں کے یہ گیت زیادہ تر شہناز نبی کے خود کے لکھے ہوتے ہیں بلکہ ان کی سر اور تال بھی ان ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ان کے اکثر ڈراموں کا انجام ان کے گیتوں پر ہی ہوتا ہے جو اپنے آپ میں مئوثر ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوتا ہے۔

شہناز نبی کے ڈراموں کو دیکھ کر یا پڑھ کر قاری اور ناظرین کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ڈراما نگار نے اپنے ڈراموں پر کافی محنت کی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کیوں کہ وہ نہ صرف ڈرامے لکھتی ہیں بلکہ زیادہ تر ڈراموں میں انھوں نے ہدایت کار کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔وہ نہ صرف محنت اور لگن سے ڈرامے لکھتی ہیں بلکہ ان کی پیش کش کا بھی خاص طور سے خیال رکھتی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں کو دیکھنے کے لیے کافی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ان کے کئی ڈراموں کے تو 20 سے 30 شوز دکھائے جا چکے ہیں۔ڈراما ''شعلوں میں گھرا بچپن'' اور ڈراما ''جنگل میں اسکول'' کچھ ایسے ہی ڈرامے ہیں۔''جنگل میں اسکول'' ڈراما کئی اسکول میں بھی پیش کیا جا چکا ہے۔اپنے ڈراموں کے تعلق سے شہناز نبی لکھتی ہیں کہ:۔

> ''مجھے اپنے ڈرامے بے حد پسند ہیں کہ جب یہ پیش ہوتے ہیں تو ناظرین،جن میں بچے بھی جوق در جوق شامل ہوتے ہیں،نہ صرف میرے لکھے ہوئے گیت یاد کر لیتے ہیں بلکہ ڈرامہ کے دوران وہ ڈرامے کا حصہ بن جاتے ہیں اور اداکاروں کے ساتھ مل کر گانے لگتے ہیں۔یہ اتنا فرحت بخش تجربہ ہے جسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو اس طرح کے تجربات سے گذرا ہو۔''[26]

جو بات بحثیت ڈراما نگار شہناز نبی کو منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیج اور ادبی ڈراموں کے علاوہ انھوں نے بے شمار نکڑ ناٹک بھی لکھے اور پیش کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں کو ٹیلی کاسٹ بھی کیا گیا ہے علاوہ ازیں کئی نثری ڈرامے بھی ہیں۔ نکڑ ناٹک کے حوالے سے ان کا بنگلہ زبان میں ''حوالہ جاترا'' کافی مشہور ہوا۔ اس میں کل 40 نکڑ ناٹک شامل ہیں۔ ''آتما کی پکار'' یہ زمینداروں پر لکھا گیا ہے اس میں بھی 40 نکڑ ناٹک شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی ادیبوں کے افسانوں پر مبنی ڈرامے بھی پیش کیے ہیں ان ہی میں سے ایک پریم چند کا افسانہ ''نمک کا داروغہ'' پر مبنی ان کا ڈراما کئی بار اسٹیج کیا جا چکا ہے۔

شہناز نبی کی ڈراموں کے تعلق سے دلچسپی اور جستجو کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف خواتین کی ڈراما نگاری کے باب میں چار چاند لگائے ہیں بلکہ وہ صنف ڈراما نگاری میں قابل قدر اضافے کی مستحق بھی قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان کا تعلق ڈرامے کے ساتھ گہرا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ڈرامے لکھے ہیں بلکہ ہدایت کار کے رول بھی ادا کیے ہیں اور بحثیت اداکار اپنی صلاحیتوں کا بھی لوہا منوایا ہے۔ کئی ڈراموں میں تو انھوں نے کردار کا رول بھی ادا کیا ہے۔ ڈرامے سے ان کی یہی دلچسپی نے ان سے اچھے اچھے ڈرامے لکھوائے ہیں جو اپنے موضوع اور پیش کش کے لحاظ سے قارئین اور ناظرین کی توجہ کا مرکز بنے ہیں اور یہی ایک ڈراما اور ڈراما نگار کی کامیابی ہوتی ہے۔ شہناز نبی نے جس طرح اپنے ڈراموں کو فوکس میں رکھا ہوا ہے اس سے ہمیں ان کے ڈراموں کا مستقبل شاندار دکھائی دے رہا ہے عنقریب ان کے دو اور ڈراموں کے مجموعے منظر عام پر آنے والے ہیں۔

*****

حواشی:

1۔ عشرت رحمانی، اردو ڈراما تاریخ وتنقید، ص 10
2۔ شہناز نبی، پہچان مجھے نادان، ص 6
3۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 107
4۔ عشرت رحمانی، اردو ڈراما تاریخ وتنقید، ص 22
5۔ شہناز نبی، پہچان مجھے نادان، ص 8
6۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 113
7۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ص 167
8۔ وقار عظیم، اردو ڈراما فن اور منزلیں، ص 19
9۔ شہناز نبی، پہچان مجھے نادان، ص 16
10۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ص 31
11۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ص 59
12۔ عشرت رحمانی، اردو ڈراما تاریخ وتنقید، ص 25
13۔ شہناز نبی، پہچان مجھے نادان، ص 17
14۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 127
15۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 126
16۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 148
17۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 125
18۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 110
19۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 13
20۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 6

21۔ عشرت رحمانی، اردو ڈراما تاریخ و تنقید، ص 30
22۔ شہناز نبی، پہچان مجھے نادان، ص 20
23۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 42
24۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 64
25۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 165
26۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔ص 4

باب پنجم: متفرقات

(افسانے، تراجم، سفرنامہ)

شہناز نبی ایک تانیثی نقاد، شاعر اور ڈراما نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں مقبول و معروف ہیں۔ان کے چھ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عہد حاضر کے ممیّزات کو لوگوں کے سامنے لایا ہے جس میں نسائیت اور تانیثیت کا بول بالا ہے۔اسی طرح سے وہ ایک ناقد کی حیثیت سے بھی بھی نسائی تحریکات میں اپنا نام درج کروایا ہے اور عہد حاضر کی ایک ادیب، ناقد اور شاعر کی حیثیت سے ان کی انفرادیت اردو دنیا میں قائم ہے۔ان کے علاوہ بھی انھوں نے ادب کی اور بھی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہیں لیکن اس میں ان کا وہ مقام نہیں ہے جو شاعری، صنف ڈراما اور تنقید میں ہے۔اس باب میں شہناز نبی کی ان تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے جس پر انھوں نے کم لکھا ہے جیسے افسانے، تراجم، سفرنامہ وغیرہ۔

افسانے:

شہناز نبی نے 3 افسانے لکھے ہیں جو تقریباً ایک ہی موضوع پر ہیں۔ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یہ افسانے اپنے قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے لکھے تو ہیں لیکن فنِ افسانہ نگاری کی خصوصیات ان کے افسانوں میں دکھائی نہیں دیتی ہے جو افسانے کے لوازمات ہوتے ہیں۔افسانہ ''میں کہاں ہوں'' میں انھوں نے مردوں کی اجارہ داری کو موضوع بنایا ہے۔افسانے کا موضوع وہی ہے جس میں شہناز نبی نے اپنی پہچان بنائی ہے۔تانیثیت کا تیز طرار لہجہ اس کہانی میں موجود ہے۔

افسانہ ''میں کہاں ہوں'' میں دو کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں پہلی کہانی کی ابتدا ایک خط سے ہوتی ہے جس میں ایک لڑکی چھپ کر خط لکھتی ہے جس میں اس کی ماں کے تعلق سے واقعات ہوتے ہیں۔لڑکی یہ چاہتی ہے کہ یہ خط کبھی اس کے ماں کے ہاتھ نہ لگے لیکن اتفاق سے ایک دن اس کی ماں کو یہ خط مل جاتا ہے اور ماں کے اصرار پر لڑکی اس خط کو اپنی ماں کے سامنے پڑھنے لگتی ہے جس میں اس کے پیدا ہونے اور ہوش سنبھالنے کے وقت کے واقعات ہوتے ہیں اور اس کے بھائی بہن کا بھی ذکر ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی لڑکی کے والد جو جبر و ظلم اس کی ماں کے ساتھ کرتا تھا

اس کو خط میں لکھا تھا۔لڑکی کی والدہ اپنے شوہر سے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی لیکن پھر بھی اس کے والد اس کی ماں پر چیختے رہتے تھے بچوں کی دیکھ ریکھ میں ذرا سی بھی کوتاہی ہونے پر اس کی ماں کو مارتے تھے۔ان ہی ساری روداد کو لڑکی نے خط میں لکھا تھا جو وہ دیکھتی تھی۔جب یہ خط لڑکی نے اپنی ماں کے سامنے پڑھ لیا تو اس کی ماں بولی کہ تمہارے ابو تو ایسے تو نہیں ہیں تو اس پر لڑکی جواب دیتی ہے کہ ماں تم اتنی بھی پتی ورتا نہ بنو اور اپنے اوپر ہوئے ظلموں کو مت چھپاؤ۔اس طرح سے مردوں کا عورتوں پر ظلم و جبر کو افسانے میں موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

اس افسانے کی دوسری کہانی میں جہیز نہ دینے کے سبب لڑکی پر ہونے والے ذہنی اور جسمانی ظلم وستم کے ساتھ اس کو زندہ جلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔افسانے میں سریتا اور سریش نام کے دو کردار ہیں جو ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔سریس میکینکل انجینیئر ہے اس کا پورا گھرانہ پڑھا لکھا اور ملازمت کرتا ہے۔سریتا کی شادی سریس سے ہو جاتی ہے لیکن وہ اور اس کے گھر والے جہیز میں منہ مانگی رقم نہ ملنے کی وجہ سے طعن وتشنیع کرتے رہتے ہیں۔ایک دن اچانک سریتا اسپتال میں بھرتی ہوتی ہے اور اس کا پورا جسم جلا ہوا ہوتا ہے جس پر اس کی سہیلی کہتی ہے کہ تم کو تمہارے سسرال والوں نے جہیز نہ لانے کی وجہ سے جلا دیا ہے نا لیکن سریتا کچھ نہیں بولتی ہے۔سریتا کی سہیلی اس کے سامنے جذبات میں آکر کہتی ہے کہ سریتا میں تم سے پہلے بھی کہتی تھی کہ مرد ذات ایسے ہی ہوتے ہیں کچھ وقت کے لیے پیار کریں گے لیکن حقیقت میں مرد عورت کو اپنا غلام سمجھتا ہے اور اسے اپنی جوتی کے نیچے ہی رکھنا چاہتا ہے۔یہی تمھارے بھی ساتھ ہوا پہلے تو سریش نے پیار کا جھانسہ دیا پھر تم سے شادی کی اور شادی کے عوض میں تم سے بہت سارا جہیز لیا لیکن نقد نہ ملنے پر اس نے تم پر ظلم کیا اس کے نزدیک تمہارے پیار کی قدر نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔سہیلی یہ تمام باتیں اسپتال میں سریتا کے سامنے کہتی رہی لیکن سریتا آنکھیں موندیں چپ چاپ لیٹی رہی۔

اس طرح سے یہ افسانہ کلی طور پر اپنے دونوں واقعات میں ہی مردوں کے ظلم و جبر اور عورتوں کے استحصال کو بیان کرتا ہے۔اس افسانے میں یہی ایک پہلو پیوست ہے۔افسانے میں خود کلامی اور مکالمے موجود ہیں۔مردوں کے کیے گئے ظلم کو شہناز نبی نے بڑے ہی سخت لہجے میں بیان کیا ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''عید قریب آ گئی تھی لیکین گھر میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ نئے کپڑے سلوائے جا سکیں۔امی کے چہرے پر تردود کے آثار تھے۔ابا سے تقریباً اس بات پر چخ چخ

ہورہی تھی۔لڑکیاں جوان ہورہی ہیں اب تو بری عادتیں چھوڑ یئے۔

بری عادتیں۔۔۔؟ کیا گناہ کرر ہاہوں میں۔۔۔۔

میں نے تو یہ نہیں کہا۔۔امی روہانسی ہو جاتیں۔

میں تو صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ۔۔۔آپ اپنے پیسوں کو جن غلط لوگوں پر خرچ کرر ہے ہیں۔۔۔

تو میرے دوست تجھے غلط لگتے ہیں۔۔۔سالی۔۔۔میں تو۔۔۔

بچے جاگ رہے ہیں۔۔۔

کیا چاہتی ہے تو۔بچوں کی خاطر میں دوستوں کو چھوڑ دوں۔میری اپنی کوئی زندگی ہے یا نہیں۔۔۔اور یہ سگریٹ۔۔کتنا خرچ ہوتا ہے ان پر۔۔؟سالی تیرے باپ نے دیا ہی کیا تھا۔۔۔زندگی خراب ہوگئی ہے میری۔۔۔

زندگی تو خراب ہوئی ہے میری۔۔۔ماں سسکیاں لینے لگتی۔۔۔

کیا نہیں ملتا تجھے۔۔باپ کی آواز اونچی ہونے لگتی۔۔۔ماں کی سسکیاں مدھم ہوتی جاتیں۔نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔''1؎

موضوع کی حیثیت سے ان کا یہ افسانہ تانیثی معنویت لیے ہوئے ہے۔وحدت تاثر افسانے کا ایک لازمی جز ہوتا ہے اوراس افسانے کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس چیز کا فقدان ہے۔یہ افسانہ ایک جذباتی کہانی معلوم ہوتا ہے۔جس کے اندر شہناز نبی نے اپنے جذبات اور عورتوں کے تئیں اپنی ہمدری اوران پر ہورہے مظالم کو بڑی شدت اور سختی سے بیان کیا ہے اوراس بیان میں انھوں نے مردوں کے یک رخی پہلو کو پیش کیا ہے۔جس میں ظالم اور جابر مردوں کا ذکر ملتا ہے جو عورتوں پرظلم وجبر اور استحصال کرتے ہیں۔

فن کے اعتبار سے اگراس افسانے کو دیکھا جائے تو یہ افسانہ بیانیہ ہے۔جس میں افسانہ نگار کہانی کو خود ہی بیان کرتی ہیں یعنی واحد متکلم انداز میں کہانی بیان کی گئی ہے جس کے بنا پر افسانے میں کردار نگاری،مکالمہ نگاری کم ہیں۔کرداروں کی پوری ساخت بھی کھل کر سامنے نہیں آتی ہیں نہ ہی ان کے حرکات وسکنات ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ افسانے کی ماہیئت اور موضوع کو خود افسانہ نگار نے بیان کیا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے افسانہ سادہ اور عام فہم ہے۔رواں دواں زبان کا ستعمال ملتا ہے۔زبان کے

اعتبار سے یہ افسانہ خوبیوں کا حامل ہے جس میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو ادبی قاری سے لیکر عام قاری تلکو سمجھ میں آ جائے گا۔اس افسانے میں کہیں بھی بوجھل اور ثقیل الفاظ کا ستعمال نہیں ہوا ہے۔زبان و بیان کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔

افسانہ ''کبڑوں کی بستی'' ایک ایسی کہانی پر مشتمل ہے جس کے اندر صفائی کرنے والے افراداوران کے مسائل ہیں۔افسانے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو شہر میں گٹر صاف کرتے ہیں اوران کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے۔وہ ایک کمرے کے لیے بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرتے ہیں۔اس کے جو کردار ہیں اس میں رمیش اور کملا مرکزیت کے حامل ہیں۔کملا کی ماں بھی صفائی کا کام کیا کرتی تھیں۔رمیش ایک انجانا سا شخص ہے کو جو کملا کی ماں سے اکثر ملنے آتا تھا۔کملا کی ماں کو بھی کمرے کی ضرورت تھی اور رمیش ہی کی مدد سے ان کو کمرہ ملا تھا جہاں کملا اور اس کی ماں رہتی تھیں۔اکثر لوگ کملا کو حرامی کہہ کر پکارتے تھے اور وہ جب بھی اپنی ماں سے اس تعلق سے سوال کرتی تو اس کی ماں خاموش ہی رہتی تھی جس کی وجہ سے اس کے اندر کی بے چینی اور بڑھ جایا کرتی تھی۔ماں کے مرنے کے بعد اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔کرایہ نہ دینے کی وجہ سے مالک مکان نے اسے نکال دیا تھا جس کی وجہ سے کملا کی پریشانی بڑھتی گئی اور وہ در در بھٹکنے لگی تھی آخر میں رمیش کی مدد سے اس کو ایک ٹوٹا پھوٹا کمرہ مل گیا تھا لیکن اس کرایہ دینے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے جس کی وجہ سے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ جانے کب اس کے سر سے یہ بھی چھت چھین جائے اور وہ کھلے آسمان کے نیچے رات گذارنے پر مجبور ہو جائے اور کسی کی جنسی ہوس کا شکار ہو جائے کیوں کہ جس معاشرے میں وہ رہتی تھی وہاں آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے۔

اس افسانے کا تانا بانا متذکرہ واقعات پر منحصر ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مجبور اور کمزور عورت کا کس طرح مرد سماج غلط فائدہ اٹھا کر اس کا جنسی استحصال کرتا ہے۔اس جنسی استحصال کو مرکزی موضوع بنا کر اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس افسانے میں ایسے کوئی مسائل نظر نہیں آتے ہیں جو انسانی زندگی کے لوازمات میں سے اہمیت کے حامل ہوں۔یہ افسانہ بھی ان کی جذباتی تحریر معلوم ہوتی ہے۔

فن کے اعتبار سے اس کے اندر بھی افسانہ نگار نے خود کہانی کو بیان کیا ہے۔کردار نگاری اور مکالمہ نگاری بہت کم ہے۔مثال کے طور پر اقتباس دیکھیں:۔

''میونسپلٹی نے چماروں کی بستی میں میونسپلٹی ہی کی زمین پر ان کے لیے کوارٹر

بنائے تھے لیکن اس کوارٹر میں ایک کمرے کا حصول کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اس کے لیے چھوٹے بڑے افسروں کی مٹھی چاپی کرنی پڑتی تھی۔ اکثر اوقات یونین کے قریب ہونا بھی ضروری ہوتا تھا۔ یا پھر میونسپلٹی میں جو سیاسی پارٹی بورڈ بناتی تھی اس کے حمایتوں کا بول بالا رہتا تھا اور انھیں آسانی سے کمرے مل جاتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے یہاں کمرے حاصل کر لینے کے بعد کرائے پر دے دئے تھے اور خود کسی فٹ پاتھ پر قبضہ جما کر سر چھپانے کے لیے ایک چھاؤنی ڈال لی تھی۔''2

یہ اقتباس بیانیہ ہے۔ افسانے میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ سادہ، سلیس ہے۔ اس میں روانی اور سلاست ہے۔ افسانے کی جملوں کی ساخت مضبوط اور مستحکم ہے۔ زبان کے اعتبار سے ان کا یہ بھی افسانہ اچھا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے ان کے اس افسانے کا موضوع نسائی ہے۔

افسانہ ''آخری سرے کی کھوج'' ایک مختصر افسانہ ہے جس کو شہناز نبی نے علامتی انداز میں لکھا ہے۔ اس افسانے میں انسانی زندگی کی افراتفری کو اس طرح سے دکھایا گیا ہے کہ انسان دنیا میں بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور سب کچھ پا لینے کی اس خواہش میں اپنی پوری زندگی کو جھونک دیتا ہے اس کے باوجود بھی اس کی ساری مرادیں پوری نہیں ہو پاتی ہیں۔ افسانے میں تین دوست ہیں جو جنگل کی طرف شکار کی غرض سے جاتے ہیں۔ اس میں سے ایک دوست جنگل کی دشوار گذار راہوں سے گذرتا ہے اس کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ میں جنگل کی ان دشواریوں کو پار کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ وہ آگے ہی بڑھتا جاتا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا ہے کیوں کہ اس نے یہ بھی سنا ہوتا ہے کہ اس جنگل میں جو بھی پیچھے مڑ ر دیکھتا ہے وہ پتھر کا ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں جنگل علامت ہے دنیا کی جس میں انسان بس آگے ہی بڑھتا رہتا ہے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ سب کچھ حاصل کرنے کا جذبہ اس پر غالب رہتا ہے۔ یہی اس افسانے کا موضوع ہے جو کہ علامتی ہے۔ افسانے میں جو کردار ہیں وہ واحد غائب، متکلم، اور حاضر ہیں جس میں وہ، میں اور تم ہیں۔ اس کے اندر خود کلامی موجود ہے جس سے مرکزی کردار خود سے بات کرتا ہے اور زندگی کے مسائل کو خود سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اتنی جلدی۔کیا مطلب۔؟

میں جانے کب سے اس جنگل میں بھٹک رہا ہوں ۔میرے ساتھی مجھے چھوڑ کر کہیں اور نکل گئے ہیں ۔یا شاید میں انھیں تلاش کرنے کی کوشش میں کہیں اور نکل گیا ہوں۔ مجھے پتہ نہیں میں ان سے دور جارہا ہوں یا وہ مجھ سے۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہمارے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں۔

ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ فاصلے مٹ رہے ہوں۔ چہرے نے جواب دیا۔

لیکن میں کیسے سمجھوں۔

تم نئے دوست بنالو۔

لیکن یہاں تو کوئی نظر ہی نہیں آتا۔

تم یہاں رہنے لگو گے تو یہاں کے ماحولکو جان جاؤ گے اور یہ بھی جاننا مشکل نہ ہوگا کہ کس سے دشمنی رکھنی ہے اور کس سے دوستی۔

لیکن میں کسی سے دشمنی کیوں رکھنے لگا۔

جنگل کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ یہاں زہر کو زہر کاٹتا ہے۔'' 3

اس افسانے کو شہناز نبی نے اپنے خاص موضوع سے ہٹ کر لکھا ہے۔اس افسانے میں وحدت تاثر موجود ہے جو قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔یہ بھی ایک بیانیہ افسانہ ہے۔زبان و بیان سادہ، سلیس ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں جس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں ہے۔قرات اور تفہیم دونوں ہی آسان ہیں۔

شہناز نبی کے یہ افسانے ایسے ہیں جن میں دو افسانوں کے موضوع میں یکسانیت ہے اور وہ موضوع نسائی مسائل کے ہیں۔لیکن افسانہ'' آخری سرے کی کھوج'' کا موضوع ان سے مختلف ہے۔اور شہناز نبی کا یہی افسانہ ان کے باقی دونوں افسانوں سے موضوع اور فن دونوں لحاظ سے اچھا ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور افسانہ نگاری میں بھی اپنے زور قلم کو آزمانے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے دو چار افسانے ہی لکھا اور اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

تراجم:

انسانوں کے درمیان باہمی تعلقات میل جول میں سب سے زیادہ اگر کوئی چیز حائل ہوتی ہے

تو وہ زبان ہے کیونکہ ہر ملک اور ہر خطے کی اپنی الگ الگ بولیاں اور زبان ہوتی ہے۔اس فرق کو دور کرنے کے لیے ترجمے نے اہم رول ادا کیا ہے۔انسان کی ترقی کی تاریخ میں تراجم کی قدرومنزلت بہت زیادہ ہے۔انسانی تہذیبی و تمدن کے پروان چڑھنے میں جہاں بہت سارے عوامل ہیں وہیں ترجمہ کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ترجمے کے ذریعے مختلف قوم اور مختلف نسل کے لوگ ایک دوسرے سے اپنی ضروریات ولوازمات کو پورا کرتے ہیں اور اپنے تعلقات بڑھاتے ہیں۔گلوبلائیزیشن کے اس دور میں جہاں دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔دنیا میں کہیں کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہوں تو اس کی اطلاع دنیا کے مختلف خطے میں رہنے والے انسانوں کو ہو جاتی ہے گرچہ وہ الگ الگ زبان بولتے ہو اور الگ الگ تہذیب کے پاسبان ہوں۔

ترجمے کی اہمیت ہر دور میں مسلم ہے۔ملکی اور بین الاقوامی سطح پر روابط بڑھانے میں ترجمہ ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک ملک دوسرے ملک کی باتوں کو سمجھتا ہے۔اسی طرح ادب میں بھی ترجمے نے شروعاتی دور سے اردو ادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں کام انجام دیا ہے۔اردو زبان کے ارتقا کے ابتدائی دور میں دوسری زبان کے سرمائے اردو میں ترجمے ہوئے جس میں داستان، ناول، مثنوی، افسانے وغیرہ شامل ہیں۔اردو شاعری کو صنف مثنوی کے ذریعے بہت فروغ ملا۔اسی طرح ہر اصناف کے ترجمے ہوئے۔جس سے اردو زبان کے سرمایے میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

شہناز نبی نے کئی زبان کے ترجمے کیے ہیں جیسے اردو زبان سے بنگلہ زبان میں، بنگلہ زبان سے اردو زبان میں، اردو زبان سے ہندی زبان میں اور ہندی زبان سے اردو زبان میں ان کے تراجم موجود ہیں۔شہناز نبی نے ناول، ڈراموں اور نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے کرشن چندر کے ناول ''غدار'' کا ترجمہ بنگلہ زبان میں ''بشاش گھاتک'' کے نام سے کیا جو کافی مقبول ہوا۔

شہناز نبی نے ''بچوں کے ڈرامے'' کے نام سے بنگلہ زبان کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔یہ کتابی شکل میں پہلی بار 1989 میں اور دوسری بار 2016 میں شائع ہوا۔اس کتاب میں انھوں نے چھ بنگلہ ڈرامانگاروں کے ڈراموں کو شامل کیا ہے جس میں رابندرناتھ ٹیگور کے بنگلہ ڈرامے کا اردو ترجمہ ''بیمار کا دوست''، کے نام سے، سوکمار رائے کے ڈراما ''حاسد'' کے نام سے سونیرمل بوسو کے ڈراما ''مشکل آسان'' کے نام سے، انا داشنکر رائے کے بنگلہ ڈرامے کو ''افواہ'' کے نام سے، میہیر سین کے ڈراما کا ''انجمنِ دختران لاپرواہ'' کے نام سے اور رودر پرساد چکرورتی

کے ڈرامے کا ''پرومیتھیوس کی سزا'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

شہناز نبی ڈرامے کے فن پر دسترس رکھتی ہیں۔انھوں نے کئی ڈرامے تخلیق کیے ہیں اس کے ساتھ ہی دوسری زبانوں کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔اکثر ان کے تراجم بنگلہ زبان اور ہندی زبان کے ہیں۔انھوں نے ڈراموں کا ترجمہ کرتے وقت کرداروں کے نام وہی رکھے ہیں جو اصل ڈراموں کے ہیں۔کرداروں کی بات چیت کا انداز بھی ایسا رکھا ہے جو اصل ڈراموں سے میل کھاتے ہوں۔کچھ جگہوں پر انھوں نے صیغہ میں تبدیلی کی ہے جیسے 'تم' کی جگہ 'تو' اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ڈراموں کے ترجمے کا طریقہ کار اکثر لفظی ہے۔بچوں کے ڈراموں میں انھوں نے اصل مصنف کی بات کو رکھا ہے۔کردار، ماحول ومقامات بھی وہی رکھا ہے جو اصل ڈرامے کے ہیں۔اصل ڈراما نگاروں کی منشاء کا خیال رکھا ہے اور ان کے نقطۂ نظر میں کوئی ردو بدل نہیں کی ہیں۔انا داشنکر کے ڈرامے کے اردو ترجمے کا اقتباس ملاحظہ ہوں جا اے یہ انداز لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کس طرح اصل ڈراما نگار کی منشاء کا لحاظ رکھا ہے۔

''(اسٹیشن پر ستیہ چرن مصطفیٰ سامان گن رہے ہیں۔اسی وقت شمبھو چرن دے آتے ہیں)

شمبھو :سٹیشن میں کیوں ہیں جی، ستیہ چرن مصطفیٰ۔۔۔؟

ستیہ :کون؟ ارے۔۔۔۔شمبھو دے۔۔!
جا تا ہوں میں ہائے۔۔۔۔۔بیگوسرائے

شمبھو :بیگوسرائے۔۔۔۔بیگوسرائے۔۔۔۔؟ ایسی بھی کیا جلدی تھی۔۔۔۔۔بولو تو کیا مرضی تھی۔۔۔۔؟

ستیہ :لوگوں سے سنتے ہیں ہم، کلکتے میں پھٹا ہے بم۔۔۔کلکتے میں پھٹا اگر۔۔۔گڑ بتیا میں بھی ہے ڈر

شمبھو :سچ مچ۔۔۔۔؟ واقعی۔۔۔۔۔؟ ایسا ہی پھر میں کیوں رہ جاؤں جی۔۔۔؟ گڑ بتیا میں پھٹا اگر۔۔۔اب بانکوڑا میں ہے ڈر

ستیہ :کالو مستری کا وہ کہنا۔۔۔۔بیوی کا رو رو کر مرنا۔۔۔۔بچے

بالے کے ہمراہ۔۔۔۔جیسے تیسے بھاگا۔۔آہ۔۔۔!

شمبھو : تب تو میں بھی کھسکوں اب۔۔۔۔جانا ہوگا جام تاڑا۔۔۔۔

پاس نہیں ہے ریل بھاڑا (کرایہ)'' 4

ڈرامے کے اس سین میں اصل ڈرامے کا جو طنز و مزاح ہے وہ ترجمے کیے گئے اس سین میں بھی دکھائی دے رہا ہے کرداروں اور مقامات کا نام بھی اصل ڈرامے کے ہیں۔کرداروں کا لب ولہجہ اور مکالمہ بھی اصل ڈرامے کی مطابقت سے لکھے گئے ہیں۔اس کا اندازہ ڈرامے کے اس سین کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

شہناز نبی نے ڈراموں کے ترجمے کے لیے ایسے بنگلہ ڈراموں کا انتخاب کیا ہے جس میں طنز و مزاح اور لطیفے موجود ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ان ڈراموں کا ترجمہ بچوں کے لیے کیا ہے۔کرداروں کے مکالمے بہت چھوٹے اور خوش آہنگ،مزاح کی چاشنی سے بھرپور ہیں جس سے بچوں کی رغبت اور شوق ڈرامے کو پڑھنے اور دیکھنے کی طرف ہوتی ہے۔رابندر ناتھ ٹیگور کے بنگلہ ڈراموں کا ترجمہ''بیمار کا دوست'' کے نام سے کیا ہے جس میں منظر ہے ریل کا ڈبہ اور کردار ہیں دکھی رام اور ویدناتھ۔اس ڈرامے میں بچوں کی اس کھیل کی کیفیت کھل کر سامنے آتی ہے جس میں بچے ریل گاڑی وغیرہ کے کھیل کھیلتے ہیں۔اس ڈرامے کا ایک سین ملاحظہ ہو:۔

''دکھی رام : اس وقت آپ کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ویدناتھ : ضرورت تو میں سمجھ رہا ہوں لیکن کیا کروں یہ تو بتائیے۔

دکھی رام : آپ کیا ایلوپیتھی علاج کرا رہے ہیں؟

ویدناتھ : جی ہاں

دکھی رام : ایلوپیتھی تو زہر ہے زہر۔مرض سے زیادہ دوا بھیانک۔۔۔

ملک الموت سے زیادہ ڈاکٹر خوفناک۔۔۔۔!

ویدناتھ : (سہمی ہوئی آواز میں) اچھا تو کیا کرنا چاہیے؟ ہومیوپیتھی دکھاؤں۔

دکھی رام : (منہ بنا کر) ہومیوپیتھی تو صرف پانی کا کاروبار ہے!

ویدناتھ : تو کیا وید کو دکھاؤں؟

دکھی رام : اس سے تو بہتر ہوگا کہ افیم کو تو تیا کے پانی میں گھول کر ہرے کا

تیل ملا کر پی لیا جائے۔!

ویدناتھ :توبہ! توبہ! اچھا آپ ہی بتایئے میں کیا کروں؟

دکھی رام :اب کچھ نہ ہوسکتا۔ کوئی صورت نہیں ہے۔ میں آپ کو پہلے ہی صاف صاف کہہ چکا ہوں۔

ویدناتھ :دیکھیے میں بیمار آدمی ہوں۔ مجھے یوں ڈرانا نہیں چاہیے۔

دکھی رام :ڈر کیسا؟ یہ دنیا تو صرف دکھوں ہی کا گھر ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ یہ اُمڈتے ہوئے مایوسی کے بادل، ایک ہاہا کر مچی ہے یہاں ہم سب ایک زہریلے ناگ کے بل میں جی رہے ہیں۔ یہاں سے رخصت ہونا ہی اچھا ہے۔

(ٹھنڈی سانسیں)''5

اس اقتباس میں جو کردار مکالمے پیش کرتے ہیں اس کی ہیئت اور کیفیت اس طرح سے ہے جیسے بچے کھیل کے وقت ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر الگ الگ طرح کی باتیں کرتے ہیں جس میں دکھ ہوتا ہے اور ان کے دکھ میں مزاح اور مایوسی دونوں ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح کی کیفیت اس ڈرامے کے مکالمے میں بھی ہے جس میں زہر و موت کی بات ہے لیکن اس میں بھی مزاح پیدا ہو گیا ہے۔

شہناز نبی نے ان ڈراموں کے ترجمہ کرتے وقت بہت ساری چیزوں کا خیال رکھا ہے جس میں زبان، واقعہ، کردار اور مکالمے ایسے رکھے ہیں جس میں دلچسپی کے وہ سارے ممیّزات موجود ہیں جو بچوں کے ذہن کو ڈرامے سے منسلک کرتے ہیں اور وہ ایسے ڈرامے دیکھنا پسند کرتے ہیں جو ان کی طبیعت اور زندگی سے میل کھاتے ہوں۔ اس لیے شہناز نبی بچوں کے ڈرامے کے لیے ترجمے کی خاطر ایسے ڈراموں کا انتخاب نہیں کیا ہے جس میں کوئی باریک فلسفہ ہو جو بچوں کے ذہن سے دور ہو اور اس بنا پر بچے ڈراموں کو پڑھنے یا دیکھنے سے کترائیں۔

شہناز نبی نے ڈراموں کے ساتھ بنگلہ اور ہندی نظموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے جو مختلف رسالوں اور جرائد میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے جو ترجمے کیے ہیں اس میں ادبی اور علمی ترجمے ہیں اور یہ ترجمے لفظی، مفہومی اور تخلیقی ہیں۔ شہناز نبی نے جو منظوم ترجمے کیے ہیں اس کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے اس میں ترجمے کی یہ تینوں قسمیں موجود ہیں۔ ترجمے کے فن پر ان کو دسترس حاصل ہے جس کی بنا پر جو منظوم ترجمے ہیں اس میں ایسے جملے اور

الفاظ نہیں ہیں جو نظموں کے مفہوم کو ظاہر نہ کر پائے۔ سادہ اور سلیس انداز میں انھوں نے ترجمے کیے ہیں بنگلہ زبان کے مشہور شاعر جیبا نند داس کی نظم ''بین لتا سین'' کا ترجمہ انھوں نے کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

ہزاروں برسوں سے زمین کی یاترا کر رہا ہوں
رات کی تاریکی میں
سیلون کے بحری سفر سے ملایا کے سمندر تک
بہت گھوم چکا
بمبئی سار اور اشوک کے خاک آلود شہروں میں
بہت دور تک وِدربھ کے نگر میں
ایک تھکی ہاری جان ہوں میں
چاروں جانب زندگی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر
بس دو چار لمحے سکون کے گذرے
ناٹور کی بن لتا سین کے ساتھ
اس کے بال ایسے سیاہ جیسے گمشدہ ودیشائی کالی راتیں
اس کا چہرہ جیسے سرسوتی کے حسین نقوش
اسے یوں دیکھا جیسے
بہت دور سمندر کے اس پار
شکستہ پتوار لیے کوئی مانجھی دیکھتا ہو
اس اندھیرے میں
سبز گھاس والے دیس کے بیچ دار چینی کا ایک
جزیرہ جیسے
پنچھی کے آشیانے جیسی گہری آنکھیں اٹھا کر پوچھا
ناٹور کی بن لتا سین نے
اتنے دن کہاں رہے تم۔؟6

جیبا نند داس کی نظم ''بن لتا سین'' کا ترجمہ شہناز نبی نے اس طرح سے منظوم ترجمہ کیا ہے جس کو پڑھنے کے

بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس ترجمے میں منشائے مصنف پر زیادہ زور دیا ہے اور انھوں نے اس نظم کے ترجمے میں زیادہ تر لفظی ترجمے کا سہارا لیا ہے۔ نظم کا جو نام ہے 'بن لتا سین' منظوم ترجمے میں بھی انھوں نے وہی نام رکھا ہے۔ نظم کے اندر کچھ ایسے الفاظ مرقوم ہیں جو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ لفظی ترجمے ہیں جیسے:۔ ''بمبئی سار اور اشوک کے خاک آلود شہروں میں۔۔۔ بہت دور ودربھ کے نگر میں'' نظم کے اس ٹکڑے میں انھوں نے اس کے اصل خالق کے خیال اور اس کی منشاء کا خیال رکھتے ہوئے انھوں اس کا لفظی ترجمہ اس طرح سے کیا ہے کہ اصل نظم کے کچھ الفاظ کو ہدف نظم میں ویسے ہی رکھ دیا ہے جیسے الفاظ 'ودربھ کے نگر میں'۔ ترجمہ کرتے وقت شہناز نبی نے ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جس کے اندر دلکشی اور جاذبیت موجود ہوں۔ ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس میں اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے دونوں زبان پر مترجم کو مہارت اس طرح سے ہو کہ اگر وہ اصل عبارت کا ترجمہ کرے تو اس کی معنویت مفقود نہ ہو یعنی وہی معنویت ترجمے کے ہدف میں موجود ہو ورنہ ترجمے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لیے شاعری اور نظموں کے ترجمے کے لیے مترجم چھان پھٹک کر الفاظ چنتا ہے اور اصل الفاظ کے متبادل کے طور ویسے ہی الفاظ لاتا ہے۔ شہناز نبی نے بھی اس نظم میں ایسے ہی الفاظ کا استعمال خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

بنگلہ کے ایک اور شاعر روندر ناتھ چکرورتی کی نظم کا ترجمہ شہناز نبی نے اردو میں ''میرے اندر کوئی گروہ نہیں'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس نظم کا انھوں نے مفہومی ترجمہ کیا ہے جس کی وجہ سے نظم میں روانی اور سلاست موجود ہے۔ کہیں کہیں نظم کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی صفت کو بھی بروئے کار لایا ہے۔ نظم کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

''میرے اندر کوئی گروہ نہیں
میرے اندر گروہ بنانے کی کوئی خواہش نہیں
سفید، کالا، سرخ، نیلا، گیروا، زعفرانی، بادامی
ہر رنگ کا کھیل دیکھتا جاتا ہوں
اکیلا
گھر کی جانب لوٹ آتا ہوں

جاتے جاتے دھول، مٹی، گرد، گھاس میں
کچھ تعریفیں رکھ جاتا ہوں
دیکھتا ہوں سوکھے پتے اڑ رہے ہیں
شام کو ہوا میں ادھر ادھر
میرے پیچھے یہاں کوئی نہیں
میں نے کبھی کسی کو پکار کر یہ نہیں کہا
چلو چلیں'' 7

اس منظوم نظم کو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ ہم کوئی تخلیقی نظم پڑھ رہے ہوں۔ ترجمے کا گمان بہت کم ہوتا ہے۔ شہناز نبی کے اس منظوم ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو رواں دواں ہیں جس سے اصل نظم کی اہمیت اور ترجمے کا مقصد پورا کرنے میں وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔

اسی طرح روندر ناتھ چکرورتی کی اور دوسری بنگلہ نظموں کا ترجمہ انھوں نے کیا ہے جس میں 'گپ کا موضوع'، 'دیوار'، 'اپنے ہاتھوں، اپنی زبان میں'، 'ننگا راجہ' وغیرہ۔ ان تمام نظموں کے تراجم میں شہناز نبی نے آزاد نظم کی ان ممیّزات کو برتا ہے جس کی وجہ سے بنگلہ سے اردو میں ترجمے کے باوجود بھی ان میں آزاد نظم کی شکل و ماہیت برقرار رہے اور ترجمہ کرنے سے نظم کے وصف میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ جب ہم ان ترجمہ شدہ نظموں کو پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ اردو زبان ہی کی آزاد نظمیں ہیں۔ اردو کے تشبیہ، استعارے، علامات وغیرہ جو اردو شاعری میں رائج ہیں ان کے منظوم ترجمے میں موجود ہیں جس کی وجہ سے تخلیقیت کا اثر ان کے تراجم میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

روندر ناتھ چکرورتی کے علاوہ انھوں نے بہت سارے بنگلہ نظم نگاروں کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے ان میں جس میں پرمیندر مترا کی نظم ''دل کی دراڑیں'' کے نام سے، بشنو دے کی نظم ''آرزو'' کے نام سے، چٹو پادھیائے کی نظم ''پیڑ بولتے ہیں'' کے نام سے، سبھاش مکھو پادھیائے کی نظمیں ''چلتے چلتے''، ''دن کے خاتمے پر''، 'گرتا ہوا شہر' ''ماں تو رو'' کے نام سے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ بنگلہ کے مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام کی نظموں کا ترجمہ انھوں نے زیادہ کیا ہے ان نظموں میں ''آج تخلیقی طمانیت کے انبساط میں''، ''تمنا''، ''بددعا''، ''افلاس''، ''طائر سینہ فگار'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شہناز نبی نے بنگلہ کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کی نظموں کا بھی اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے جس میں سرویشیور دیال شکسینہ کی کئی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جیسے ''بھیڑیا۔1''،''بھیڑیا۔2''،''بھیڑیا۔3''اور''بھوک'' وغیرہ۔سداما پانڈے دھومل کی نظم کا ''مناسب کارروائی'' کے نام سے،کیدارناتھ کی نظموں کا ''روٹی''،''جو ایک عورت کو جانتا ہے'' کے نام سے،کنول کی ہندی نظموں کا ''میں تمہارے دروازے پر کھڑا''،''دن خوابوں کو راحت دینے کے لیے بنا''،''تمہاری اداسی کو میں نے اپنی جیبوں میں بھرا'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ہندی کے مشہور شاعر سچیدانند ہیرانند واتسیاین اگیئے کی نظموں کا اردو میں ''ہم نے پودے سے کہا'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

شہناز نبی نے ہندی کی ان نظموں کا ترجمے کے لیے انتخاب کیا ہے جس کے اندر زیادہ تر نسائی اور تانیثی مسائل ہیں جو ان کا خاصا ہے۔ان کی دلچسپی ایسے موضوعات میں زیادہ ہیں جن میں عورتوں پر ظلم ہوا ہو اور ان کا استحصال کیا گیا ہو۔ان واقعات و حادثات کو وہ بڑی بیباکی اور جذباتی انداز میں لکھتی ہیں چاہے وہ شاعری ہو یا ڈرامے یا پھر ترجمے۔اس پس منظر میں دیال شکسینہ کی نظم ''بھیڑیا۔3'' ملاحظہ ہوں جس میں علامت کے ذریعے مردوں کے استحصال کو دکھایا گیا ہے۔

''بھیڑے پھر آئیں گے
اچانک
تم میں ہی سے کوئی ایک دن
بھیڑیا بن جائے گا
اس کی نسل بڑھنے لگے گی
بھیڑیے کا آنا ضروری ہے
تمہیں خود کو جاننے کے لیے
بے خوف ہونے کا سکھ جاننے کے لیے
مشعل اٹھانا سیکھنے کے لیے
تاریخ کے جنگل میں
ہر بار بھیڑیا ماند سے نکالا جائے گا
آدمی ہمت کے ساتھ متحد ہو کر

مشعل لیے کھڑا ہوگا

تاریخ زندہ رہے گی اور تم بھی

اور بھیڑیا۔؟''8

ایسی ہی کچھ ہندی نظموں کا انھونے نے ترجمہ کیا ہے جس میں علامت کے ساتھ انسانی زندگی کے نصیب وفراز کا ذکر ملتا ہے۔اس تعلق سے سدا ما پانڈے دھومل کی کئی نظموں کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے جس میں نظم ''مناسب کارروائی'' قابل ذکر ہے۔ یہ ایک طویل آزاد نظم ہے جس کے اندر عصر حاضر کے قانون کا ذکر ہے جو انصاف کے بجائے ظالموں کا ساتھ دیتا ہے۔اس نظم کے ترجمے میں شہناز نبی نے اصل نظم کی مناسبت سے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو اصل مواد کی معنویت اور حسن کو برقرار رکھتا ہے۔اس کا ترجمہ کرت وقت انھوں نے تخلیقیت کا سہارا لیا ہے جس کی وجہ سے جب ہم اس نظم کو پڑھتے ہیں تو اس نظم پر ترجمہ نہیں بلکہ تخلیقی نظم کا گمان ہوتا ہے۔

اسی طرح کیدار ناتھ کی نظمیں ''روٹی'' اور ''جو ایک عورت کو جانتا ہے'' ہے کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔دونوں ہی نظمیں موضوع کے اعتبار سے منکشف ہیں۔''روٹی'' کے منظوم ترجمے میں انسان کے روزی روٹی کے مسئلے کو دکھایا گیا ہے اور انسان کے لیے روزی روٹی کا مسئلہ بڑا ہی سنگین ہوتا ہے۔روزی حاصل کرنے کے لیے انسان بہت تگ ودو کرتا ہے لیکن پھر بھی ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو روزگار میسر نہیں ہو پاتے ہیں۔اس نظم کا تانا بانا اسی پر منحصر ہے۔نظم ''جو ایک عورت کو جانتا ہے'' میں عورت پر ہو رہے ظلم اور ان کے مسائل کا ذکر ہے۔ان تمام نظموں کا ترجمہ شہناز نبی نے بڑی ہنرمندی سے کیا ہے اور ترجمہ کرتے وقت ان چیزوں کا خیال رکھا ہے جو ترجمے کے فن اور اصولوں کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔شہناز نبی نے اس بات کا بھی خاص خیال رکھا ہے کہ ترجمہ کی گئیں نظمیں اس کے اصل نظم کے تخلیق کاروں کی منشاء کے مطابق ہوں اور ترجمے کے بعد اصل اور ہدف میں زیادہ کمی بیشی نہ ہوں۔

مذکورہ بالا ہندی شاعروں کی نظموں کے ترجمے کے علاوہ شہناز نبی نے معاصر ہندی نظموں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔اس تعلق سے اسی سال جنوری 2022 میں جدید ہندی نظموں پر مشتمل ان کی ایک کتاب منظر عام پر آ چکی ہے۔اس کتاب کا نام بھی انھوں ''جدید ہندی نظمیں'' رکھا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ہندی کے 20 نظم نگاروں کا تعارف کے ساتھ ان کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔درج ذیل سطروں میں میں شاعر کا نام اور ان کی

ان نظموں کی تفصیل پیش کی جارہی ہے جس کا اردو ترجمہ شہناز نبی نے کیا ہے۔

1۔ سچیدا نند ہیرا نند واتسیاین اگیہ

نیا شاعر۔ دیکھیے نا میری کارگذاری۔ جاڑے کی چاندنی برسی۔ میرے دیش کی آنکھیں۔ جو پل بنائیں گے۔ ادھار۔ وصیت۔

2۔ ویدیاناتھ مشر ناگ ارجن

میری بھی چمک ہے اس میں۔ جو کام مکمل نہ ہو سکے۔ پریت کا بیان۔ کھردرے پیر۔ سنگ تمہارے۔ ساتھ تمہارے۔

3۔ گنجانن مادھو مکتی بودھ

مجھے قدم قدم پر۔ رات چلتے ہیں اکیلے ہی ستارے۔ سرمایہ دارانہ سماج کے لیے۔ میں تم لوگوں سے دور رہوں۔

4۔ شکنت ماتھر

دوپہری۔ ڈر لگتا ہے۔ پانی بہت برسا۔ جی لینے دو۔ کوئی بات نہیں

5۔ کنور نارائن

بہت کچھ دے سکتی ہے نظم۔ یقین کی جلد بازی سے۔ گھر پہنچنا۔ موت نے کہا۔ آوازیں۔ آخری اونچائی۔ ایک درخت کی موت۔ عجیب مشکل۔

6۔ سرویشور دیال شکسینہ

بھیڑیا (1)۔ بھیڑیا (2)۔ بھوک۔ مجھے جنگل کی یاد مت دلاؤ۔ لفظوں کا ٹھیلا۔ عمر جوں جوں بڑھتی ہے۔ کوٹ۔ دیش کاغذ پہ بنا نقشہ نہیں ہوتا۔

7۔ رگھوویر سہائے

خودکشی کے خلاف۔ لوگ بھول گئے ہیں۔ مرگھٹ۔ غلامی۔ کہیں جانا منع ہے۔ سمجھوتہ۔ دیش میں رہنا۔

8۔ شری کانت ورما

مگدھ۔ ہستناپور۔ کوسل میں سوچ کی کمی۔ ٹرائے کا گھوڑا۔ کچھ کا برتاؤ بدل گیا ہے۔ جلسہ گھر۔ ایک مردے کا

بیان۔ ہون۔

9۔ کیرتی چودھری

پنکھ پھیلائے۔ بہت دنوں کے بعد۔ ایک شام۔ سرحد کی لکیر۔ وقت

10۔ سداما پانڈے دھومل

مناسب کارروائی۔ روٹی۔ قصۂ جمہوریت۔ بغاوت۔ غریبی۔ نظم۔ بیس سال بعد۔ جمہوریت کے طلوعِ آفتاب میں۔

11۔ کیدار ناتھ سنگھ

جو ایک عورت کو جانتا ہے۔ حق دو۔ مجھے یقین ہے۔ اکال میں سارس۔ پیش لفظ۔ شیر۔

12۔ سمن راجے

نظریہ۔ تلوار۔ تیراندازی۔ انتظار

13۔ وشنو کھرے

نیند میں۔ آج بھی۔ التماس۔ عکس۔ ہر شہر میں ایک بدنام عورت ہوتی ہے۔ کہو تو ڈرو۔

14۔ لیلا دھر جگوڑی

اپنے اندر سے باہر آجاؤ۔ پیڑ۔ پہاڑ پر راستے۔ سیڑھی۔ قاتل۔ ایشور اور آدمی کی بات چیت۔ اکیسویں صدی کا آدمی۔

15۔ اشوک واجپئی

ایک نوجوان جنگل۔ ایک بار جو ڈھل جائیں گے۔ کوئی نہیں سنتا چیخ۔ چھتری۔ وقت سے گذارش۔ پہلا بوسہ

16۔ راجیش جوشی

مارے جائیں گے۔ کام پہ کیوں جا رہے ہیں بچے۔ پاؤں کی نس۔ حکمراں ہونے کی خواہش۔ دنیا کا چکر۔ مایوسی۔ بھولنے کی بھاشا۔ چڑیاں وغیرہ۔

17۔ منگلیش ڈبرال

بچی ہوئی جگہیں۔ پرانی تصویریں۔ یہ نمبر موجود نہیں ہے۔ غیر موجودگی۔ اداکاری۔ آسان شکار۔ اس عورت

کا پیار۔

18۔وشنو ناگر

2020میں گاؤں کی طرف۔ جینے لائق۔مرا ہوا آدمی۔رونا۔طاقت۔ پانی ہوں اس لیے۔لاک ڈاؤن کے بیچ پٹری پہ نیند۔

19۔اودے پرکاش

صفدر ہاشمی کی یاد میں۔تبت۔دعا۔نیم کی پتی۔ایک ٹھگے گئے مردے کا بیان۔داستانِ لاپتہ۔

20 گیت چترویدی

محبت کی نظم۔آلاپ میں گرہ۔ان لوگوں کے بارے میں جنہیں میں نہیں جانتا۔ایک انچ۔بولنے سے پہلے۔ ایک کشمیری بچے کا خط(1۔2)

شہناز نبی کے ان نظموں کے تراجم کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اصل نظم کی ضرورت کے تحت تراجم کے اصول وضوابط کو اختیار کیا ہے۔جن نظموں کا انھوں نے ترجمہ کیا ہے ان میں سے اگر کسی کا ترجمہ کرتے وقت اردو میں اس کا مفہوم ظاہر نہیں ہو پارہا ہو تو اس کے لیے انھوں نے تخلیق کا سہارا لیا ہے اور اگر اصل نظم کا مفہوم بنا کسی دشواری کے ترجمے کے الفاظ سے سمجھ میں آجاتے ہیں تو وہاں انھوں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور اگر کہیں ایسی مبہم نظمیں ہیں جہاں اصل عبارت کا ترجمہ کرت وقت ایہام پیدا ہوتا ہے تو اس کے لیے انھوں نے تلخیص کا سہارا لیا ہے۔اس طرح شہناز نبی نے ترجمے کی تمام قسموں کے ذریعے دوسری زبان کے سرمایے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

سفرنامہ ''کشمیر جنت نظیر''

سفرنامہ 'سفر' سے نکلا ہے جو عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، کوچ کرنا۔سفر نامہ کو انگریزی میں Traveleogue اور ہندی میں 'یاترا ورتانت' کہا جاتا ہے۔عربی میں سفرنامے کو 'محاضرہ مصورہ عن رحلۃ' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے مصور سفرنامہ۔اس سے مراد ایسا سفرنامہ ہے جو ڈائری پر مشتمل ہے جس میں حالات اور واقعات کی تصویریں ہوتی ہیں۔سفر کے لیے نقل مکانی ضروری ہوتا ہے بغیر نقل مکانی کے سفر نہیں کہا جا سکتا ہے۔زندگی ایک مسلسل حرکت ہے اس لیے سفر کو زندگی کا استعارہ بھی کہا جاتا ہے۔

اردو ادب میں جس طرح بہت ساری اصناف نے ترقی کی اس میں سفرنامہ بھی ایک ہے۔ جہاں تک اردو سفر

نامے کے آغاز کا تعلق ہے تو اس کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اردو نثر اپنے ابتدائی منازل پر گامزن تھی۔ اردو سفر نامے کے ابتدائی نقوش فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں اس کے علاوہ سوانحی ادب اور خطوط میں بھی اس کے ابتدائی نقوش موجود ہیں۔ اردو کا اولین سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ ''عجائبات فرنگ'' تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کے بعد اور بھی سفر نامے لکھے گئے جس میں سفر نامہ ''ابن بطوطہ''، ''نگری نگری پھرا مسافر''، ''لبیک''، ''جاپان چلو جاپان چلو'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔سفر نامہ نگاری کی دنیا میں خواتین قلم کاروں نے بھی اس صنف میں اپنی جدا گانہ بنائی ہیں جس میں نشاۃ النساء کا سفر نامہ ''حجاز''، صغری بیگم حیا کا سفر نامہ ''سفر نامۂ یورپ''، ''سفر نامۂ عراق'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔اسی کی کڑی ایک سفر نامہ نگار شہناز نبی بھی ہیں جنھوں نے ''سفر نامہ کشمیر جنت نظیر'' لکھا ہے۔

شہناز نبی کا سفر نامہ ''کشمیر جنت نظیر'' 2018 میں مطبع ریڈ ینا سسٹم 77/1B، اے پی سی روڈ، کولکاتا۔9 سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔اس کے انتساب میں شہناز نبی نے یہ جملہ لکھا ہے 'ان حسین وادیوں کے نام جو انسانی تہذیب کی پہلی گواہ بنیں' جو کافی متاثر کن ہے۔ان کا یہ سفر نامہ کل 168 صفحات پر مشتمل ہے۔جگہ جگہ پر کشمیر میں بعض جگہوں پر لی گئی خوبصورت تصویریں منسلک ہیں جو سفر نامے میں جاذبیت پیدا کرتی ہیں۔اس سفر نامے کو انھوں نے باب کے تحت لکھا ہوا ہے۔ یہ کل گیارہ باب پر مشتمل ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا باب: چلتے ہو، کشمیر کو چلیے
دوسرا باب: سری نگر اور ہم
تیسرا باب: گلمرگ
چوتھا باب: شہنشاہ پیلس اور ڈل جھیل
پانچواں باب: چرارِ شریف اور حضرت بل
چھٹا باب: پرتاپ پارک کے آس پاس
ساتواں باب: پہلگام
آٹھواں باب: کشمیر بند ہے
نواں باب: دانشورانِ کشمیر کے درمیان

دسواں باب: چلتے چلتے

گیارہواں باب: بعداز کشمیر

اس سفرنامے میں شہناز نبی نے کشمیر کے جن مقامات کی سیاحت کی ہے اوران مقامات کے رنگ وروپ کو اپنے سفرنامے میں قلم بند کیا ہے۔جن جگہوں کا خصوصاً انھوں نے سفر کیا ہے اس میں سری نگر، گلمر گ، راجہ ہری سنگھ کا محل، ڈل جھیل، حضرت بل وغیرہ ہیں۔انھوں نے اپنے سفرنامے کی روداد میں سفرنامے کے پہلے کے لوازمات کو صفحۂ قرطاس پر لایا ہے۔کشمیر جس کو جنت کہا جاتا ہے اسکے بارے میں بہت ساری معلومات شہناز نبی نے سفر کرنے سے پہلے ہی اکٹھا کرلیا تھا اور سفرنامہ لکھتے وقت ان باتوں کو درج کیا ہے جیسے سری نگر میں علامہ اقبال کے تعلق سے انھوں نے سن وار لکھا ہے کہ پارک کب بنا اس کی افتتاح کب ہوئی۔اسی جو محلات ہیں اس کے بارے میں بھی انھوں نے معلوماتی چیزوں کو لکھا ہے جن میں ان کی اونچائی چوڑائی کا ذکر کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی شہناز نبی نے ان مقامات کی منظرکشی بھی اچھے اور پراثر انداز میں کی ہے۔سفر کرتے وقت جن مقامات، محلات، باغات و پارک اور جھیل کو دیکھا اس کی منظرکشی ایسے کی ہے کہ ان میں ان تمام چیزوں کا ذکر ملتا ہے جو ان مقامات میں موجود ہیں۔ سیاحت کے دوران جن جگہوں پر انھیں کچھ کمی کا احسا ہوا ہے تو اس چیز کو بھی انھوں نے لکھا ہے۔مثال کے طور پر ڈل جھیل پر حکومت کی بے توجہی کا ذکر بڑے باکانہ انداز میں کیا ہے۔اس کیے اندر کی گندگی اور کوڑے کرکٹ کا پھینکا جانا جس کو دیکھ کر ان کو غصہ آیا اور اس غصے کا اظہار بھی انھوں نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

سفرنامے میں مجلس آرائی ایک اہم جز ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بات سے بات پیدا کرنا۔یہ خصوصیت شہناز نبی کے اس سفرنامے میں موجود ہے۔انھوں نے اپنے سفرنامے میں ایسے واقعات کو پرویا ہے جس سے بات سے بات نکالی ہے جیسے جب یہ سفر کرنے کے ارادے سے نکلی تو ایئرپورٹ پر اپنے چشمے کے کھو جانے کے تعلق سے کئی باتیں نکالی ہیں اور چشمے کے کھونے کا قصہ کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ان کے سفرنامے میں چھوٹے چھوٹے جملے ایسے ہیں جس سے مزاح پیدا ہوتا ہے اور قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔چشمے کے کھونے کا قصہ ان ہی میں سے ایک ہے۔سفرنامے میں مزاح کے ساتھ حقیقت بیانی بھی ہونی چاہیے جو شہناز نبی کے سفرنامے میں پائی جاتی ہے۔

جزئیات نگاری سفرنامے کی اہم خصوصیت ہوتی ہے۔جس کے ذریعے کسی واقعے اور مقامات کی چھوٹی سے

چھوٹی چیزوں اور مختصر ترین واقعے کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ان کے سفرنامے میں ایسے واقعے اور اشیاء موجود ہیں جو جزئیات نگاری کے دائرے میں آتے ہیں۔سفر کے دوران شہناز نبی نے جن مقامات کو دیکھا ان مقامات کے واقعات اور حالات کے جزئیات کو انھوں نے اپنے سفرنامے میں منظرکشی کے طور پیش کیا ہے۔ان کے یہاں چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ڈل جھیل کے متعلق جب لکھا تو اس کے راستے میں پڑے ہوئے کوڑا کرکٹ اور گندے پانی پر لگے ہوئے کائی کی شکل کو اس طرح سے اپنے سفرنامے میں قلم بند کیا ہے کہ ان کے بیان سے قاری پر ڈل جھیل کی پوری کیفیت و ہیئت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔واقعے کی چھوٹی سی چھوٹی چیزوں کو بتانے کا اہتمام انھوں نے کیا ہے۔یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑے واقعات کو قاری تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور حادثات و واقعات کی شکل و ماہیئت کو ہو بہو اجاگر کرتے ہیں۔جس سے قاری کو سفرنامہ پڑھتے وقت اکتاہٹ نہیں ہوتی ہے۔ وہ تندہی کے ساتھ تازہ دم ہو کر سفرنامہ پڑھتا چلا جاتا ہے۔اگر سفرنامے میں جزئیات نگاری مفقود ہو تو سفرنامہ پڑھتے وقت قاری کسالت کا شکار ہو جائے گا۔سفرنامے کا درج ذیل اقتباس ملاحضہ ہو جس میں انھوں نے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ شہناز نبی نے اپنے سفرنامے میں کس طرح واقعے کی چھوٹی سے چھوٹی اجزاء کا ذکر کیا ہے۔

> ”جھیل کے کنارے بنے سیمینٹ کی پختہ بینچوں پہ بیٹھے لوگ شام کی ہوا کھا رہے تھے۔جھیل سے لگی فٹ پاتھ پہ چھوٹی چھوٹی عارضی دکانیں بنی ہوئی تھیں۔کچھ لوکل ہاکر تھے جو ہاتھوں میں یا سروں پر سامان اٹھائے فروخت کر رہے تھے۔ جھیل کے اطراف دوسرے کنارے پر بڑی بڑی دوکانیں تھیں جو دست کاری کے بہترین سامان بیچ رہی تھیں یا پھر ہوٹل یا ریستوراں تھے۔دھیرے دھیرے ہمارا شکارا کنارے سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں دور سے بھی نظر آ رہی تھیں۔سری نگر تو کیا پورے کشمیر میں ہی یہ پہاڑی سلسلہ نظر آتے ہیں۔گویا سر اٹھائے چاروں طرف تک رہے ہوں۔ ہوا سبک روتھی۔آس پاس سے کئی شکارے گذرتے جا رہے تھے۔جھیل میں گویا ایک بازار سا بنا ہے۔پانی پر بڑی بڑی دوکانیں کھڑی کی گئی ہیں۔ان میں کڑھائی کی ہوئی شال، سوئٹر، نقش و نگار والے بستے، پردے، نقش و نگار اور کندہ کاری والے برتن وغیرہ فروخت ہو رہے تھے۔ پانی کے اندر بڑے بڑے لکڑی کے کھمبے ڈال کر یہ دکانیں تیار کی گئیں

تھیں۔کئی دوکانداروں نے آواز لگائی۔ ہماراشکاراکسی دوکان پرلنگرانداز ہواہی چاہتا تھا کہ ہم کہہ اٹھے' ہمیں کچھ نہیں خریدنا'۔شکارے والے نے شکارا آگے بڑھالیا۔''9؎

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شہناز نبی کے سفر نامے میں مجلس آرائی اور جزئیات نگاری بدرجہ اتم موجود ہے ساتھ ہی معترضہ جملے کے ساتھ سفر نامے کو آگے بڑھانے میں انھوں نے ایسی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے کہ سفر نامی آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ایسا بہت کم محسوس ہوتا ہے کہ سفر نامے کو آگے بڑھانے کے لیے غیر ضروری باتوں کو داخل کیا ہے۔ان کے سفر نامے کی تحریریں ایسی ہیں جس میں بہ اعتبار ہیئت تبدیلیاں ہیں۔زبان و بیان میں عام بول چال کی زبان ہے۔مسجع اور مقفع عبارتوں سے مبرا ہے۔سفر نامے میں تاریخی نوعیت اور جذباتی تحریریں بھی موجود ہیں جو حقیقت بیانی پرمبنی ہیں اور یہ سفر نامے کے لیے ضرورری بھی ہوتا ہے۔

شہناز نبی نے اپنے سفر نامے میں کئی شخصیات کی زندگی اور ان کے فن پارے کے بارے میں بھی لکھا ہے جیسے شجاعت بخاری جو کشمیر کے مایہ ناز اور بے باک صحافی تھے کے بارے میں لکھتے وقت ان کی تاریخ پیدائش کے ساتھ ان کی خدمات کی بھی تفصیل بتائی ہیں۔ان کی صفات کو شہناز نبی نے اپنے سفر نامے میں اس طرح بیان کیا ہے جیسے کسی کا خدماتی پہلو بیان کیا جاتا ہے۔اس میں ان کے تعلیمی سفر کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی کارناموں کا بھی ذکر ملتا ہے۔اسی طرح انھوں نے کئی اور اہم شخصیتوں کے بارے میں جگہ جگہ پر لکھا ہے۔

اپنے سفر کے دوران شہناز نبی جن جن جگہوں پر ٹھہریں اور اس کی سیاحت کی تو اس کی تاریخی و جغرافیائی حیثیت کو تفصیل سے لکھا ہے۔جب وہ کشمیر کی راجدھانی سری نگر پہنچی تو سری نگر کب آباد ہوا؟ کس نے آباد کیا؟ کیسے آباد کیا؟ ان تمام معلومات کو انھوں نے اس سفر نامے میں اکٹھا کیا ہے۔کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ ہم تاریخ پڑھ رہے ہوں۔سفر نامہ ''کشمیر جنت نظیر'' میں انھوں نے تاریخی جگہوں، سیاحت کے باغات اور محلات کے ذکر کے ساتھ جموں کشمیر کے مزاروں کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے جیسے حضرت بل کا ذکر انھوں نے جغرافیائی اور تاریخی حیثیت سے کیا ہے۔

شہناز نبی نے نے اپنے سفر نامے میں کشمیر کی ان جگہوں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں تشدد اور ظلم و جبر اور دہشت گردی کے سبب وہاں کی فضا زہر آلود اور الم ناک ہے۔ان میں بیتاب ویلی، اور چندن واڑی کا ذکر قابل مطالعہ

ہے۔انھوں نے اس جگہ پر بسنے والے لوگوں کی زندگی کی کیفیت اوران کے خوف وہراس کی عکاسی کی ہے۔ان کے ذکر میں انھوں نے ان لوگوں کے افعال واعمال کو جولوگ ناجائز طریقوں سے بے کس اور مجبور لوگوں پر اپنی طاقت کا ستعمال کیے ہیں بے باکانہ انداز میں صفحوں پر لایا ہے۔کشمیر کی ایسی حالت بنانے میں سیاسی رویوں اور پالیسیوں کو جو عمل دخل ہے اور دہشت گرد تنظیموں کی سفاکانہ حرکات ہے ان سب کا بیان انھوں نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

چندن واڑی میں جب یہ سیاحت کی غرض سے پہنچی تو وہاں کے کم عمر بچوں کو بھیڑ وبکریوں کے میمنے کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتی ہیں تو اس کی منظر کشی سفرنامے میں اپنی ذہنی اور تخلیقی قوت سے ایسے کی ہیں سارے مناظر سفرنامے کے صفحات پر اترتے چلے جاتے ہیں ان چھوٹے بچوں اور بچیوں کو دیکھنے کے بعد کٹھوا کے آصفہ کا ذکر بھی انھوں نے بڑے دردمندانہ اور جذباتی رویے کے ساتھ کیا ہے اور اس واقعے پر سیاست داں اور محکمات کی جز افزا کی ہیں۔

کشمیر کے سفر کے دوران شہناز نبی نے وہاں کے ادباء، شعراء اور طلبہ سے بھی ملیں جس کی روداد کو انھوں نے سفرنامے کے قالب میں ڈھالا ہے اور ایک باب رکھا 'دانشورانِ کشمیر کے درمیان'۔اس باب میں وہ یونی ورسٹیز اور کالجز کے اساتذہ اور طلباء سے ملاقاتوں کی تفصیل پیش کی ہیں۔یونی ورسٹی میں ان کے استقبالیہ پروگرام کا انعقاد بھی کرایا گیا تھا ان پروگراموں کی رپورٹ کو انھوں نے سفرنامے میں بتایا ہے۔سینٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر کے جن اساتذہ اور طلباء سے وہ ملیں ان میں پرویز احمد خان (صدر شعبہ اردو)، زماں آزردہ، وحشی سعید، الطاف انجم وغیرہ ہیں اور طلباء وطالبات میں اقبال، شاہ فیصل، محمود ڈار، نصرت جبیں، رخسانہ جبیں کا ذکر انھوں نے کیا ہے۔ان س لوگوں سے علم وادب کے حوالے سے ملی تھیں اور اس ملاقات میں جو واقعات رونما ہوئے اس کو اچھے نتائج کے طور پر اپنے سفرنامے کا حصہ بنایا ہے۔

شہناز نبی نے اپنے سفرنامے میں جگہوں اور واقعوں کی تصویر کشی بہ حسن خوبی کھینچی ہیں جس میں دلکشی اور مناظر کی رونق ہے۔انھوں نے جن جگہوں کا بیان اور واقعات کی وضاحت کی ہے اس کا اصل اصیل سفرنامہ پڑھنے والوں کے سامنے کلی طور پر منکشف ہو جاتا ہے۔قاری نظرِ خود سے تصویر کشیدہ جگہوں اور واقعوں کو دیکھتا ہے۔منظر نگاری جزئیات نگاری کے آگے کی چیز ہے۔مختلف جزئیات نگاری کو اگر ملایا جائے تو ایک مکمل منظر کشی منعکس وہتی ہے۔شہناز نبی نے سڑکوں، باغوں، پارکوں، جھیل، محلات، چراغاہ وغیرہ کی منظر کشی پر اثر انداز میں کی ہے۔ان کی

منظر نگاری میں جزئیات نگاری کے پہلوں نمایاں ہیں۔انھوں نے اپنے سفر نامے کی وقعت اور اثر انگیزی کو بڑھانے کے لیے سیاحت کی جگہوں کو بیان کرنے میں بڑے جتن سے کام لیا ہے۔کیوں کہ سفر نامے میں سفر میں در پیش واقعات،اور مقامات کی تفصیل ہوتی ہے اور پورے سفر نامے کا انحصار ان ہی پر ہوتا ہے۔اس لیے شہناز نبی نے بڑی باریک بینی اور دیدہ وری سے ایک ایک گوشے کو اجاگر کیا ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔شہناز نبی کے سفر نامے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ان مقامات کی تفصیل پوری حقیقت اور تاریخی پیمانے کی بنیاد پر پیش کی ہیں۔درج ذیل اقتباس ملاحضہ ہو جس میں شہناز نبی نے جگہوں کا بیان کس انداز سے کیا ہے اس کا پتہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھے اور پہلگام کی طرف چلے۔راستے میں جا بجا فوج کا پہرہ۔بندوقیں تانے سپاہی اندر باہر گھومے رہتے ہیں۔خالی خالی میدانوں اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کے کنارے کھلی ہوئی بندوق لیے فوجی تعنیات ہیں۔پل کے نیچے، پل کے اوپر فوجی۔کھیت میں دھان بوتی ہوئی عورتوں کے سر بندوق تانے فوجی۔ بازاروں میں پھل پھول بیچتے لوگوں پی نظریں گاڑیں فوجی۔دھیرے دھیرے ہم اونچائی کی طرف جا رہے تھے۔ایک جگہ رک اس کی ضدی اور اڑیل دریا کی کچھ تصویریں لیں۔دو چار گاڑیاں اور رکیں تو ہاتھوں میں شال اور کشیدہ کاری کی قمیص لیے کچھ لوگ ہماری طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ پتہ چلا کہ کشمیری کڑھائی کا سامان بیچ رہے ہیں،اس وقت خریداری کا موڈ نہیں تھا۔انھیں مایوس کرنا اچھا تو نہیں لگا لیکن ہم مجبور تھے۔۔۔۔۔۔پہاڑی سلسلے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔قطار در قطار درخت۔دیودار، چنار،صنوبر،لہراتی بل کھاتی ندی۔راستے میں جا بجا گھوڑوں کے جھنڈ پہاڑوں پر چڑھتے دکھائی دیے۔اوپر جا کر مزدوری کریں گے۔مسافروں کو پیٹھ پر ڈھوئیں گے۔ پیٹ کے لیے کیا انسان کیا حیوان،سب کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ایک گھوڑے کی پیٹھ پر گیس کا سلینڈر بندھا ہوا تھا۔یقیناً سلینڈر خالی نہ تھا بلکہ گیس سے بھرا تھا۔گھوڑا بوجھ لیے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے لڑکھڑا رہا تھا۔آنکھیں باہر کو نکل پڑتی تھیں۔''[10]

سفر کے آخر میں شہناز نبی نے 'بعد از کشمیر' کے عنوان سے باب رکھا ہے۔ اس میں شہناز نبی جب کشمیر کا سفر ختم کر کے واپس آئیں تو کشمیر کے بارے میں ان کے ذہن میں جو فکر و خیالات آ رہے تھے اس کا استفسار کرتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ آخر کیوں کشمیر خوبصورتی کے ساتھ غم میں مبتلا ہے ان کی اس سوچ کے کئی زاویے ہوتے ہیں جس میں خصوصیت کے ساتھ سیاست اور دہشت گرد تنظیموں کا قیام، کمزور غریب مسلمان بچوں اور بچیوں کا ناجائز طریقے سے استعمال یہ تمام چیزیں ان کی ذہنی کش مکش اور تصادم کا حصہ بنتے ہیں۔ پھر وہ اپنے ااپ کو یکسوئی کر کے سفر کی تمام روداد کو 'سفر نامہ کشمیر جنت نظیر' کے نام سے تخلیق کیا۔

شہناز نبی نے سفر نامے کو بیان کرنے کے لیے جو زبان و بیان استعمال کی ہیں وہ سفر نامے کے لیے موزوں ہیں۔ اس میں کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے۔ جملوں کی ساخت سیدھے اور سہل انداز میں کی ہیں۔ سفر نامے کے پیراگراف اور ابواب ایسے رکھے ہیں کہ قاری آسانی سے تفہیم کر لیتا ہے۔ سفر نامے کے فنی لوازمات کو انھوں نے خوبی کے ساتھ برتا ہے۔ مسجع مقفع اور علامت شدہ عبارتوں سے انھوں نے گریز کیا ہے اور جو زبان استعمال کی ہیں اسمیں ترسیل کا عصر قائم ہے۔ عام بول چال کی زبان اور سیدھے سادے الفاظ استعمال کیے ہیں جس میں سلاست اور روانی ہے۔ کچھ جگھوں پر انھوں نے طنز کے فقرے بھی ڈالے ہیں لیکن اس مزاح میں بھی حقیقت ہے۔

شہناز نبی کے اس سفر نامے کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شہناز نبی نے کشمیر سے متعلق کافی اہم معلوماتیں پر اثر انداز میں تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے درج کیں ہیں جس سے قاری کے اندر اس کو پڑھنے کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس کو سرور کے ساتھ اس خطے کے متعلق بہت ساری معلومات کا ذخیرہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ شہناز نبی کا یہ سفر نامہ اپنی فنی خوبیوں اور زبان و بیان کے اعتبار سے ایک قابل قدر سفر نامہ ہے اور شہناز نبی نے اس کو لکھ کر اپنی مختلف الجہات شخصیت کا لوہا منوایا ہے وہ اس طرح کہ ان کا زور قلم ادب کے ہر اصناف پر چل سکتا ہے۔

*****

حواشی:

1۔شہناز نبی،افسانہ میں کہاں ہوں،ص 6

2۔شہناز نبی،افسانہ کبڑوں کی بستی،ص 12

3۔شہناز نبی،افسانہ آخری سرے کی کھوج،ص 3

4۔شہناز نبی،بچوں کے ڈرامے،ص 28

5۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص12

6۔شہناز نبی،رہروان ادب کتابی سلسلہ۔1،ص 246

7۔شہناز نبی،رہروان ادب،جلد 1،شمارہ۔3،ص 135

8۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص 144

9۔شہناز نبی،سفرنامہ کشمیر جنت نظیر،ص 73

10۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔ص 107

ماحصل

ماحصل

عصر حاضر کی خواتین ادیبوں میں شہناز نبی مختلف جہات کی مالک ہیں جنھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور کم وقت میں اپنی شناخت بنالی ہے۔ان کے 6 شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔اس کے علاوہ ایک تانیثی نقاد کی حیثیت سے وہ اردو ادب میں بے باک نسائی آواز بلند کرنے والی خاتون مانی جاتی ہیں۔انھوں نے اب تک 20 کتابیں اردو ادب کو بہترین سرمائے کے طور پر دی ہیں۔ادب اطفال سے ان کا گہرا لگاؤ ہے اس تعلق سے انھوں نے کئی نظمیں، ڈرامے اور افسانے لکھے ہیں جس میں بچوں کی ذہنی ساخت اور تعلیم وتربیت کی رہنمائی ملتی ہے۔

عصر حاضر کی غزل گو شاعرات میں شہناز نبی کا شمار نسائی آواز کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔انھوں نے باقاعدہ طور پر اپنے شعری سفر کا آغاز غزلوں ہی سے کیا اس طرح ان کا اولین غزلوں کا مجموعہ ''بھیگی رتوں کی کتھا'' منظر عام پر آیا۔ان کے اب تک غزلوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں پہلا مجموعہ ''بھیگی رتوں کی کتھا'' 1990 میں دوسرا مجموعہ ''شرار جستہ'' 2013 میں اور تیسرا مجموعہ ''سخن نیم شب'' 2015 میں شائع ہو کر شرف قبول عام حاصل کر چکا ہے۔

شہناز نبی تانیثیت اور تانیثی مسائل کو بڑے ہی بے باکانہ انداز میں اپنی تخلیقات میں پیش کی ہیں چاہے وہ نظم ہو یا غزل۔شہناز نبی نے سماج ومعاشرے میں ہورہے واقعات وحادثات کو اپنے مشاہدے اور تجربات کے ذریعے اور ان کے اسباب وعلل کے ساتھ پیش کیا ہے چاہے وہ رشتے کی پامالی ہو، تہذیبی زوال ہو، بے چہرگی و بے چینی ہو، یا نسائی مسائل ہوں۔اسی طرح انھوں نے ملک کے سیاسی مسائل اور رہنماؤں کے افکار ونظریات اور ان کی ریشہ دوانیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔شہناز نبی کی غزلوں کا پیمانہ وسیع ہے۔یہ سماج کے تمام لوازمات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ان کی غزلوں میں ماضی، حال اور مستقبل کی وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو انسانی زندگی سے منسلک

ہیں جہاں انھوں نے دور حاضر میں سماج میں پھیلی ہوئی اچھائی برائی ،نئی تہذیب کے نفع ونقصان کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے تو وہیں انھوں نے ماضی کی قدروں کی اور ہماری پرانی تہذیب کو بھی اپنی غزلوں کا حصہ بنایا ہے۔ اپنے ذہن کو نظریاتی سطح سے اٹھا کر بلند کیا ہے اور لامرکزیت کے تحت تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان سب نے ایک بات کی پاسداری کی ہے کہ انھوں نے ماضی کی تہذیب کو اور اپنے اسلاف کی قدروں کو بھلایا نہیں ہے ۔ان تمام اثاثوں کا ذکر ان کی تخلیقات میں موجود ہیں جو ہماری تہذیب کی علامت ہوا کرتی تھیں۔گاؤں دیہات کے تذکرے، وہاں کا رہن سہن، وہاں کا ماحول، زرعی زندگی ان تمام چیزوں کا ذکر آج کے فنکاروں میں ملتا ہے ۔شہناز نبی کی غزلوں میں بھی یہ تمام چیزیں موجود ہیں۔وہ ماضی کے اقدار کی پاسداری کرتی ہیں۔ان کی غزلوں میں ماضی کی تہذیب کی پاسداری اور حاشیائی چیزوں کا ذکر ہے۔ماضی کی تہذیب کی یاد میں انھوں نے اپنی غزلوں میں گاؤں دیہات کے تذکرے کیے ہیں۔ان کے یہاں جہاں گھر، آنگن اور صحن کا بیان ملتا ہے تو وہیں نانی، اماں کی کہانیوں کا تذکرہ بھی ہے۔

شہناز نبی نے مختلف النوع موضوع پر غزلیں کہی ہیں۔ان کے غزلیں ذات سے لیکر کائینات تک کی روداد ہے۔ان کی غزلوں میں فن کی خوبیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔شعری اصطلاحات جس کی اوٹ میں اشعار کے مطالب ومفاہیم بیان کیے جاتے ہیں ان کے یہاں خوبصورتی کے ساتھ موجود ہیں۔انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسی تراکیب اور قافیہ پیمائی کی ہے جس میں جدت اور دلکشی ہے۔ان کے لطیف اشعار اور ان کی کیفیات قلبی سکون عطا کرتے ہیں جس میں خیال اور معنی آفرینی ہے۔جدت طرازی، تخیل، تشبیہات، استعارات، ہر ایک پہلو کو اچھوتے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کے کلام میں اشارات وکنایات کا استعمال بھی عمدگی کے ساتھ ملتا ہے۔فصاحت و بلاغت ان کی غزلیہ شاعری میں رواں ہے۔سادے اور پر کشش الفاظ ان کی غزلوں میں پنہا ہیں۔

شہناز نبی کی غزلوں میں علم بیان کے تقریباً سبھی اجزا کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے جس سے ان کی غزلوں میں شگفتگی اور دلکشی پیدا ہوئی ہے ۔ان صنعتوں میں تشبیہ، استعارہ، علامت ،مجاز ،کنایہ وغیرہ زیادہ تر ان کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔شہناز نبی کی شاعری میں وہ اسالیب اور قوانین موجود ہیں جو شاعری کے لیے سانچے کا کام کرتے ہیں چاہے وہ بحریں ہوں یا شاعری کی خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے علم بیان اور علم بدیع ہوں جس طرح ان کی غزلوں میں علم بیان کے ممیّزات موجود ہیں اسی طرح علم بدیع بھی ان کی شاعری کے وصف کو دوبالا کرتی

ہے۔شہناز نبی کی غزلوں میں علم بدیع کی جو صنعتیں استعمال ہوئی ہیں اس سے ان کی غزلوں کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔انھوں نے اس علم کے تحت جن صنعتوں کا خاص طور پر استعمال کیا ہے وہ بہت ہی معنی خیز ہیں۔ان صنعتوں کے ذریعے ماضی کی اقدار سے منسلک ہیں اوران کی تاثیر لوگوں پر دیرپا قائم رہتی ہے۔یہ تاثیر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے صنعت تلمیح، صنعت تجنیس، صنعت تکرار، صنعت تضاد، صنعت مناسبت لفظی وغیرہ کو اپنی غزلوں میں بروئے کار لایا ہے۔

اگر شہناز نبی کی نظموں کی بات کی جائے تو ان کی نظمیں بھی تقریباً زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں جس میں ذاتی، سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تانیثی مسائل کے ساتھ ماحولیاتی آلودگی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔لیکن شہناز نبی کی نظموں کا اہم موضوع عورت اوراس کے مسائل ہیں۔شہناز نبی نے اپنی نظموں میں جن جن موضوعات ومسائل کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے اس میں تانیثی مسائل سب سے اہم ہے۔شہناز نبی نہ صرف سماج میں ہی عورتوں کے مساوی حقوق کی بات کرتی ہیں بلکہ وہ جذباتی طور پر بھی مساویانہ حقوق کی قائل نظر آتی ہیں۔موجودہ صورتحال میں دفتر، گھر اور خاندان میں تقسیم عورت کس اذیت ناک کرب سے گزرتی ہے انھوں نے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے نزدیک جو مسئلہ ہے وہ عورت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا اوراس کی شخصی آزادی پر قدغن لگانا ہے۔عورت کو سماج میں تحقیر آمیز رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ان سے نالاں نظر آتی ہیں اوراس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہیں اور مرد وعورت کی تفریق پر سوالات اٹھاتی نظر آتی ہیں۔ان کے تانیثی موضوعات میں جو موضوع سب سے زیادہ ہماری توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے وہ ہے ان کا الگ سے تانیثی ادب ہونا۔وہ عورتوں کا ایک الگ مقام ادبی حوالے سے بھی ملنے کی آرزومند ہے وہ خواتین قلم کاروں تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہیں کہ وہ اس کے لیے میدان میں آگے بڑھیں۔

شہناز نبی نے اپنی نظموں میں امیروں اور غریبوں کے تضادات اور ذات پات کا مسئلہ پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ امیروں کا جبر اور غریبوں پر ظلم وستم ایک ایسا مسئلہ ہے جو تخلیق کار کی فکر کا باعث بنتا ہے اور ایک تخلیق کار کی حیثیت سے ان تمام چیزوں کو شہناز نبی نے اپنی نظموں میں سلیقہ اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

شہناز نبی نے عصر حاضر کے سبھی موضوعات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔سیاسی، سماجی، تانیثی اور دیگر موضوعات کے علاوہ ایک بہت ہی اہم موضوع ہمیں ان کی نظموں میں دیکھنے کو ملا، وہ ہے ماحولیاتی آلودگی۔

ماحولیاتی آلودگی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے بہت ہی کم وقت میں پوری دنیا کے لیے خطرہ پیدا کرنا شروع کر دیا ہے۔ تمام انسان، چرند پرند، سب اس کی زد میں آ رہے ہیں۔ دھرتی پر زندگی مشکل ترین ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری صحت سے لے کر ہماری زندگی پر خطرے منڈلا رہے ہیں۔ شہناز نبی اس مسئلے کو اپنی نظموں میں موضوع بنا کر سب کی توجہ مرکوز کرتی ہیں

شہناز نبی نے ہیئت کی سطح پر جو اظہار بیان اختیار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ انہوں نے ہیئتی طور پر جو اکتساب کیا ہے اس سے ان کے ذہنی رویے اور شعری ساخت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ہیئت کے طور پر نسائی پیکر کو جس طرح سے ابھارا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ عورت کے احساسات اور جذبات کو تخلیقی طور پر محسوس کیا اور کروانے کی کوشش بھی کی۔ اور ایسے میں وہ ایک پر اعتماد عورت نظر آتی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے تلخ تجربے ہیں لیکن انہوں نے اسے کبھی اپنی کمزوری بننے نہیں دیا۔ ان کے یہاں زیادہ تر آزاد اور نثری نظمیں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے تلخ تجربات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظموں کے عنوانات بھی اپنے آپ میں جدت لیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مختصر اور طویل دونوں طرح کی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں اکثر پہلے مصرعے کے مقابلے میں دوسرا اور تیسرا مصرع مختصر پھر طویل اس کے بعد پھر مختصر ہوتا ہے۔

شہناز نبی کا انداز بیان اپنے معاصر پیش رو فن کاروں کے مقابلے قدرے مختلف ہے اور حقیقت سے قریب بھی ہے۔ ان کے پہلے مجموعے ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' میں اظہار کا رنگ حقیقی اور تلخ ہے اس کے بعد ''پس دیوار گریہ'' میں کسی قدر نرمی ہے لیکن لہجے کا کھردرا پن اور ترش یہاں بھی برقرار ہے۔ ان کے موضوعات ومضامین بھی زیادہ تر ایسے ہی ہیں جن پر ان کے معاصرین شاعرات نے قلم اٹھایا ہے لیکن نسائی کرب کے بیان میں ان کے فن کی صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے وہ اس لیے کہ ان کے موضوعات کے برتنے کا انداز، باریک بینی، گہرا مشاہدہ، زبان کی کڑواہٹ اور احتجاجی وانقلابی رویہ ہی ان کی انفرادیت ہے۔ اپنی نظموں میں سیاسی جبر، نسائی کرب، عدم مساوات اور طبقہ نسواں کے استحصال کے موقعے پر جب انھوں نے اپنے خیالات ونظریات کو شعری پیکر میں ڈھالا تو اردو شاعری میں وہ ایک نئی آواز بن کر ابھریں۔

شہناز نبی نے ہیئت کے طور پر اپنی نظموں میں لوک کتھا اور اساطیری پہلو کے بھی تجربے کیے ہیں۔ ان کی بعض نظموں میں ہندو میتھالوجی کی مذہبی کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ نظم ''گھوڑے کی پیٹھ، تم اور میں'' پرتھوی راج راسو

کی یاد دلاتی ہے۔ ''کالی کھیتر'' میں برہجا، وشنو، مہادیو اور ستی کے ذریعے اظہار خیال کیا ہے۔ان کے یہاں دشینت، ارجن، دروپدی، شکنتلا وغیرہ کی لوک کتھا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کی شاعری میں اکیلی عورت کی پیکر تراشی دیکھنے کو ملتی ہے جو تنہا ہونے کے باوجود ہمت اور حوصلے سے بھر پور ہے۔ ہیئت کی سطح پر ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے علائم اور استعارے کا استعمال تذکیر اور تانیث کے طور پر کیا ہے۔جیسے عورت کے لیے پھول، تتلی، چڑیاں، گوریا وغیرہ اور مرد کے لیے کالا بھنورا، بھیڑیا، لومڑی، سیار، چوہا وغیرہ۔انہوں نے فن کی ظاہر ڈھانچے میں ہیئتی تجربے کیے اور داخلی سطح پر تانیثی افکار کو زیادہ تر اپنایا ہے۔شہناز نبی نے اپنی شاعری میں ظاہری اور داخلی سطح پر جو ہیئتی تجربے کیے ہیں اور اس میں کامیاب بھی رہی ہیں۔

شہناز نبی کی شاعری میں جہاں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے وہیں ان کے یہاں اسلوب اور تکنیک میں بھی جدت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں الفاظ کا صاف ستھرا رچاؤ اور سلیقہ موجود ہے۔اگر ان کی نظموں میں شعری ساخت ،لفظوں کا استعمال،ان کے معنی و مفاہیم کے حقیقی اور شعوری تناظر کا جائزہ لیا جائے تو وضاحت اور صراحت کے ساتھ جذبات و احساسات کے اظہار سے ان کی شاعری مزین نظر آتی ہے۔ان کے اسلوب میں رمزیت، اشاریت،علامت و استعارات، کہاوتیں، محاورے،لوک کتھا،تلمیحات وغیرہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔اظہار کے وسیلے سے ان کی تمام شاعری ماضی اور حال کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

اپنی نظموں میں ڈرامائیت پیدا کرنا شہناز نبی کا خاصا ہے جس کو پڑھ کر قاری کو سرور حاصل ہوتا ہے۔شہناز نبی نے اپنی نظموں میں نئی نئی تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کے اسلوب میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ندرت خیال اور جدت بیان دونوں نے ان کی نظموں کو وقار بخشا ہے۔'سانحہ'،گھنا کہاسا'، 'حقیقت بے محابا'، 'عذاب تمنا'، میں کیوں مانوں'، 'میرے دوست مجھ سے خفا ہو گئے'، 'تمہارے لئے'، 'گمشدگی'، 'ناسٹلجیائی' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جس میں نئی ترکیب دیکھنے کو ملتی ہیں۔شہناز نبی کے اسلوب کی ایک اور خاصیت ہے کہ انھوں نے نئی ترکیب کے ساتھ اپنی کئی نظموں میں استفہامیہ انداز م اپنایا ہے اور ایسے سوالات قائم کیے ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں

ان کی نظموں میں کہیں بنگلہ زبان کے الفاظ جیسے :۔حسین ! تو می کو تھائے؟، دوئی دھارے کاش بون پھولے پھولے سادا، آمار سونار بانگلا، آمی تو مائے بھالو باشی، پوٹا پوٹی آ کھوئی موڑی کھا، کیو آچھے۔۔۔شون چھو۔؟ تو کہیں

شانت، السانا، سبھا، اگنی کنڈ، آ کاش، منڈیا، جنم، کرن، ساگر، امرت، مریادا، ادھیکار، سپنا، ریکھا، دھنش، سوئمبر، پریکشا، منتر، جاپ، بدھم شرنم گچھامی، شیش، نمن، دھرتی، نرمل، چھل چھل، باسی، پوجا، جل، اماوس، بھونچال جیسے ہندی کے الفاظ شعوری اور لاشعوری طور پر برتے گئے ہیں۔ زبان کے اعتبار سے یہ نامانوس الفاظ جو ہماری لسانی زبان کے لیے غیر کا درجہ رکھتے ہیں ان کی نظموں میں اس خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال ہوا ہے کہ نظموں میں دلکشی، اسلوب میں نکھار اور افکار خیال میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ نئے زبان کے استعمال سے اکثر شعری لوازم کے مجروح ہونے کا خطرہ بنا رہتا ہے لیکن شہناز نبی نے بڑی ہی مہارت اور اپنی فنی چابکدستی اور خوش اسلوبی سے اسے برت کر نہ صرف اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے بلکہ ہمارے زبان وادب میں لفظ کے ذخیرے میں بھی اضافہ کیا ہے۔

شہناز نبی نے اردو کے ادبی حلقوں میں اپنے تخلیقی سرمایوں کے ساتھ تحقیقی وتنقیدی خدمات سے بھی مقبول و معروف ہیں ان کی کل آٹھ کتابیں ہیں۔ جس میں سے ایک ’فورٹ ولیم کالج اور حسن اختلاط‘ ہے۔ ’’حسن اختلاط‘‘ میر ابوالقاسم خاں کی تصنیف ہے۔ جس کی تصنیف انھوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر کی تھی۔ اس کتاب کے ذریعے شہناز نبی نے کلکتہ میں اردو زبان وادب کے فروغ میں جن لوگوں نے ابتدائی طور پہ خدمات انجام دی ہیں ان میں میر ابوالقاسم خاں کا نام جو تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو چکا تھا اسے ڈھونڈ نکالا ہے اور اس طرح سے دوبارہ سے انھیں تاریخ کا حصہ بنانے کی سعی کی ہے۔

’منثورات بنگالہ‘ یہ کتاب دو حصوں پر مبنی ہے۔ پہلے حصے میں ’’بنگال میں اردو نثر کی روایت‘‘ کے عنوان سے انھوں نے اپنا ایک تحقیقی مقالہ شامل کیا ہے اور دوسرے حصے میں انیسویں صدی میں بنگال میں لکھی گئی تقریباً سبھی داستانوں کا تعارف پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان تمام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب تحقیق و تنقید دونوں پر مبنی ہے۔ یہ کتاب بنگال کی نثری ادب کی تاریخ کے تعلق سے ایک دستاویز کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں نہ صرف بنگال میں اردو نثر کی روایت پر محققانہ نظر ڈالی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی انیسویں صدی میں سرزمین بنگال میں لکھی گئی داستان اور قصوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی ہی محنت ولگن سے ان قصوں کے مختلف نسخوں کے قلمی وخطی اور مطبوعہ نسخوں کو دریافت کیا اور اس کے اقتباسات کو نمونے کے طور پر اس کتاب میں شامل کیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب ایک طرح سے نثری نمونوں کا مرکز بن گئی ہے۔ شہناز نبی کی یہ کتاب اردو تحقیق میں فورٹ ولیم کالج اور بنگال کی نثری خدمات کے حوالے سے ایک مثالی حیثیت رکھتی

ہے۔

'کلام نساخ' شہناز نبی کی یہ کتاب اردو کے ایک اہم شخصیت کی تلاش اور اس کی ادبی خدمات سے نہ صرف ہمیں متعارف کرواتی ہے بلکہ اس میں نساخ کے اسلوب، انداز بیان، اور باقی ساری خصوصیات پر بھی بھر پور تنقیدی بحث بھی ملتی ہے۔ 'تانیثی تنقید' یہ کتاب اپنے مضامین کے نوعیت کے بنا پر تانیثی تنقید کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعے سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ کہاں کہاں اور کس کس کے ذریعے خواتین کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ وہ ناانصافی چاہے فراق سے ہوئی ہو یا اکبر سے یا اردو کے تذکرہ نگاروں یا پھر ترقی پسند ادب کے تاریخ نویسوں سے شہناز نبی کی نظر سے کوئی بھی چھپ نہیں سکا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اس کے لیے آواز اٹھائی بلکہ یہ تجویز پیش کی کہ ادب کی تاریخ کو دوبارہ سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے اس کے لیے انھوں نے ایسی ایسی دلیلیں پیش کی ہیں جسے رد کرنا مشکل ہے۔ اس طرح اس کتاب کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو ہمارے لیے فکر کے دروازے نہ کھولے ہوں۔ اس لیے اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ واقعی ان کی یہ کتاب تانیثی تنقید کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

'تنقید مطالعات' اس کتاب کے تقریباً سبھی مضامین اپنے عنوانات اور موضوعات کے بنا پر عمدہ ہیں۔ اس کتاب میں شہناز نبی کے بڑی ہستیوں پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں ایسے میں جب کہ ان لوگوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان تمام کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر قلم اٹھانا ایک مشکل کام تھا لیکن شہناز نبی نے اپنی عالمانہ اور ناقدانہ نظر سے موضوع کے ساتھ ساتھ ان ہستیوں کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے اور اس طرح سے ان کا تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ تنقیدی ادب میں ایک معیاری کتاب کہلانے کا حق دار بن گیا ہے۔

،فیمینیز، تاریخ وتنقید ہیں۔ ان کتابوں میں 'فیمینیز م، تاریخ وتنقید' فیمینز م کی تاریخ وتنقید پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب ہے۔ اردو ادب میں یہ کتاب اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اہم کتاب 'تانیثی تنقید' ہے۔ اس میں انھوں نے تنقید پر تانیثیت کا اطلاق کرتے ہوئے عملی تنقید کو ایک نیا رنگ بخشا ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل 'منشوراتِ بنگالہ' جس میں بنگال کیا دیبوں کی خدمات کو لوگوں کے سامنے لایا گیا ہے۔ اور ان کی کچھ کتابیں دکنی لسانیات اور ڈرامے پر ہیں۔ انھوں نے تنقیدی دنیا میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بھی جداگانہ ہے ان کے تحقیقی وتنقیدی کام اردو دکے ادبی سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شہناز نبی نے کئی طبع زاد ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں ۔شہناز نبی کے ڈرامے زیادہ تر سماجی وسیاسی واقعات و حالات پر مبنی ہیں ۔تعلیم بالغاں، گھریلو تشدد، قومی یک جہتی، ماحولیات، مادری زبان میں تعلیم، بچوں کا جنسی استحصال ،بچوں کے مسائل جیسے بچہ مزدوری وغیرہان کے ڈراموں کے مرکزی خیال رہے ہیں ۔جو بات بحیثیت ڈراما نگار شہناز نبی کومنفر بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیج اورادبی ڈراموں کے علاوہ انھوں نے بے شمارنکڑ ناٹک بھی لکھے اور پیش کیے ہیں۔ان کے ڈراموں کو ٹیلی کاسٹ بھی کیا گیا ہے پلاٹ کے لحاظ سے ان کے تقریباً سبھی ڈراموں کے واقعات میں ربط ہے۔ڈراما جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ناظرین وقارئین پر غور وفکر کے دروازے وا کرتا ہے۔

انھوں نے اپنے ڈراموں میں خیالات کو اشاروں اور کنایوں میں کم سے کم الفاظ میں پیش کرنے کوشش کی ہے۔ان کے ڈراموں کو پڑھنے یا دیکھنے کے بعد قاری یا سامع ان میں پوشیدہ واقعات کی حیثیت اور در پردہ موجودہ عالمی دنیا کا عکس بآسانی دیکھ سکتا ہے۔اس طرح شہناز نبی نے سماجی و عالمی مسائل ،معاشرتی مسائل ،فلسفیانہ خیالات، سیاسی مسائل اورانسانی ذہن کے پیچ وخم کو کامیاب طریقے سے اپنے ڈراموں میں نمایاں کیا ہے جس سے ڈرامے کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔ان کے ڈراموں کے واقعات میں عصری زندگی کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شہناز نبی کے ڈراموں کے کردار حقیقت سے بہت قریب نظر آتے ہیں ۔ہمیں ان کے یہاں منفی اور مثبت کرداروں کے ساتھ علامتی کردار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں شہناز نبی کے ڈراموں کو دیکھ کر یا پڑھ کر اس کا بات کا پتا چلتا ہے کہ ان کے ڈراموں کے ہر ایک کردار چاہے مرکزی ہو یا ضمنی سب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔وہ اپنے کرداروں کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے میں فنی چابک دستی سے کام لیتی ہیں اور انہیں سلیقے سے پیش کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔

شہناز نبی کے کچھ ادبی سرمایے ایسے بھی ہیں جس پر انھوں نے کم لکھا ہے جیسے افسانے ،تراجم، اور سفر نامہ وغیرہ وہ بی اہمیت کے حامل ہیں۔شہناز نبی نے تین افسانے لکھے ہیں، ان کے افسانوں کا موضوع ایک جیسا ہے جس میں تانیثی مسائل کا ذکر خصوصیت کے ساتھ موجود ہے۔ترجمے میں انھوں نے شعری ونثری سرمایے کا ترجمہ کیا ہے۔شاعری میں انھوں نے اکثر دوسری زبانوں کی آزاد نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔اس کے علاوہ ڈرامے اور ناول کے بھی ترجمے کیے ہیں۔جس میں اردو زبان سے بنگلہ زبان میں و بنگلہ زبان سے اردو زبان میں اور ہندی زبان سے

اردو زبان میں ان کے تراجم موجود ہیں۔ انھوں نے جو ترجمے کیے ہیں ان میں ادبی، صحافتی اور تخلیقی ترجمے ہیں۔ ان کا ایک سفر نامہ ''سفر نامہ کشمیر جنت نظیر'' ہے۔ اس سفر نامے میں شہناز نبی نے کشمیر کے جن مقامات کی سیاحت کی ہے ان مقامات کے رنگ وروپ واحوال وکوائف کو بڑے ہی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ کشمیر کے اوپر لکھا گیا بہترین سفر نامہ ہے جس میں کشمیر جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

*****

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماخذ:

نمبر	مصنف	کتاب	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	شہناز نبی، پروفیسر	اردو ڈراما، آغا حشر اور صید ہوس	عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ	1998
2	شہناز نبی، پروفیسر	اگلے پڑاؤ سے پہلے	سیاق پرنٹرز، کلکتہ	2001
3	شہناز نبی پروفیسر	بچوں کے ڈرامے	رہروان ادب، کولکاتا	2016
4	شہناز نبی، پروفیسر	بھیگی رتوں کی کتھا	سعید پریمی، کولکاتا	1990
5	شہناز نبی پروفیسر	بیدی ایک جائزہ	آفسیٹ پرنٹس، کولکاتا	1985
6	شہناز نبی، پروفیسر	پس دیوار گریہ	ایم کے آفسیٹ پرنٹس، دہلی	2008
7	شہناز نبی، پروفیسر	پہچان مجھے نادان	سیاق پبلشرز، کولکاتا	2016
8	شہناز نبی، پروفیسر	تانیثی تنقید	کلکتہ یونی ورسٹی سلز کاؤنٹرز، کلکتہ	2009
9	شہناز نبی، پروفیسر	تنقیدی مطالعات	رہروان ادب پبلی کیشنز، کلکتہ	2014
10	شہناز نبی پروفیسر	جدید ہندی نظمیں	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	2022
11	شہناز نبی، پروفیسر	سخن نیم شب	رہروان ادب پبلی کیشنز، کلکتہ	2015
12	شہناز نبی، پروفیسر	سفرنامۂ کشمیر جنت نظیر	رہروان ادب پبلی کیشنز، کلکتہ	2018
13	شہناز نبی، پروفیسر	شرار جستہ	رہروان ادب پبلی کیشنز، کلکتہ	2013
14	شہناز نبی، پروفیسر	فورٹ ولیم کالج اور حسن اختلاط کوالٹی ویکس	آفسیٹ پرنٹرز، کولکاتا	2003
15	شہناز نبی، پروفیسر	فیمینیزم، تاریخ وتنقید	رہروان ادب پبلی کیشنز، کلکتہ	2012
16	شہناز نبی، پروفیسر	کلام نساخ	انٹرکش پرنٹنگ سسٹم، کولکاتا	2007
17	شہناز نبی، پروفیسر	لسانیات اور دکنی ادبیات	عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ	1993
18	شہناز نبی، پروفیسر	منثورات بنگالہ	نیو ایشیئن پرنٹرز، کولکاتا	2006
19	شہناز نبی، پروفیسر	نظمیں ہماریاں	سیاق پبلی شرز، کولکاتا	2018

ثانوی ماخذ:

نمبر	مصنف	کتاب	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	آل احمد سرور، پروفیسر	نظر اور نظریے	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1973
2	آمنہ تحسین، ڈاکٹر	تانیثی فکر کی جہات	عفیف آفسیٹ پرنٹس دہلی	2012
3	ابراہیم یوسف	اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ	قومی کونسل برائے فروغ	2011
4	ابن کنول، ڈاکٹر	تنقید و تحسین	کتابی دنیا، نئی دہلی	2006
5	ابوالکلام قاسمی	شاعری کی تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ	2008
6	ارشاد علی خان، پروفیسر	جدید اصول تنقید	کتابی دنیا، نئی دہلی	2001
7	اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر	جدیدت اور اردو افسانہ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی	2001
8	انور پاشا	ادبی جہات	آفسیٹ پریس، جامعہ مسجد دہلی	2002
9	انور پاشا	تانیثیت اور ادب	عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی	2014
10	تنویر احمد علوی، ڈاکٹر	اصول تحقیق و ترتیب متن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2009
11	جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1993
12	حامدی کاشمیری، پروفیسر	اردو نظم کی دریافت	جے کے آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	2004
13	حنیف کیفی	اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
14	خالد اشرف	برصغیر میں اردو افسانہ	ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	2011
15	رحمت یوسف زئی	اردو شاعری میں صنائع و بدائع	اردو صفحہ ساز کمپیوٹر کارپوریشن، حیدر آباد	2003
16	ساحل احمد	اردو ڈراموں کا مطالعہ	تاج آفسیٹ، الہ آباد	1997
17	سعید احمد	آزادی کے بعد اردو سفر نامہ	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	2012
18	سید وقار عظیم	اردو ڈراما فن اور منزلیں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1986
19	شمس الرحمٰن فاروقی	اثبات و نفی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1986
20	شمس الرحمٰن فاروقی	اردو غزل کے اہم موڑ	غالب اکیڈمی، نئی دہلی	2006
21	شمس الرحمٰن فاروقی	تحفۃ السرور	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	1985

22	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1992
23	شمیم النساء، ڈاکٹر	آزادی کے بعد اردو ڈراما	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، علی گڑھ	2008
24	شمیم حنفی، مظہر مہدی (مرتبین)	آزادی کے بعد اردو نظم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2005
25	صغیر افراہیم، ڈاکٹر	اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2009
26	صغیر افراہیم، ڈاکٹر	افسانوی ادب کی نئی قرات	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	2011
27	عتیق اللہ	تنقید کی جمالیات	کتابی دنیا، دہلی	2014
28	عشرت رحمانی	اردو ڈراما تاریخ وتنقید	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	1975
29	عشرت رحمانی	اردو ڈراما کا ارتقاء	علی بک ڈپو، علی گڑھ	1978
30	عنوان چشتی، پروفیسر	عروضی اور فنی مسائل	اردو سماج جامعہ نگر، نئی دہلی	1985
31	فرمان فتحپوری	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2017
32	فرمان فتحپوری	اردو فکشن کی مختصر تاریخ	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی	2014
33	قدسیہ قریشی	اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں	فوٹو آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	1987
34	قمر رئیس	ترجمہ کا فن اور روایت	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2004
35	قمر رئیس	معاصر اردو غزل مسائل و میلانات	اردو اکیڈمی، دہلی	2006
36	کنول کرشن بالی	آزاد نظم اردو شاعری میں	کتاب پبلشرز، لکھنو	1995
37	کہکشاں تبسم	نسائی شعری آفاق	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2015
38	گوپی چند نارنگ	اردو افسانہ روایت اور مسائل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2004
39	گوپی چند نارنگ	اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2009

40	گوپی چند نارنگ	ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1993
41	گوپی چند نارنگ	ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
42	گیان چند جین	تحقیق کا فن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2005
43	محمد اسلم قریشی	ڈراما نگاری کا فن	اعلی پرنٹنگ پریس، دہلی	1983
44	محمد سرور (مرتب)	سفرنامۂ یورپ	عاقب بک ڈپو، نئی دہلی	2006
45	محمد کاظم	اردو نکڑ ناٹک	تخلیق کار پبلشرز، دہلی	2001
46	مرزا حامد بیگ	اردو افسانے کی روایت	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی	2014
47	مشتاق قادری	اردو میں ترجمہ نگاری	روشان پرنٹرز، نئی دہلی	2015
48	ممتاز الحق، ڈاکٹر	جدید غزل کا فنی و سماجی مطالعہ	عفیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	2004
49	نکہت جہاں	اردو شاعری اور نسائی حسیت	سلور رائٹس پرنٹرز، حیدرآباد	2006
50	وزیر آغا	اردو شاعری کا مزاج	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	1974
51	وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ	2000
52	وسیم بیگم	آزادی کے بعد اردو غزل مضمرات وممکنات	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	2009
53	وہاب اشرفی	عالمی تحریکِ نسائیت مضمرات و ممکنات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2012
54	وہاب اشرفی	مابعد جدید مضمرات وممکنات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007
55	وہاب اشرفی	مغربی ومشرقی شعریات	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	2012
56	یوسف حسین خان	اردو غزل	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ	2010

رسائل وجرائد:

1	آج کل (ماہنامہ)	نئی دہلی	مارچ 2014

2	اردو دنیا (ماہنامہ)	نئی دہلی	جولائی2009
3	انتساب عالمی (سہ ماہی)	بھوپال	اکتوبر تا دسمبر2014
4	شاعر (ماہنامہ)	ممبئی	دسمبر1998
5	کاروان ادب (سہ ماہی)	بھوپال	اکتوبر۔دسمبر2017
6	فکر وتحقیق (سہ ماہی)	نئی دہلی	جولائی۔ستمبر2018
7	سب رس (ماہنامہ)	حیدرآباد	مارچ2017
8	ایوان اردو (ماہنامہ)	نئی دہلی	مئی2014
9	فکر ونظر	علی گڈھ	جون2016

*****